''چہارسُو''

## ...... زمین اور زمانے ......

بطور طالب علم اردو زبان وادب کے حوالے سے آپ ہماری تشویش سے بہت حد تک آگاہ ہیں۔کبھی کبھی ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب ہماری مایوسی اُمید میں بدل جاتی ہے۔جس طرح کچھ لوگ اس خوش اُمیدی میں مبتلا ہیں کہ اُن کی پسند سے مماثل اگر دس،بیس یا سو پچاس شخصیات میسر آجائیں تو وطنِ عزیز کے روز شب تاریکی سے روشنی کی جانب عازم سفر ہو سکتے ہیں۔ہمارا شمار بھی اس طرز کے خوش اُمیدوں میں کیا جاسکتا ہے کہ اگر اردو ادب کو جناب مبین مرزا جیسے دس بیس ہمت،محنت،لگن اور انفرادیت کے حامل ادیب،شاعر،مدیر اور ناشر دستیاب ہو جائیں تو ہم،ہماری زبان اور ہمارا ادب اندھیروں سے نکل کر روشنی کی جانب سفر کی ابتدا کر سکتا ہے۔''زمین اور زمانے'' جناب مبین مرزا کا دوصد آٹھ صفحات پر مشتمل نہایت مختلف اور منفرد افسانوں کا مجموعہ ہے۔''وہ اکثر تعجب سے سوچتا ہے کہ جب سب کچھ عزت سے مل رہا ہے تو آخر لوگ بے عزتی سے حاصل کرنے پر کیوں آمادہ ہو جاتے ہیں۔کوئی کسی پلاٹ کے لیے،کوئی بنک بیلنس کے لیے،کوئی کسی پرمٹ کے لیے،کوئی کسی لڑکی کے لیے۔۔۔''

''بھابھی آپ بہت عظیم ہیں،بڑی شوہر پرست ہیں،ماں نے جیسے چیخ کر کہا۔آفرین ہے آپ پر،شوہر اپنے سے بیس سال چھوٹی لڑکی پر ڈورے ڈال رہا ہے،اُس سے نکاح کے منصوبے بنا رہا ہے اور آپ ہیں اُسے قصوروار ماننے کو تیار نہیں۔۔۔'' ''فرخندہ!ویسے میرا خیال ہے کہ آدمی شادی کے بغیر بھی اچھی زندگی گزار سکتا ہے۔امریکہ بلکہ یورپ میں بھی اب ایسے لوگ خاصی تعداد میں ہیں جو ایڈہاک ازم میں Believe کرتے ہیں۔۔۔ایڈہاک ازم۔۔۔وقتی ضرورت کا نظریہ۔بھئی واقعی زندگی کے جبر میں مستقل اضافہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔سب کچھ کنٹریکٹ پر Availbale ہے۔No Life .. Long Responsibility۔کھاؤ پیو،موج اڑاؤ''

چند نگینے آپ کے الطافات کے لیے مختصر تحریر میں پرو کر صرف اس غرض سے پیش کیے گئے ہیں کہ آپ جناب مبین مرزا کی سوچ،فکر اور معاشرے کے نباضی سے آشنا ہو سکیں۔اعلیٰ درجہ کی کتابت،عمدہ طباعت،بہترین جلد بندی مع نفیس کاغذ مبلغ چارصد روپے پاکستانی کے عوض اکادمی بازیافت،اردو بازار،کراچی فرشِ نگاہ ہے۔

## ...... فنون (سہ ماہی) ......

پاکستان کی آبادی جس تیز رفتاری سے بڑھ رہی ہے اہل قلم اور تخلیق کار بھی اُسی تیزی سے منظر عام پر آرہے ہیں۔بلاشبہ یہ حوصلہ افزبات ہے مگر جو امر فکر مندی کو دعوت دے رہا ہے وہ ادبی جرائد کی گھٹتی تعداد ہے۔ہمیں معاف فرمائیے ہم ادیب اور شاعر مضمون،رائے،ادبی اجلاس اور رونمائی پر توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں بازار میں کاغذ،سیاہی،بجلی،ای میل،ڈاک،فون،پیٹرول،کمپوزنگ،ڈیزائننگ،پرنٹنگ کہاں سے کہاں پہنچ گئی ہے قطعی سے بے خبر نہیں ہیں بلکہ دانستہ اُس جانب توجہ دینا نہیں چاہتے۔جناب احمد ندیم قاسمی کی رحلت کے بعد اُن کی صاحبزادی ڈاکٹر ناہید قاسمی اور ڈاکٹر صاحب کے لائق فرزند جناب نیرّ حیات قاسمی جس جاں فشانی سے یہ ضخیم جریدہ جاری رکھے ہوئے ہیں وہ قابل دید بھی ہے اور قابل داد بھی۔چھ صد بتیس صفحات کے اس ادبی حیرت کدے میں کیا کچھ نہیں ہے۔ہر عمر،ہر ذوق اور ہر مزاج کے قاری کا سامان وافر مقدار میں مہیا کیا گیا ہے۔بیس اصحاب قلم کا حمدیہ اور نعتیہ کلام،گوشہ قرۃ العین حیدر،چودہ بلند قامت اہل قلم کی نسبت پر مغز مقالے،فن اور فنکار کے عنوان سے چار دلچسپ مضامین،ان گنت اور لاتعداد طویل اور مختصر نظمیں،تیس سے اوپر نامور اہل قلم کے افسانے اور کئی افسانچے،چالیس سے اوپر نامور شعراء کی غزلیں،یادداشتیں،فنون لطیفہ،سفرنامہ،تراجم،انشائیہ اور وہ سب کچھ جس کا احاطہ فنون لطیفہ میں کیا جاتا ہے۔

تو بندہ پرور جس دستاویز کے مشمولات تحریر کرتے ہوئے ہاتھ کے ساتھ قلم بھی جواب دے جائے اُس کی قیمت صرف چھ صد روپے پاکستانی ہے۔

رابطہ:251،بلاک F-2،واپڈا ٹاؤن،لاہور

N.P.R- 063

زندگی کے ساتھ ساتھ

# چہارسُو

جلد۲۶،شمارہ:جنوری،فروری ۲۰۱۷ء




رابطہ:537/D-1 ' گلی نمبر18،ویسٹریج-III ' راولپنڈی،46000،پاکستان۔

فون:518730433-(92+)

موبائل:0558618-336-(92+)

ای۔میل:chaharsu@gmail.com

۔ ویب سائٹ ۔

http://chaharsu.wordpress.com


پرنٹر:فیض الاسلام پرنٹنگ پریس ٹرنک بازارراولپنڈی

# متاعِ چہارسو



☆

○

# قرطاسِ اعزاز

○☆○

## ''اقصائے جہاں''

ایم اے ذوقی عہدِ نو کے ایسے ہیں ناول نگار — جن کی تخلیقات ہیں عصری ادب کا شاہکار
ہیں مدیرِ چارسو ان کے ہُنر کے قدرداں — ان کے رشحاتِ قلم ہیں باعثِ صدافتخار
گوشۂ قرطاس اعزاز آج ہے ذوقی کے نام — جن کے ہیں مداح اقصائے جہاں میں بے شمار
ان کی ہر تخلیق ہے آئینۂ نقد و نظر — ابن آدم کا عیاں ہے جس سے ذہنی انتشار
عہدِ حاضر میں ہیں عصری آگہی کے وہ نقیب — درد کا رشتہ ہے ان کے فکروفن سے آشکار
نبضِ دوراں پر نہایت سخت ہے ان کی گرفت — بحر ذخارِ ادب کی ہیں وہ دُرِ شاہوار
سب کے ہیں وردِ زباں ان کے نقوشِ جاوداں — گلشنِ اردو میں ان کی ذات ہے مثلِ بہار
اجتماعی زندگی کے ترجماں ہیں اس لئے — عہدِ حاضر میں ہیں وہ ناول نگاری کا وقار

ڈاکٹر احمد علی برقیؔ اعظمی

○☆○

# مشرف عالم ذوقی

# کے نام

○

# وحشتِ دل

## محمد انعام الحق

(اسلام آباد)

نام : مشرف عالم

قلمی نام : مشرف عالم ذوقی

پیدائش : ۲۴؍مارچ ۱۹۶۲ء

وطن : آرہ (بہار)

والد کا نام : مشکور عالم بصیری

والدہ کا نام : سکینہ خاتون

شریکِ حیات : تبسم فاطمہ

اولاد : عکاشہ عالم

**تصانیف**

**ناول:**

۱۔ عقاب کی آنکھیں (پہلا ناول) 1979

۲۔ نیلام گھر تخلیق کار پبلشرز 1985 (اردو)

نیلام گھر نمن پرکاشن 2007 (ہندی)

۳۔ شہر چپ ہے تخلیق کار پبلشرز 1988 (اردو)

شہر چپ ہے بھاؤنا پرکاشن 2007 (ہندی)

۴۔ ذبح تخلیق کار پبلشرز 1990 (اردو)

ذبح بھاؤنا پرکاشن 2008 (ہندی)

۵۔ مسلمان 2013 (اردو)

مسلمان اندرپرستھ پرکاشن 1990 (ہندی)

۶۔ بیان تخلیق کار پبلشرز 1995 (اردو)

بیان شاشا پبلی کیشن 1998 (ہندی)

بیان نیشنل پبلشنگ ہاؤس 2005 (ہندی)

۷۔ پوکے مان کی دنیا ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2000 (اردو)

پوکے مان کی دنیا شیلنائن 2006 (ہندی)

۸۔ پروفیسر ایس کی عجیب داستان ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2004 (اردو)

پروفیسر ایس کی عجیب داستان سامییک پرکاشن 2010 (ہندی)

۹۔ لے سانس بھی آہستہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2012 (اردو)

۱۰۔ (ایک چاندنی رات ہوا کرتی تھی) 2016 (ہندی)

۱۱۔ سب سازندے (زیرِطبع)

۱۲۔ اردو (زیرِطبع)

۱۳۔ سرحدی بتاح (زیرِطبع)

**افسانوں کا مجموعہ (اردو)**

۱۔ بھوکا ایتھوپیا تخلیق کار پبلشرز 1992

۲۔ منڈی تخلیق کار پبلشرز 1998

۳۔ غلام بخش تخلیق کار پبلشرز 1999

۴۔ صدی کو الوداع کہتے ہوئے ساشا پبلی کیشنز 2000

۵۔ لینڈ اسکیپ کے گھوڑے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2002

۶۔ ایک انجانے خوف کی ریہرسل ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس 2010

**(ہندی)**

۱۔ غلام بخش جن وانی پرکاشن 1994

۲۔ فرشتے بھی مرتے ہیں جن وانی پرکاشن 1994

۳۔ فزکس، کیمسٹری، الجبرا وانی پرکاشن 2005

۴۔ بازار کی ایک رات (ان۔پی۔اچ) 2008

۵۔ مت روسا لگ رام (ان۔پی۔اچ) 2009

۶۔ فرج میں عورت گیان پیٹھ 2010

۷۔ امام بخاری کا نیپکن پین گوئن 2009

۸۔ لیبارٹری کانفلوئمنس انٹرنیشنل 2006

۹۔ ذوقی کی سریشٹھ کہانیاں (ان پی اچ) 2000

۱۰۔ ذوقی کی متنوع کہانیاں نمن پرکاشن

۱۱۔ شاہی گلدان اروپرکاشن 2011

۱۲۔ ذوقی کی حسیت کہانیاں آلیکھ 2000

۱۳۔ بے حد نفرت کے دنوں میں زیرِطبع

۱۴۔ سارا دن سانجھ (بزرگوں کی کہانیاں) زیرِطبع

۱۵۔ ایک انجانے خوف کی ریہرسل

۱۶۔ شاہکار کہانیاں

**ویب سائٹ پر**

۱۔ ذوقی کے منتخب افسانے-تین حصے

(www.oneurdu.com پر ڈاؤن لوڈ کیا جاسکتا ہے)

**تالیف**

۱۔ سرخ بستی (دو حصے) جن وانی 1993

۲۔ وبھاجن کی کہانیاں وانی پرکاشن 2000

۳۔ منٹو پر آٹھ کتابیں وانی پرکاشن 2004

۴۔ عصمت کی منتخب کہانیاں وانی 2004

۵۔ بیدی کی منتخب کہانیاں — وانی — 2004
۶۔ جوگندر پال کی منتخب کہانیاں — وانی — 2004
۷۔ احمد ندیم قاسمی کی منتخب کہانیاں — وانی — 2004
۸۔ مسلم بانی عورتوں کی کتھا — راجکمل — 2005
۹۔ احمد فراز کی منتخب شاعری — وانی — 2006
۱۰۔ ہنس کا مسلمان نمبر — (اصغر وجاہت کے ساتھ معاونت) — 2000
۱۱۔ اُداس نسلیں — جن وانی — 2002

**تنقید**

۱۔ جدید افسانہ ۱۹۷۰ کے بعد (اردو) — (ان۔بی۔ٹی) — 2001
۲۔ اردو ساہتیہ، سنواد کے سات رنگ — جن وانی — 2007
۳۔ اپنا آنگن — بھاؤنا پرکاشن — 2007
۴۔ اردو جگت — بھاؤنا پرکاشن — 2008
۵۔ میں، اردو اور مسلمان (ہندی) — (زیرِطبع)

**بچوں کا ادب**

کنگن — ان بی ٹی — 2000

**ڈرامے**

۱۔ گُڈبائے۔ راجنیتی — ساشا پبلی کیشن — 2005
۲۔ اک سڑک ایودھیا تک — جن وانی پبلی کیشنز — 2005
۳۔ چار ڈرامے (اردو) — (زیرِطبع)

**سیریل**

۱۔ ۱۰۰ سے زیادہ ڈاکومنٹری
۲۔ مسلمان، رات چور اور چاند جیسے ناولوں پر سیریل
۳۔ ۱۹۸۸ سے دوردرشن اور منسٹری کے لیے مسلسل پروگرام بنانے کا سلسلہ جاری۔
۴۔ اردو شاعری، اردو صحافت پر پروگرام
۵۔ شخصیات پر مختلف پروگرام — قرۃ العین حیدر پر ڈاکومنٹری

**انعام و اعزاز**

انجمن فروغ اردو دوحہ قطر اعزاز — 2015
کرشن چندر ایوارڈ — 1997
الیکٹرانک میڈیا ایوارڈ — 1997
سہیل عظیم آبادی — 2016
ملینیم ایوارڈ، جامعہ اردو — 2000
سرسیّد نیشنل ایوارڈ — 2003
اردو اکادمی دہلی انعام — 2005
بہار اردو اکادمی انعام برائے فکشن — 2005
انٹرنیشنل ہیومن رائٹس انعام — 2007
تخلیقی نثر ایوارڈ (دہلی اردو اکادمی) — 2007
پروفیسر ایس کی عجیب داستان / دہلی اردو اکادمی کا انعام — 2006

### ''انسانیت سے محبت''

کوئی ناول نظریے کی بنیاد پر نہیں لکھا جاسکتا اور کسی مقامی یا مغربی لیک کی روشنی میں بھی نہیں لکھا جاسکتا۔ ناول فقط اندر کی آگ سے لکھا جاتا ہے۔ مبارک باد کے مستحق ہیں وہ لوگ جنہوں نے گذشتہ برسوں میں اس دور کو جھیلا ہے اور اپنی تخلیقات کے ذریعہ ایسے اقدامات کیے ہیں جن سے ناول اپنے ٹریک پر آگیا ہے۔ قرۃ العین حیدر، انتظار حسین، انور سجاد، بلراج منیرا، سرندر پرکاش کی تخلیقات ناقابل فراموش ہیں۔ نئی کہانی وہ ہے جس میں کہانی پن کا احساس ہو۔ بیانیہ کی بحالی ہوگئی ہے۔ شاعری کا عنصر فکشن میں بے معنی ہے۔ مشرف عالم ذوقی کے ''لے سانس بھی آہستہ'' کی دنیا ادب کی دنیا میں وسیع اور آزادانہ دنیا ہے۔ ادب میں کسی ایک مقام پر ٹھہرا نہیں جاسکتا۔ ہمارے ادب میں اردو فکشن نے انگڑائی لی ہے۔ کبیر، تکارام، بابا فرید نے جو کچھ بہت پہلے سوچا اس سوچ تک مغرب والے اب تک نہیں پہنچ پائے۔ فکشن میں موضوع کی پابندی نہیں ہونی چاہئے۔ Socio-political crisis پر تخلیق کار کیوں نہ لکھے۔ اجنبیت، بیگانیت ایسی Idiology نہیں جو کتابوں میں لکھی جائے۔ فنکاری کی بھی Idiology ہوتی ہے۔ وہ انسانیت سے محبت کرتا ہے۔ ''لے سانس بھی آہستہ'' Idiological ناول ہے۔ تہ داری (density) اور تنوع اردو فکشن میں حیران کن ہے۔ Feminism اور علاقائیت وغیرہ نیا تجربہ ہے۔ انٹرنیٹ google وغیرہ کا سب سے زیادہ اثر ذوقی کے بیانیہ میں دیکھا جاسکتا ہے۔

**پروفیسر گوپی چند نارنگ**

## براہِ راست

یہ بات ہمارے لیے باعثِ افتخار ہے کہ جناب مشرف عالم ذوقی سے ہماری دوستی دو دہائیوں پر مشتمل ہے۔ یہاں آپ کے ذہن میں یہ سوال بجا طور پر سر ابھارے گا کہ اتنی طویل رفاقت کے باوجود ذوقی صاحب کی خدمت میں قرطاس اعزاز اس قدر تاخیر سے کیوں پیش کیا گیا؟ اس کے سراسر قصوروار ذوقی صاحب خود ہیں۔ انہوں نے اتنی کم عمری میں نہایت برق رفتاری سے وہ کارہائے نمایاں انجام دے ڈالے جو بہت سے لوگ طویل عمری میں بھی نہیں کر پاتے۔ ہم ذوقی صاحب کے بالوں میں چاندی کا انتظار کرتے رہے اور وہ ادب کے افق پر چاند بن کر جگمگانے لگے۔ سو اس چاند کی روشنی سے آج ہم خود بھی استفادہ کر رہے ہیں اور آپ کو بھی دعوت دیتے ہیں کہ آیئے ادب کے اس چاند کی روشنی میں کچھ وقت گزارنے کے بعد اپنے احساسات سے ہمیں آگاہ کیجیے کہ آپ کا یہ وقت خوش وقت ہوا کہ نہیں۔ ہر دو صورتوں میں ہم اور ہمارے عزیز دوست ذوقی صاحب آپ کو خوش آمدید کہنے کے لیے بے تاب ہیں۔

**گلزار جاوید**

☆ مشرف عالم تو ٹھیک ہے یہ ذوقی صاحب کہاں سے برآمد ہو گئے؟

☆☆ بچپن کا زمانہ تھا۔ ابّا حضور لہک لہک کر میر و غالبؔ، اقبال کی غزلیں گنگنایا کرتے تھے۔ ایک دن وہ ہم بچوں کو بٹھا کر ذوقؔ کا کلام سنا رہے تھے۔ پتہ نہیں کیا ہوا کہ ذوق سے میں نے ایک قلبی لگاؤ محسوس کیا۔ مجھے یاد ہے۔ ایک چھوٹی سی بچوں والی سائیکل ہوا کرتی تھی۔ میں آنگن میں سائیکل چلاتا ہوا غالب اور اقبال کو بھول کر ذوق کا کلام گنگنانے لگا۔ یہ سلسلہ مسلسل جاری رہا۔ ایک دن ابّا حضور نے کہا.... یہ تو ذوقی ہے۔ بس صاحب اسی دن سے میں مشرف عالم ذوقی ہو گیا۔

☆ تیرہ برس کی عمر میں آپ نے کہانی کو ڈھونڈا یا کہانی آپ پر مسلط ہو گئی اور اس کا ثمر کس شکل میں ظاہر ہوا؟

☆☆ میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری پیدائش کہانیوں کے درمیان ہوئی۔ میرے گھر کو کوٹھی کہا جاتا تھا۔ وقت کے سرد و گرم سے گزرتے ہوئے اب یہ کوٹھی آسیب زدہ بوڑھی حویلی کی شکل میں سامنے تھی۔ ایک نانی اماں تھیں جو طرح طرح کی کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ ایک دادی اماں تھیں۔ جن کے پاس قصے کہانیوں کی کوئی کمی نہیں تھی۔ میں نے بچپن تک عورتوں میں پردہ کا سخت رواج دیکھا تھا۔ گھر سے باہر نکلنے پر پابندیاں تھیں۔ کہیں جانا ہوا تو باضابطہ رکشے پر پہلے پردے باندھے جاتے تھے۔ دادی اماں کی زندگی تک ڈولیوں کا رواج تھا۔ میرے لئے یہ سب کہانیاں تھیں۔ گھر میں آنے والے لوگ زندہ کہانیوں کے کردار تھے۔ ان میں ایک دودھ والی تھی۔ جو دو تین کلومیٹر دور گاؤں سے ندی پار کرتے ہوئے آتی تھی۔ اور جب آتی تو گاؤں کے قصے کہانیاں سنایا کرتی۔ اسی طرح ایک بولن بوا تھی جو کپڑوں کی ایک بہت بڑی گٹھری اٹھا کر آیا کرتی تھی۔ اور جب بھی آتی قصے کہانیوں کی گٹھریاں کھل جاتیں۔ ان واقعات کا ذکر میں نے اپنے ناول 'لے سانس بھی آہستہ' میں کیا ہے۔ ان سب کے علاوہ ہم بھائی بہنوں کی تربیت میں ابا حضور کا بہت ہاتھ رہا۔ وہ ایک عظیم داستان گو تھے۔ ہم تین بھائی بہنوں کی فوج کو لے کر ابا حضور رات کے وقت کہانیاں سنایا کرتے۔ ان میں سابق صدر جمہوریہ ہند ذاکر حسین کی مشہور کہانی 'ابو خاں کی بکری' بھی ہوتی۔ سراج انور کے ناول ہوتے۔ مثال کے لئے 'دوڑتا جنگل' 'کالی دنیا' 'پیلی دنیا'۔ یہ ناول ابا کو نہ صرف یاد تھے بلکہ ان کے سنانے کا انداز اس قدر ڈرامائی ہوتا کہ ہم بھائی بہن پُر اسرار ماحول اور فنتاسی کی دنیا میں کھو جاتے تھے۔ ابا کئی بار کہانیوں کو درمیان میں روک دیا کرتے اور مسکراتے ہوئے کہتے۔ اب اگلے دن۔ ہم بے صبری سے کہانی کے ختم ہونے کا انتظار کیا کرتے۔ میں ایک بات اور کہنا چاہوں گا۔ فنتاسی کی دنیا، ہیری پورٹر کی مصنف جے کے رولنگ کی محتاج نہیں ہے۔ میں دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ سراج انور نے رولنگ سے زیادہ بہتر ناول لکھے۔ ابا حضور ان ناولوں کے علاوہ 'طلسم ہوش ربا' 'دی میجک ماؤنٹین' سے لے کر مغرب کے مشہور ناول بھی ہم بچوں کو بیٹھا کر ڈرامائی انداز میں سنایا کرتے۔ مغرب کے شاہکار ناولوں کو پڑھنے کا اتفاق تو بعد میں ہوا، ابا حضور سے سننے کا موقع پہلے ملا۔ یہ تمہید اس لئے ضروری ہے کہ میری پرورش بچپن سے کہانیوں کے ماحول میں ہوئی۔ 11 سال کی عمر میں میں نے بچوں کے لئے کئی کہانیاں لکھیں۔ 13 سال کی عمر میں ایک رومانی افسانہ لکھ ڈالا۔ یہاں اس بات کا اظہار ضروری ہے کہ گھر سے باہر جانے پر پابندی تھی۔۔ گھر میں کتابوں کی ایک بہت بڑی لائبریری تھی۔ کتابیں میری دوست تھیں۔ اس لئے آپ کہہ سکتے ہیں کہ 13 برس کی عمر میں کہانی نے مجھے تلاش کر لیا۔ اور اس طرح تلاش کر لیا کہ میں آخری سانس تک کہانیوں کے چنگل سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ میں نے ثمر کی پرواہ نہیں کی۔ میرا کام

لکھنا ہے۔ یہاں ایک بات اور بتا تا چلوں۔ 20 سال کی عمر تک میں چار ناول لکھ چکا تھا۔ اس زمانے میں انٹرویو دیتے ہوئے میں نے ایک بات کہی تھی وہ آج آپ کے سامنے پھر دوہرا رہا ہوں۔ 'میں مرنے کے بعد بھی زندہ رہنا چاہتا ہوں' جس شخص نے 20 سال کی عمر میں اپنے لئے موت کا انتخاب کرلیا ہو، وہ ادب سے ملنے والے پھل کی پرواہ کیا کرے گا۔؟

☆ آڑی ترچھی تجریدی کہانیوں کا آئیڈیا کیونکر ذہن میں آیا پھر ترک کرنے کا جواز کیا بنا؟

☆☆ درصل آڑی ترچھی تجریدی کہانیوں سے میں دور گیا ہی نہیں۔ ۸۰ کے آس پاس فیشن زدہ جدیدیت سے متاثر ہو کر میں بھی افسانوں میں آڑی ترچھی لکیریں کھینچنے کا قائل تھا۔ علامتی اسلوب میں کہانیاں لکھیں۔ پھر ۹۰ کے بعد اپنا رنگ اختیار کیا۔ اب تجریدی کہانیوں پر آتے ہیں۔ ہمارے تخلیقی رجحان اس نو آبادیاتی فکری نظام کا حصہ ہیں، جہاں اچانک آنے والی تبدیلیوں نے ہماری گول گول گھومتی دنیا کے آگے بھی سوالیہ نشان لگا دیا ہے۔ ایک طرف ارتقا کی ریس، دوسری طرف گریٹ ڈپریشن کی شکار اکانومی۔ جنگ عظیم کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ، بڑھتی ہوئی دہشت گردی، تاریخ کے ساتھ سیاست کا جبر۔ مذہب کی بالا دستی بھی اور ایک دوسرے کے مذاہب پر شب خوں مارنے کی تیاری بھی۔ ہم ایک نئے جوراسک پارک میں تضاد اور کنفیوژن کا شکار ہو کر بونے ہو چکے ہیں۔ ایک معیشت تباہ ہو رہی ہے اور نئے سماجی و سیاسی رویّے پروان چڑھ رہے ہیں۔ ہم تہذیبوں کو بچانے، ماحولیات کے تحفظ کی باتیں کرتے ہیں اور جغرافیائی سطح پر ہماری زمین کم ہوتی جا رہی ہے۔ کلوننگ پروسس، ڈی ان اے کی نئی تہذیب اور موت پر فتح پانے کے چیلنجز کے باوجود ہم بڑھتی ہوئی دہشت گردی سے بھی پریشان ہیں۔ خوف کے اندیشے میں برطانیہ اور امریکہ جیسے ممالک مل کر کچھ معصوم تانا شاہوں کو ہلاک کر دیتے ہیں۔ چھوٹے ممالک بڑی مچھلیوں کی بھینٹ چڑھ جاتے ہیں۔ یہ سب بھی تجریدی رجحانات ہیں، جن کی طرف ہمارا ادیب دیکھ رہا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ڈپریشن، شوگر جیسے امراض میں مبتلا ہیں۔ بچوں اور عورتوں میں عالمی سطح پر آنے والی تبدیلیاں بھی نئے رجحان کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ سیاست، عمدہ فکشن کیلئے ضروری ہتھیار بن چکا ہے۔ ایک ختم ہوتی دنیا میں ڈائناسور کے لوٹنے کی پیشین گوئی ممکن ہے اور یہ دنیا توہمات سے اسقدر آلودہ ہے کہ ہالی وڈ 'اوتار' اور '2012' جیسی فلموں کی نمائش کر رہا ہے۔ پریم چند، منٹو، بیدی اور عصمت چغتائی کی کہانیوں سے وقت بہت آگے نکل گیا ہے۔ کہیں خدا واپس آ گیا ہے، کہیں نئے رشتوں کی تلاش ہو رہی ہے۔ ایک گلوبل دنیا سامنے ہے، جس کی چمک میں پرانی دنیا گم ہو چکی ہے۔ سائنس، کائنات اور انسان کو ادب کی مضبوط بنیاد کے طور پر دیکھا جا رہا ہے۔ ہرمن ہیسے نے 'ڈیمیان' میں کہا۔ 'ایک چڑیا انڈے سے جنم لینے والی ہے۔ جو جنم لینا چاہتا ہے، اسے ایک دنیا کو تباہ و برباد کرنا پڑے گا۔ پرانی دنیا کا زوال نزدیک آ رہا ہے۔ یہ دنیا نئی شکل لے گی۔' مارخیز کو کہنا پڑا۔ ایک ایسی حقیقت بھی ہے جو کاغذی نہیں، ہمارے اندر رہتی ہے۔ ہمارا سب سے بڑا مسئلہ ایسے پابند اظہار یا ذریعے کی تلاش کا رہا ہے، جو ہماری زندگیوں کی حقیقت کو قابل یقین بنانے میں ہماری مدد کر سکے، یہی تنہائی کا عقیدہ ہے۔ ان سے الگ ایک فکر میری بھی ہے۔ میں ہندوستانی سطح پر ایک نو آبادیاتی نظام کا گواہ تھا۔ مسلمانوں کی آمد، مغلوں کی حکومت، انگریزوں کی غلامی کے بعد تیزی سے تبدیل ہوتا ہوا ہندوستان میرے سامنے تھا۔ نئی صدی کے 16 برسوں میں فرقہ پرستی، دہشت گردی کے ساتھ سوپر انڈیا اور ڈیجیٹل انڈیا کے نعرے بھی تھے۔ حقیقت سے زیادہ فنتاسی حاوی ہے۔ عالمی سطح پر مارخیز کے سو سال کی اداسیوں کا پہرہ ہے۔ اس کو بھی نظر انداز کرنا مشکل ہے۔ نئی صدی کے آغاز کے ساتھ میں کہانیوں سے دور ہوتا چلا گیا۔ اب میں ناول کے میدان میں تھا۔ میرا خیال تھا کہ یہ وقت کہانیوں سے زیادہ ناول کا ہے۔ وقت کے تضاد اور کنفیوژن کو عام حقیقتوں کی طرح تحریر نہیں کیا جا سکتا۔ بقول غالب، کچھ اور چاہیئے وسعت میرے بیاں کے لئے۔ فکشن کا موجودہ سفر آسان نہیں ہے۔ فکشن بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ فکشن محض علامتوں کا کھیل نہیں۔ محض کیفیت اور احساس کو زبان دینے کا نام نہیں۔ اگر آپ کے پاس زندگی، سائنس، کائنات اور انسان سے وابستہ کوئی بڑا فلسفہ یا ویژن نہیں، تو آپ فکشن میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ نئی کہانی فنتاسی اور متھ کی سرنگ میں چلی گئی ہے۔ ایبسٹر یکٹ آرٹ کی طرح یہاں آڑی ترچھی لکیروں کی بھی ضرورت ہے کیونکہ حال اور مستقبل پر ابہام کی پرت چڑھ چکی ہے۔ فکشن میں ایک بار پھر ہم آہستہ آہستہ تجریدی رجحان کی طرف بڑھ رہے ہیں۔

☆ بچپن میں سیکس کے اثرات والی بات بہت معنی خیز ہے، اب آپ جانیں اور آپ کے قاری؟

☆☆ پہلا ناول 'عقاب کی آنکھیں' سیکس کے اثرات پر مبنی ناول تھا۔ اس زمانے میں، میں جن کیفیات سے گزرا، انہیں الفاظ میں بیان کرنا مشکل ہے۔ یہ ناول میں نے صرف سترہ سال کی عمر میں تحریر کیا تھا۔۔ یہ آپ نے خوب کہا، کہ سیکس کی بات آپ جانیں اور قاری۔ سیکس انسانی روابط اور محبت کے ذائقہ کی معراج ہے۔ مگر اردو والوں نے سیکس کو 'طلسم ہوش ربا' کی ساحرہ سمجھ لیا۔ ساحرہ، جس کی طرف پلٹ کر دیکھنے والا پتھر کے مجسمے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ آج اکیسویں صدی میں بھی سیکس کو لے کر مختلف طرح کے مغالطے موجود ہیں۔ سیکس ایک ایسا فطری جذبہ ہے، جس سے انکار عمر کی کسی بھی دہلیز پر ممکن نہیں ہے۔ بلکہ نوجوانوں سے کہیں زیادہ سیکس اپیل بڑھتی عمر کے لوگوں میں پائی جاتی ہے۔ اور اس سے بھی انکار ممکن نہیں۔ سماج اور مذہب کی بندشوں کے باوجود اس کے اثرات سے انکار کرنا مشکل ہے۔ میں فلمیں دیکھتا ہوں۔ ڈرامے دیکھتا ہوں۔ مختلف ممالک اور دنیا بھر کے ادب کا مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ چین، کوریا، جاپان میں سیکس کے کھلے اظہار کی حقیقت کو تسلیم کر لیا گیا ہے۔ میں آزاد معاشرے کی

بات نہیں کر رہا،صرف آپ کو مثال دے رہا ہوں۔ان ممالک میں Incest کے رویّے اس حد تک عام ہیں کہ اب ان پر بھی گفتگو نہیں ہوتی۔دراصل گلوبل دنیا میں قدم رکھنے سے قبل سیکس کے اثرات کو ہم نے سات پردوں کی قید میں رکھا تھا۔اتنے ٹی وی چینلس بھی نہیں تھے۔نئی دنیا میں کمپیوٹر، لیپ ٹاپ اور موبائل کے استعمال نے چھوٹے چھوٹے بچوں کے درمیان سے بھی سیکس کا پردہ ہٹا دیا۔آپ یوٹیوب،سلٹ کوڈ،اکس ویڈیوز پر آرام سے پارن فلمیں دیکھ سکتے ہیں۔کیا آپ اپنے بچوں کو روک سکتے ہیں؟ اس کا جواب ہے نہیں۔؟ ایک نفسیاتی نکتہ ہے کہ آپ جس قدر روکنے کی کوشش کریں گے، اسی قدر بچوں میں تجسّس پیدا ہوگا۔مذہب کسی حد تک آپ کو روکنے کا کام کرتا ہے۔مگر یاد رکھئے مذہب کی بھی ایک سرحد ہے۔کبھی کبھی جنسی طغیانی ہر بندھ توڑ دیتی ہے۔سیکس پر مغرب میں بہت لکھا گیا مگر ان تحریروں کو بولڈ نہیں کہا گیا۔ہم لکھتے ہیں تو ہماری تحریروں کو بولڈ کہہ دیا جاتا ہے۔ارے کیوں بھائی؟ جسم بولڈ ہے؟ جسم کے تقاضے بولڈ ہیں۔ہم اپنے قلم کو اس قدر پاک صاف رکھنا چاہتے ہیں کہ جسم کے حصوں کے نام تک لینے سے خوف کھاتے ہیں۔ادب کا کام سمجھنا بھی ہوتا ہے۔ادب ایک مطالعہ، ایک وژن کا نام ہے۔اس لئے سیکس پر آج کے دور میں میں صرف سرسری ریمارک سے کام نہیں چلے گا۔گفتگو کرنی ہوگی۔میں نے مختلف ناول اور کہانیوں میں اس پر گفتگو کی ہے اور آج بھی کر رہا ہوں۔لیکن یہ ایشو کوئی بہت بڑا ایشو نہیں ہے۔یہ میرے موضوعات کا صرف ایک فی صد حصہ ہے، جہاں میں انسانی جسم کو بھی مکالمے کا حصہ بناتا ہوں۔میری کہانیاں تاریخی اور سیاسی شعور سے برآمد ہوتی ہیں اور مستقبل پر نظر رکھتی ہیں۔

☆ آپ نے تکرار کے ساتھ اپنے شرمیلے پن کا ذکر کر کے توجہ علم نفسیات کی جانب مرکوز کر دی؟

☆☆ بچپن میں ایک شرمیلا ذوقی سامنے تھا۔اس ذوقی کو تھوڑا تھوڑا اہلاک کرنے میں برسوں لگے ہیں۔’شرمیلا پن‘ دراصل ایک خوفناک اور خطرناک بیماری ہے۔میں لوگوں سے ملتے ہوئے گھبراہٹ محسوس کرتا تھا۔جس قدر باتیں ممکن تھیں،خود سے کیا کرتا تھا۔اس طرح میرے اندر خیالات کے کئی ’خانے، تہہ خانے پیدا ہونے لگے۔ان خانوں میں کہیں شیش ناگ کی طرح سیکس بھی چھپا بیٹھا تھا۔اس عمر میں سیکس مختلف طرح سے آپ پر حملہ کرتا ہے۔میری شروعاتی کہانیوں میں اس کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔آپ نے علم نفسیات کی بات کی۔ادب کے لئے سائنس، تاریخ، سیاست، فلسفہ کے ساتھ علم نفسیات کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔اور آپ غور کریں تو ہر شخص کے اندر ایک سگمنڈ فرائیڈ موجود ہے۔بدلتے وقت کے ساتھ تھیوری بدلتی ہے۔کنفیشن کا معاملہ شروع سے میرے ساتھ چلتا رہا۔یہ پورا نفسیاتی پروسیس ہے جو آج بھی چل رہا ہے۔آپ دیکھیں تو ایک مقام ایسا بھی ہے، جب بڑے خطرناک سیاست داں بھی آپ کو شرمیلے نظر آئیں گے۔خود سے فرار حاصل کرنا بھی شرمیلا پن ہے۔ٹرمپ، نواز شریف، مودی، خوفناک شرمیلا پن سب کے وجود کا حصہ ہے۔اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ عوام تک کبھی ان کے اصل چہرے سامنے نہیں آتے۔حقیقی چہرہ نقاب میں ہوتا ہے۔ہمارے یہاں ایک اصطلاح بار بار دہرائی جاتی ہے۔ملٹی پل فیسز۔ایک چہرے میں کئی چہرے کا ہونا۔ان بہت سے چہروں میں ایک چہرہ شرمیلا ہوتا ہے۔یہ چہرہ کبھی اداکار کی طرح ڈرامے کرتا ہے۔کبھی رنگ برنگ کے لباس پہن کر مسخرہ بن جاتا ہے۔آج یہ چہرہ عمومی طور پر ہمارے سماج کا چہرہ بن گیا ہے۔

☆ ہم عمر لڑکیوں میں جھنڈے کیسے اور کیوں کر گاڑے جاتے ہیں خدا نے کوئی کرشمہ کیا تو ہم بھی استفادہ کریں گے۔کبھی کسی کی یاد ستاتی ہے تو اُن لمحات کو کیسے بِتاتے ہیں؟

☆☆ ہا..ہا..میں بالکل بھی نہیں بتاؤں گا صاحب کہ آپ استفادہ کر سکیں۔خدا جانے کیوں، لیکن اس عمر میں یہ شرمیلا شرمیلا ذوقی ہی لڑکیوں کو پسند تھا۔اس دور کی ہزاروں یادیں وابستہ ہیں۔کیا بچپن کو بھولا جا سکتا ہے؟ بچپن، نوجوانی ہماری عمر کا قیمتی سرمایہ ہے۔اس زمانے میں کئی ایسے چہرے تھے، جس کی یاد اب بھی ستاتی ہے۔کچھ کردار ایسے ہیں، جن کا ذکر میری سوانح میں ہوا ہے۔یہ سوال آپ کا خوب ہے کہ ان لمحوں کو کیسے گزارتے ہیں؟

یہ بھی ایک خوبصورت نفسیاتی نکتہ ہے۔ہوتا یہ ہے کہ (جیسا میں اب محسوس کرتا ہوں) ۵۰ کے بعد آپ زیادہ پرانے دنوں کے حصار میں ہوتے ہیں۔اور اس طرح ہوتے ہیں کہ جیسے یہ لمحہ ابھی ابھی آپ کے پاس سے گزرا ہو۔اکثر تنہائی میں، میں ان گزرے لمحات کی زد میں ہوتا ہوں۔پھر میں خود کو بھی یاد نہیں رکھتا۔ایک چھوٹا موٹا منّا بن جاتا ہوں۔اور منّا بن کر زندگی کے تمام سرد و گرم سے دور نکل آتا ہوں۔

☆ اگر ہم غلطی پر نہیں تو آپ نے شاعری میں بھی چکھا چکھائی ضرور کی ہے۔

☆☆ بچپن میں شاعری کی۔پھر خیال آیا، میں شاعری کر ہی نہیں سکتا۔یہ بھی خیال تھا، کہ جو موضوعات میرے پاس ہیں، ان کو قلمبند کرنے کے لئے افسانہ اور ناول ہی موزوں ہو سکتے ہیں۔میں نے شروعات کہانیوں سے ضرور کی مگر اس کا نتیجہ تھا کہ ۱۷ سال کی عمر میں، میں نے پہلا ناول لکھ ڈالا۔چکھا چکھائی کا کام اب بھی ہوتا ہے۔

☆ بائیسواں برس تو حوصلوں کی جولانی کے لیے بہت موزوں گردانا جاتا ہے آپ نے اُسے کن معنوں میں ہائی لائٹ کیا ہے؟

☆☆ ’وحشت کا بائیسواں سال‘ یہ میری کہانی کا عنوان ہے۔اس سیریز کی تین کہانیاں اس وقت لکھیں جب میری عمر ۲۲ برس تھی۔یعنی بیس سے دو آگے۔یہ وہ زمانہ تھا جب میں حسین رومانی لہروں کے درمیان تھا۔زندگی نئے نئے فلسفوں میں سانس لے رہی تھی اور ان میں رومانی فلسفہ سب پر حاوی تھا۔اور یہ رومانیت تھی جو مجھے زندگی کی حقیقت سے آگاہ کر رہی تھی۔گو اس کی شروعات

بیسویں منزل پر ہوچکی تھی۔مگر بائیسواں سال، اس کی خاص اہمیت ہے۔یہ سال تبسم سے ملاقات کا سال تھا۔شروعات کے رومانی لمحوں میں جو طغیانی ہوتی ہے، اس کا لمس، اس کا احساس الگ ہوتا ہے۔زندگی کو دیکھنے کے زاویے بدل گئے تھے۔میں نے اپنی سوانح میں بھی بائیسویں سال کی اہمیت کا خصوصی طور پر اعتراف کیا ہے۔

☆ آرہ چھوڑنے کا خیال کیوں آیا، آیا تو دلّی کے انتخاب کی وجہ کیا تھی۔ آج اپنے انتخاب کی بابت محسوسات کیا ہیں؟

☆☆ آرہ۔ بہار کا ایک چھوٹا سا شہر۔ یہ شہر میرے خوابوں کا شہر ہے۔ میرے خوابوں کے رومان کا شہر ہے۔میں یہ ضرور کہوں گا، کہ دلّی جانے کے بارے میں اس زمانے میں سوچنا بھی میرے لئے مشکل تھا۔وہی شرمیلا آدمی، جو میرے ہمراہ تھا، مجھے بار بار دلّی جانے سے روک رہا تھا۔اتنا بڑا شہر۔مقابلہ کیسے کروگے؟۔میں دلّی روزگار سے زیادہ ادب کیلئے آیا اور جب آیا تو میرے پاس قلم کے سوا کوئی سرمایہ نہ تھا۔اسی شہر میں آہستہ آہستہ میں نے شرمیلے پن کی کینچلی اتار پھینکی۔دلّی آنے والا ذوقی ایک نیا ذوقی تھا۔اس کے سامنے چیلنجز تھے۔آج بھی یہ چیلنجز موجود ہیں۔لیکن جیسے منٹو پاکستان جانے کے بعد بھی ممبئی کو نہیں بھول پایا، دلی میں رہتے ہوئے بھی میں پل پل آرہ، میں رہا ہوں۔آرہ کی یادوں سے باہر نکلنا مشکل ہی نہیں میرے لئے ناممکن بھی ہے۔آج میرے محسوسات کیا ہیں؟ یہ بتانا ابھی مشکل ہے۔میں اپنی تحریروں سے مطمئن ہوں لیکن زندگی کی جدو جہد اور جنگ میں ہارتا رہا ہوں۔اور اس لئے ہارتا رہا ہوں کہ میں نے کبھی، کسی سطح پر کوئی سمجھوتہ نہیں کیا۔اور اس لئے اب دوبارہ دلی سے بھاگ کر آرہ جانے کی حسرت ہے۔لیکن جانتا ہوں، اب یہ ممکن نہیں ہے۔

☆ دلی کی زبان تو ایک عالم میں مشہور رہی ہے آپ نے اسے کس بنیاد پر گونگی کے خطاب سے نواز دیا؟

☆☆ دلّی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ دلّی اونچا سنتی ہے۔اونچا اس لئے سنتی ہے کہ دلّی راجدھانی ہے۔ یہاں صدر جمہوریہ ہند اور وزیر اعظم کی رہائش گاہیں ہیں۔ یہاں سے حکومت چلتی ہے۔اور آپ جانتے ہیں کہ حکومت گونگی، بہری ہوتی ہے۔اور اس لئے دلی بھی گونگی، بہری ہے۔یہ سچ ہے کہ دلّی ایک زمانے تک زبان کے لئے مشہور تھی۔زبان دہلوی، قلعہ معلّٰی کی زبان کے کیا کہنے۔مگر اب دلّی والے ہیں ہی کتنے ہیں؟ دلی میں دلی والے کم رہ گئے۔ باہر سے آ کر بستیاں آباد ہوگئیں۔اس لئے زبان دہلوی کی وہ مٹھاس اور ذائقہ بھی گم ہوگیا۔آپ غور کریں تو ندیوں کی طرح زبانیں بھی رنگ اور موڑ بدلتی ہیں۔آج دلی میں سیاسی زبان حاوی ہے۔اس سیاسی زبان میں نفرت کے جراثیم موجود ہیں۔زبانیں مرحوم ہورہی ہیں۔اردو کو ختم کرنے کی سازش ہورہی ہے۔اردو جس شکل میں موجود ہے۔اس پر بھی خوفناک خطرہ منڈرا رہا ہے۔اس لئے دلی والوں کی زبان کی بات چھوڑیئے، اس گونگی بہری دلی بلکہ گونگے بہرے ہندوستان میں اردو زبان کو زندہ رکھنا بھی ایک بڑا چیلنج بن چکا ہے۔

☆ آپ کے مطالعے، مشاہدے اور تجربے کو آپ کی عمر کی نسبت زیادہ بڑا کر دیا گیا ہے، دیکھتے ہیں آپ کا بیان اس پر کس طرح مہر ثبت کرتا ہے؟

☆☆ میرے بھائی گلزار جاوید صاحب۔کیا نازک اور خوبصورت سوال کیا ہے آپ نے۔مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ۔ادب میں رنگ بھرنے کے لئے تینوں ضروری ہیں۔سب کی اپنی اپنی اہمیت۔مطالعہ کی زرخیزی نہ ہو تو آپ لکھ بھی نہیں سکتے۔مطالعہ ہی نہیں تو آپ کے یہاں ویژن کیسے آئے گا۔مطالعہ آپ کو ویژن دیتا ہے۔اور مطالعہ صرف فکشن، ناول یا شاعری کا نہیں۔بہتر فکشن لکھنے کے لئے آپ کو فلسفہ بھی پڑھنا ہے۔تاریخ، جغرافیہ، سیاست، سائنس کی بھی نالج ضروری ہے۔آپ کو اپ ڈیٹ رہنا ہے۔یعنی اس وقت عالمی سطح پر کون سی ادبی تحریک چل رہی ہے اور کیا لکھا جا رہا ہے۔یہ سب جاننا آپ کے لئے ضروری ہے۔لیکن اچھا لکھنے کے لئے صرف مطالعہ کافی نہیں۔اس کے لئے تجربوں کی ضرورت ہے۔تجربوں کا مطلب بزرگی سے قطعی نہیں ہے۔ایک شعر سنئے

پلک جھپکتے بڑھاپے میں پاؤں رکھتے ہیں
ہمارے عہد کے بچے جواں نہیں ہوتے

بچے کا بڑھاپے میں پاؤں رکھنا بھی تجربہ ہے۔ہم اپنے تجربوں کو اپنی کہانیوں میں دہراتے ہیں اور انہیں خوبصورت طریقے سے پیش کرنے کے لئے گہرے مشاہدے کی ضرورت ہوتی ہے۔میں اپنے تجربوں میں بڑا تھا۔یہی آپ کے سوال کا اصل جواب ہے۔مطالعہ اور مشاہدہ میرے تجربے کو زبان دینے کا کام دے رہے تھے۔مطالعہ، مشاہدہ تجربہ کیساتھ ایک نام اور جوڑ دیجئے۔سیر وسیاحت، اچھی تخلیق کے لئے یہ بھی ضروری ہے۔ذہنی اُفق کھلتا ہے۔نئے نئے لوگوں سے ملاقات، نئے شہروں کو دیکھنے کا عمل، مختلف ممالک میں رہنے والوں کے ساتھ رابطے کا عمل۔یہ دیکھنا کہ ان کی زندگی جینے کا طریقہ کیا اور کیسا ہے۔یہ سب کہیں نہ کہیں آپ کے اندر کے فنکار کو متاثر کرتے ہیں۔آپ کہہ سکتے ہیں کہ میرے تجربوں نے عمر کی نسبت مجھے زیادہ بڑا کر دیا۔ یہاں ایک بات اور بتادوں کہ سرکاری سرٹی فکیٹ میں جو میری عمر ہے، وہ 24 نومبر 64 ہے۔یعنی سرٹیفکیٹ کے مطابق میں اپنی عمر سے دو سال کم ہوں۔فروغ اردو دوحہ قطر کا انعام اب تک جن ادیبوں کو دیا گیا، ان میں زیادہ کی عمر ستّر پار ہے۔مجھے یہ انعام 52 سال کی عمر میں ملا۔مجھے تعجب اس لئے نہیں ہوا کہ میں نے گیارہ سال کی عمر سے ہی لکھنے کا آغاز کر دیا تھا۔بہر کیف، یہ باتیں درمیان میں اسلئے آگئیں کہ ہر صفحہ پر زندگی کا کوئی نہ کوئی سچ پوشیدہ ہے۔

☆ ترقی پسندی کا چٹخارے دار پانی منہ میں آپ کے آیا الزام بے چاری دلّی پر؟

☆☆ بیچاری دلّی کیا۔الزام کی زد میں اس وقت پوری دنیا ہے۔ایک زمانہ تھا جب میں ترقی پسند تھا۔آج میں کسی ازم سے وابستہ نہیں ہوں۔میں کھلی

فضا میں سانس لیتا ہوں۔آزاد خیال ہوں۔روایتیں توڑتا ہوں۔نئی روایتیں قائم کرتا ہوں۔دراصل ترقی پسند ہونا برا نہیں ہے۔ہم میں سے کون ہے، جو ترقی پسند نہیں۔ترقی پسندی تحریک نہیں۔نظریہ ہے۔ہم ناجائز سیاست کے خلاف جنگ لڑتے ہیں یہ بھی ترقی پسند ہونا ہے۔ہم عورتوں کی آزادی کی بات کرتے ہیں۔یہ بھی ترقی پسندی ہے۔ہم انسانی حقوق کے لئے آواز اٹھاتے ہیں۔یہاں بھی ترقی پسندی ہے۔اور دلی تو الزام کی زد میں کل بھی تھی۔آج بھی ہے۔سیاست کو لیں تو آزادی کے ۷۰ برسوں میں مسلمانوں کے خلاف سب سے برا سلوک کانگریس نے کیا۔مسلمانوں کا ذکر اس لئے کیا کہ مسلمان اس ملک کی دوسری بڑی اکثریت ہیں۔(دیکھئے میں نے اقلیت نہیں کہا۔کہہ بھی نہیں سکتا۔25 کروڑ کی آبادی اقلیت نہیں ہوتی)۔اس لئے جب ملک کا ذکر آئے گا تو سب سے پہلے اکثریت کا ذکر آئے گا۔مسلمان بھی دوسری بڑی اکثریت ہیں۔لیکن ۷۰ برسوں کی سیاست گواہ ہے کہ ملک میں ایک چوتھا موسم بھی رہا۔فرقہ وارانہ فسادات کا موسم۔بی جے پی اسی روش پر چلی، جس پر کانگریس چل رہی تھی۔کانگریس نے ہندوستان کے مسلمانوں کو مغالطے میں رکھا تھا۔بی جے پی نے پردہ ہٹا دیا۔لیکن کہاں ہیں ہمارے لکھنے والے ترقی پسند؟ سب سوگئے ہیں۔جدیدیے؟ جدیدیت پسندوں نے تو کبھی ملک کے حالات کے بارے میں سوچنا بھی ضروری نہیں سمجھا۔ پھر لکھتے کیوں ہیں۔ادب برائے ادب کا فلسفہ آج کے عالمی سیاست کے بحران میں ختم ہو چکا ہے۔ہمارے یہاں بھی کچھ لوگ اب بھی نقالی کر رہے ہیں۔میں پوچھتا ہوں، سیاسی شعور کے بغیر، ضمیر کو مردہ کرتے ہوئے آپ کا لکھنا کہاں تک جائز ہے؟اب ہوا یہ کہ ہم مزاجاً ترقی پسند ہیں مگر اندر جو فنکار چھپا بیٹھا ہے وہ ادب کے درمیان توازن پیدا کرتا ہوا راستہ بناتا ہے۔اب یہ ترقی پسندی چٹخارہ نہیں ہے، موت کے ذائقہ میں آہستہ آہستہ تبدیل ہو چکی ہے۔ہم سب بے حد برے دنوں کے گواہ ہیں۔

☆ سیاہ رات کب اور کیسے ڈھلی قسمت، کوشش، لابنگ یا گاڈ فادر؟

☆☆ سیاہ رات اب بھی قائم ہے۔ذوقی گھر سے نکلتا ہی نہیں تو لابنگ کیا کرے گا۔میں کسی سے نہیں ملتا۔میں کسی ازم کے چکر میں نہیں رہا۔میرا صرف ایک مقصد تھا، بہتر سے بہتر لکھنے کی تلاش۔یہ تلاش اب بھی جاری ہے۔قسمت، تقدیر اب بھی کسی تاریک سرنگ کا حصہ ہے۔موہوم روشنی اور امیدوں کے درمیان اس عمر میں بھی میری جنگ مسلسل جاری ہے۔جن کے گاڈ فادر ہوتے ہیں، یا جو لابنگ کرتے ہیں وہ مرجاتے ہیں۔کئیوں کو گاڈ فادر مار دیتے ہیں۔اس کی سب سے عمدہ مثال قمر احسن ہیں۔گاڈ فادر نے مار دیا۔کچھ اور بھی ہیں جو مرنے کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔

☆ آپ ہمیں اُن لوگوں کے اسمائے گرامی گنوایئے جو آپ کے پسندیدہ ادیب ہیں اور جن کے اثرات آپ کے ہاں تلاش کیے جاسکتے ہیں صرف اردو کے حوالے سے؟

☆☆ اچھا لگنا اور متاثر ہونا دو الگ باتیں ہیں۔میرے پسندیدہ اردو مصنف میں کئی نام ہیں۔سب سے پہلا نام مستنصر حسین تارڑ کا نوٹ کر لیجئے۔ میں آج بھی تسلیم کرتا ہوں کہ تارڑ جیسا کوئی نہیں۔مرزا اطہر بیگ انفارمیشن، ٹکنالوجی اور فلسفوں میں کچھ زیادہ الجھ گئے۔رضیہ فصیح احمد کے کئی ناول پسند ہیں۔قرۃ العین حیدر، منٹو، عزیز احمد، کرشن چندر، عصمت چغتائی، بیدی۔یہ سب میرے پسندیدہ مصنف ہیں۔عبداللہ حسین کو بھی پڑھا۔پڑھا تو سب کو۔کسی کو نہیں چھوڑا۔کرشن چندر کے ساتھ اردو والوں نے سوتیلا سلوک کیا۔ایک گدھے کی سرگزشت، ایک گدھا نیفا میں، گدھے کی واپسی اور الٹا درخت تو عالمی پائے کی تخلیقات ہیں۔مگر ہوا یہ کہ اردو کے احمق ناقدین منٹو کو کرشن سے بڑا بنانے میں لگ گئے۔اور آج بھی یہی ذمہ داری ادا کر رہے ہیں۔آپ کے یہاں نئی نسل زبردست آئی ہے۔اسد محمد خاں، فہمیدہ ریاض، زاہدہ حنا، مبین مرزا، آصف فرخی، حمید شاہد، طاہرہ اقبال، اقبال خورشید، اخلاق احمد، یہ سب میرے پسندیدہ ادیب ہیں۔ہندوستان کی بات کیجئے، تو جوگندر پال، رتن سنگھ نے کئی عمدہ افسانے لکھے۔عبدالصمد کے بارہ رنگوں والا کمرہ، ہونی انہونی کا جواب نہیں۔صدیق عالم اگر مغرب کے فیشن کی نذر نہ ہوں تو عمدہ لکھنے کی صلاحیت موجود ہے۔

میں صرف اتنا کہنا چاہوں کہ ان میں ہر کسی کے پاس دو ایک عمدہ افسانے ضرور ہیں۔رہی اثرات کی بات، تو میں جلد کسی سے متاثر نہیں ہوتا۔ہاں، میرا آئیڈیل روسی افسانہ نگار دوستوفسکی ہے۔

☆ آپ پر کتنے اساطیر کی کہانیوں کے سرقہ کا الزام عائد کیا جاسکتا ہے اور کیا یہ کارِ خیر آپ بھی باوضو ہو کر کیا کرتے تھے مگر کیوں؟

☆☆ خوب۔یہ ۸۰ سے ۸۴ کا زمانہ تھا۔انتظار حسین کی اساطیری کہانیوں نے پاکستان کے ساتھ ہندوستانی ادیبوں کو بھی متاثر کیا تھا۔یہ وہ زمانہ تھا جب ایک سُر میں، سارے کے سارے انتظار حسین کی پیروی کر رہے تھے۔قرآن شریف، حدیث، مذہبی کتابوں کے حوالہ سے بھی کہانیاں لکھی جارہی تھیں۔صاحب، میں نے بھی استفادہ کیا۔باضابطہ وضو کر کے لکھنے بیٹھتا تھا۔ایسی کہانیوں کی بھی تعداد کافی بڑی ہے۔مگر یہ کہانیاں میرے کسی بھی افسانوی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔میں خطرناک فیشن کی زد میں تھا۔مگر جلد ہی استغفار پڑھ کر میں اس موسم سے باہر نکل آیا۔

☆ جدیدیوں اور ترقی پسندوں نے آپ کی کہانیوں کو کن اعتراضات کے ساتھ ناپسندیدہ قرار دیا؟

☆☆ اعتراضات کبھی کسی زمانے میں ہوئے ہوں گے۔اور ضرور ہوئے ہوں گے۔میں نے اعتراضات کی پرواہ نہ کل کی نہ اب کرتا ہوں۔بلکہ اب ایسے لوگوں کی تعداد زیادہ ہے جو تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں۔میں اس تعریف کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔تنقید اور تعریف دونوں نقصان دہ ہیں۔میرا کام صرف لکھنا ہے۔دوسروں کی تنقید مجھے یہ نہیں سکھائے گی کہ مجھے کیا

لکھنا ہے۔ یہ مجھے طے کرنا ہے کہ مجھے کب کیا لکھنا ہے۔ایک خاص بات اور۔رہی اعتراضات کی بات تو ایک خاص عمر تک میں دشمن ہی پیدا کرتا رہا۔ادبی سیمیناروں میں دل کی بات کہتا تھا۔حق کی بات کرتا تھا۔میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند۔جو مجھے پسند نہیں آئے، اس کا برملا اظہار کرتا تھا۔بلکہ لکھتا بھی تھا۔دشمن بنتے گئے۔بہت حملے ہوئے۔۲۰۰۰ء سے میں نے یہ روش چھوڑ دی۔مجھے خیال آیا کہ ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں ہے۔تنقید برائے تنقید اور اعتراض برائے اعتراض کا کچھ حاصل نہیں۔نئی صدی کے سولہ برسوں میں، میں نے صرف لکھنے کا کام کیا ہے۔اور میں اس بات کی مطلق پرواہ نہیں کرتا کہ لوگ میرے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں۔

☆ قمر رئیس مرحوم کے علاوہ آج بھی بہت سے لوگ آپ کی زبان پر اعتراض کن اسباب کی بنا پر کرتے ہیں؟

☆☆ قمر صاحب نے جس ناول کے بارے میں تحریر کیا وہ میں نے محض ۲۰ سال کی عمر میں تحریر کیا تھا۔لیکن یہ بھی دیکھئے کہ قمر رئیس سے حفیظ بنارسی مرحوم تک نیلام گھر کی تعریف کرنیوالوں کی بھی کمی نہیں تھی۔میں سائنس کا طالب علم تھا۔بی اے میں گیا تو تاریخ اور سیاست سے رابطہ قائم کیا۔اس لئے نیلام گھر میں کچھ جگہوں پر میری زبان کو لے کر اعتراض کیا گیا۔مگر ناول کی تھیم اور پلاٹ کی تعریف بھی کی گئی۔اور میرے بھائی، بیس سال کی عمر میں نیلام گھر جیسا ناول لکھ لینا کیا کوئی عام بات تھی۔رہی آج اعتراض کرنے کی بات۔تو صاحب، یہ سیاست ہے۔کس کی سیاست ہے بتانے کی ضرورت نہیں ہے۔یہاں وہی شعبدہ باز اور جادوگر ہے، جسے گاڈ فادر بننے کا بھوت سوار ہے۔اس بارے میں کئی دلچسپ کہانیاں سامنے آئیں۔مجھے پڑھنے تک سے روکا گیا۔میرے خلاف پاکستان میں بھی بیان بازی کی گئی۔بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا گیا۔آج بھی قارئین کے دلچسپ فون آتے ہیں۔جس میں یہ لوگ بتاتے ہیں کہ جب مطالعہ کرنا چاہا تو باضابطہ روکا گیا۔پھر ایسے قارئین اپنے دل کی بات کرتے ہیں کہ ذوقی کے بعد کسی کو پڑھنے کی ضرورت نہیں محسوس کرتا۔یہ ایشو ہے صاحب۔میں کہتا ہوں، مجھے جی بھر کر گالیاں دیجئے۔مگر مجھے پڑھ لیجئے۔میں اوریجنل ہوں۔ذوقی اوریجنل ہے۔کسی کا رنگ غالب نہیں۔اور جب کسی کو کچھ نہیں ملتا تو زبان کی بات چھیڑ دیتے ہیں۔زبان ان کی وراثت ہے کیا؟ داغ پر ناول لکھنا کوئی بڑا کام ہے؟ کچھ لوگ چیتن بھگت کی طرح پبلی سٹی کے سہارے آگے بڑھ رہے ہیں۔سیاست میں میں بھی یہی ہوتا ہے۔میڈیا میں پبلی سٹی کا اپنا رنگ حاوی ہے۔مدرسوں کی زبان مختلف ہے اور کہانی کی زبان مختلف۔اپنی کمزور کہانیوں کو ایسے لوگ زبان کے ذریعہ ڈھکنے اور چھپانے کا عمل کرتے ہیں۔اس سے کیا ہوگا۔فیصلہ تو آنے والا وقت کرے گا۔کون زندہ رہے گا اور کون نہیں۔اسے ابھی سے کیوں سوچا جائے۔

☆ ''اردو میں جو لوگ بھی لکھ رہے مجھے سب سے شکایت ہے کوئی نظریہ، افق اور سیاسی منظر نامے سے دور کا بھی واسطہ نہیں، ذوقی صاحب آپ جیسے باشعور تخلیق کار کو یہ ''بڑ'' زیب دیتی ہے کیا؟

☆☆ یہ واقعی 'بڑ' ہے۔ اور یہ خیال آج کا نہیں۔ کم از کم بیس برس پرانا زمانہ ہے۔اس درمیان مطالعہ اور تجربوں نے مجھے خاصہ سکھایا ہے۔آگ تو ابھی بھی ہے صاحب۔مگر توازن کے ساتھ۔سماجی اور سیاسی شعور کی کمی ابھی بھی نظر آتی ہے۔مگر پختہ اور بالیدہ لوگ بھی ہیں۔جیسے تارڑ صاحب، رضیہ فصیح احمد، مرزا اطہر بیگ، ایک نام بھول گیا۔ عاصم بٹ۔ نئے لوگ بھی ہیں۔منیزہ احتشام، سیمیں کرن، رابعہ الربا۔یہاں سیاسی شعور صاف نظر آتا ہے۔ہندوستان میں دیکھئے، تو اس کی کمی بہت حد تک نظر آتی ہے۔

☆ آپ کے ہاں قاری کو مرعوب کرنے کی کوشش بھی چیخ چیخ کر اپنی اہمیت جتلا رہی ہے؟

☆☆ یہ الزام ہے۔میں نے ایسی کوشش کبھی نہیں کی۔میں کبھی کبھی ایسی کہانیوں میں اچانک سامنے آکر قاری سے گفتگو کرتا ہوں۔اس انداز کو مغرب کے لکھنے والوں نے بھی اپنایا۔ممکن ہے قاری کو مرعوب کرنے والی بات یہیں سے پیدا ہوئی ہو۔ایک سوال ہے۔کیا قاری کو مرعوب کیا جا سکتا ہے۔قطعی نہیں۔وہ خاموشی سے آپ کو رد کر دیتا ہے اور آپ کو پتہ بھی نہیں چلتا۔

☆ منٹو آپ کو بلند نہیں لگتا، عصمت آپ کو نہیں بھائیں، بیدی اور کرشن کا جادو مان کر آپ نے ہماری سانس بحال کر دی؟

☆☆ میں یہ بات بتا چکا ہوں کہ دو ایک کہانیاں مجھے سب کی پسند آئیں۔لیکن متاثر کسی سے نہیں ہوا، منٹو، عصمت، بیدی، کرشن چندر، یہ ادب کے چار مضبوط ستون میں شامل ہیں۔پھر قرۃ العین حیدر، ممتاز مفتی، عزیز احمد، یہ لوگ کیا ہیں؟ وقت کے حساب سے سب کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔نیا لکھنے کے لئے بتوں کو توڑنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔اپنا راستہ بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ان کا مطالعہ نہ کیا ہوتا تو آج کا ذوقی پیدا نہیں ہوتا۔

☆ روسی ادب کے آپ مداح، وکٹر میو گو، کافکا، ورجینا ولف، البیر، لیس مائسر بل، ڈاکٹر ژُوکس اور پلاق کے بعد لے دے کے اردو ادب کی ایک ادیبہ عینی آپا کو تصنع کے الزام کے ساتھ قبول کیا؟

☆☆ یہ بات ۲۰۱۰ء کے پہلے کی ہے۔ان پانچ چھ برسوں میں، میرے خیالات بہت حد تک تبدیل ہوئے ہیں۔میں نے قرۃ العین حیدر پر ایک مضمون بھی لکھا اور بہت سی باتوں کی وضاحت کی۔وہ اردو فکشن کی آبرو ہیں۔مغربی ادب کو دیکھنے کے نظریے میں بھی تبدیلی آئی ہے۔یہ ہونا چاہئے۔ایک ہی وقت میں کئی بار ایسا ہوتا ہے، جب آپ خود کو غلط ثابت کرتے ہیں۔

☆ لوگ باگ یہ کیوں کہتے ہیں کہ آپ ڈنڈے کے زور پر خود کو بڑا ادیب منوانے پر بضد ہیں جو نہیں مانتا اُس سے ناراض ہو جاتے ہیں جیسے ساہتیہ اکادمی ایوارڈ نہ ملنے پر پروفیسر گوپی چند نارنگ سے ہو گئے؟

☆☆ سب سے پہلے یہ واضح کردوں کہ انعامات میری کمزوری نہیں۔دنیا

کا کوئی بھی اعزاز عمدہ تخلیق سے بڑا نہیں ہوسکتا۔ اور یہ بات سراسر غلط ہے کہ میں خود کو بڑا ادیب منوانے پر بضد ہوں۔ رہی بات نارنگ صاحب کو ناراض کرنے کی۔ یہاں کھل کر اپنا موقف سامنے رکھنا چاہوں گا۔ محترم نارنگ صاحب کی ادبی مخالفت ایک زمانے میں، میں نے بہت کی۔ میں نے فاروقی کی بھی مخالفت کی۔ مگر نارنگ صاحب میں جو ظرف ہے، وہ ان کا ہی حصہ ہے۔ مجھے یقین نہیں تھا اس مخالفت کے باوجود وہ مجھے پسند کر سکتے ہیں۔ لے سانس بھی آہستہ شائع ہوا تو انہوں نے دل کھول کر تعریف کی۔ میں نے کمزور لفظوں میں شکریہ ادا کیا تو انہوں نے کہا، آپ ڈیز رو کرتے ہیں۔

ابھی حال میں غالب پر ان کی نئی کتاب کا مطالعہ کیا۔ کیا غالب پر اس زاویے سے کبھی سوچا گیا؟ یہ ان کی محبت ہے کہ مجھے گلے لگایا۔ میں ان کی عظمت کا قائل ہوں۔ اب آپ کے سوال پر آتا ہوں... لوگ باگ یہ کہتے ہیں، ایک سال قبل کچھ اسی طرح کا سوال دلّی کے تصنیف حیدر نے مجھ سے کیا تھا۔ اس زمانے میں وہ ریختہ سے نکالے گئے تھے۔ اپنا بلاگ شروع کیا۔ اس بلاگ میں اردو ادیبوں سے سوالات پوچھے جاتے تھے۔ یہ سلسلہ اس وقت کافی مقبول ہوا۔ مجھ سے بھی سوالات پوچھے گئے۔ مجھ سے پوچھے جانے والے سوالات ایسے تھے، جیسے دل کی بھڑاس نکال رہے ہوں۔ میں جانتا تھا کہ ان کا تعلق اردو کے ایک مخصوص گروپ سے ہے۔ لیکن جب میں نے جواب دیا تو ناراض ہوگئے۔ بہر کیف، ان کو جو میں نے جواب دیا، وہ یہاں من وعن نقل رہا ہوں۔ اس میں آپ کو کئی اور سوالوں کیے جواب بھی مل جائیں گے۔ بھائی تصنیف— پہلا ہی سوال تم نے کچھ لوگوں کے حوالے سے کیا ہے— تم اپنی بات کرتے تو میرے لیے جواب دینا آسان ہوتا— کوئی تم سے آ کر کہے کہ کچھ لوگ تمہیں برا بھلا کہہ رہے ہیں، اس پر تمہارا ردّ عمل کیا ہوگا؟ مجھے یقین ہے کہ تم مسکراؤ گے اور کہو گے، ان کو کہنے دیجئے— لیکن یہاں ایک دشواری یہ پیدا ہو رہی ہے کہ سوال ادب سے متعلق ہے— یعنی یہ کچھ لوگ ادب کے ’خاندان‘ سے ہیں— یہ کچھ لوگ، ہمیشہ سے ’کچھ لوگ‘ ہی ہیں— انہیں عظیم سقراط کی طرح سامنے آ کر سچ بولنے اور زہر پینے کا حوصلہ کہاں ہوتا ہے— چلو، شرلاک ہومز کی طرح ان کچھ لوگوں کی تلاش میں نکلتے ہیں— کیونکہ اگر یہ کچھ لوگ واقعی ہیں، تو ان کا اتہ پتہ، ٹھکانا تو ہونا ہی چاہئے— بیان لکھنے کے ایک سال بعد بھوپال سے محترم اقبال مسعود صاحب کا فون آیا— ذوقی— ’کچھ لوگوں‘ نے تمہارے ناول کو بُرا بھلا کہا تھا اور مطالعہ کرنے سے منع کیا تھا— دیکھو تصنیف یہاں بھی کچھ لوگ موجود ہیں— لیکن اقبال صاحب منع کرنے کے باوجود تجسس کو روک نہیں سکے— ناول پڑھ کر ہی دم لیا— پھر ان ’کچھ لوگوں‘ سے الگ ان کی اپنی ایک رائے بن گئی— ایسی ہزاروں مثالیں ہیں تصنیف— مجھے آئے دن ایسے فون موصول ہوتے ہیں ’...... کچھ لوگ آپ کے بارے میں کہہ رہے تھے‘— سنو تصنیف...... اب آہستہ آہستہ مجھے ان کچھ لوگوں سے محبت ہوتی جا رہی ہے— تم جانتے ہونا— انکار، اقرار کی پہلی سیڑھی ہے— ایمان کی پہلی منزل بھی لا ہے— نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے— ابھی زیادہ دن نہیں گزرے— لے سانس بھی آہستہ کی اشاعت کے بعد پیارے زمرد مغل کے کئی میسج ایک ساتھ موبائل پر آئے— وہ ناول پڑھ کر حیران اور خوش تھے— ملنے بھی آئے— یہاں بھی معاملہ ’کچھ لوگوں‘ کا تھا— مجھے تو خوشی ہے کہ ان کچھ لوگوں کی وجہ سے میرا دائرہ محدود نہیں ہوا بلکہ وسیع ہوا ہے— بھائی تصنیف اب میری بات سنو: ایک بزرگ کے پاس یہی کچھ لوگ بیٹھے ہوئے تھے— بزرگ نے ایک کتاب پر غصہ ظاہر کرتے ہوئے کہا—

یہ کوئی کتاب ہے—

’کچھ لوگوں‘ نے ایک ہی زبان میں کہا— بجا فرمایا—

بزرگ پھر گویا ہوئے— اس کتاب میں کچھ نہیں—

’کچھ لوگوں‘ نے بھی اسی انداز میں کہا— بجا فرمایا— اس کتاب میں کچھ نہیں—

بزرگ نے کتاب کو ہوا میں اچھالتے ہوئے کہا— خیال رہے، آئندہ اس شخص کی کتابیں میرے سامنے نہ آئیں—

’کچھ لوگوں‘ نے بزرگ کی بات دہرائی— اب اس شخص کی کتابیں آپ کے سامنے نہیں آئیں گی—

ڈرتے ڈرتے ان کچھ لوگوں میں سے ایک نے بزرگ سے دریافت کیا—

کیا آپ نے اس کتاب کا مطالعہ بھی کیا ہے؟

بزرگ غصے میں بولے— کیا اس کتاب کو پڑھنے کی ضرورت ہے؟

میرے بھائی تصنیف— کچھ لوگوں پر مت جاؤ— کچھ لوگ کان کے کچے پکے ہوتے ہیں— اب تم ماشاء اللہ اس عمر میں آ گئے ہو جہاں تمہیں ان کچھ لوگوں سے فاصلہ بنانے کی ضرورت ہے— ایک بات یاد رکھو— یہ دنیا کچھ لوگوں تک محدود نہیں ہے— اردو کی ایک بڑی دنیا نے لے سانس بھی آہستہ کو پسند کیا ہے اور اعتراف بھی کیا ہے— پھر یہ کچھ لوگ جو بغیر مطالعہ کے، برسوں سے میرے خلاف رہے، میں انہیں کیوں تسلیم کروں—؟ اور اس بڑی آبادی کو کیوں نہ تسلیم کروں جو نہ صرف مطالعہ کا حق ادا کرتی ہے بلکہ سچ بولنا بھی جانتی ہے— کچھ لوگوں کی جگہ اگر تم نے اپنی بات کی ہوتی، دلیل دی ہوتی تو اس پہلے سوال پر مکالمہ قائم کیا جا سکتا تھا— اب سنو تصنیف میاں— ۱۶ سے ۲۰ سال کی عمر تک میں داستان سے مغربی ادب تک بڑے بڑے ناولوں کو کھنگال چکا تھا— پہلے ناول ’عقاب کی آنکھیں‘ میں بھی، فن پر میری گرفت تم کو نظر آ جائے گی— یہ ناول میں نے محض ۱۷ سال کی عمر میں لکھا تھا— اس عمر میں بھی میرا اسرار از ور ناول کی باریکیوں پر تھا— اب تم ایک نئی بات اور بھی کہتے ہو...... ’کہ آپ جس تیزی سے ناول لکھتے ہیں...... بھئی کمال ہے...... میں نے اب تک صرف ۱۱ ناول لکھے— ۵۲ سال کی عمر ہے— ارے بھائی— ادب کی دنیا میں ہوں— تم ہر روز فیس بک پر ایک تحریر دیتے ہو— میں ناول کے لیے وقت نکالتا ہوں—

محترم فاروقی صاحب تنقید کے میدان میں ہیں تو وہ بھی اسی تیزی سے لکھتے ہیں۔۔۔ان کی کتابیں دیکھ لواور میری کتابیں۔۔۔

۱۹۹۰ سے ۲۰۱۴ تک بیان، پوکے مان کی دنیا، پروفیسر ایس کی عجیب داستان، لے سانس بھی آہستہ، آتش رفتہ کا سراغ شائع ہوئیں۔۔۔یعنی ۲۵ برس کا عرصہ اور پانچ ناول۔۔۔اب ایک نیا ناول نالۂ شب گیر۔۔۔' ۲۵ سال کے عرصہ میں تجارت نہیں کی۔ مجلسوں میں نہیں گیا۔۔۔مطالعہ کیا اور لکھنے پر زور رہا تو یہ پانچ کتابیں بہت زیادہ کیسے ہوگئیں۔۔۔؟اور آپ مجھ سے پوچھ رہے ہیں کہ کیا میں ان' کچھ لوگوں' کے بیان سے متفق ہوں۔۔۔یہ بات آپ خود سے بھی دریافت کر سکتے ہیں کہ کیا ۲۵ برس میں اگر کوئی ادیب پانچ ناول لکھتا ہے تو کیا اسے زود نویس کہا جا سکتا ہے۔۔۔؟ایک بات اور سن لیجئے۔۔۔پچھلے ۱۰ برسوں میں، میں نے کوئی کہانی نہیں لکھی۔۔۔ٹیشو پیپر میری آخری کہانی تھی، جو میں نے ۲۰۰۴ میں لکھی تھی۔۔۔اس درمیان کہانی کی شکل میں جو تحریریں شائع ہوئیں، وہ دراصل ناول کا حصہ تھے۔۔۔اور ان کی تعداد کچھ اتنی زیادہ نہیں کہ مجھے بسیار نویس کہا جا سکے۔۔۔ پھر تو ہندوستان کے دیگر زبانوں میں لکھنے والے اور مغرب کے بہت سارے ناول نگاروں کو آپ ریجکٹ کر دیں گے۔۔۔

☆ افسانہ لوتھرا میں ایسی کیا خاص بات تھی کہ اُس پر تنقید کے باعث آپ اتنے برافروختہ ہوئے کہ کیا قاری، کیا ادیب، کیا نقاد سب کو رگید ڈالا؟

☆☆ لوتھڑہ۔ یہ کہانی بیس، بائیس سال کی عمر میں لکھی تھی۔اس عمر کا جوش مختلف ہوتا ہے۔اب یہی دیکھئے۔افسانوں کے سات ضخیم مجموعوں میں، یہ کہانی کہیں شامل نہیں ہے۔اس کہانی میں مغرب کے اثرات تھے۔اور میرا خیال تھا میں نے کوئی بڑا قلعہ فتح کر لیا ہے۔اس عمر میں ایسا ہوتا ہے۔

☆ جو لوگ آپ کو بسیار اور طویل بیانیے کا ادیب گردانتے ہیں اُن کی تشفی کے لیے آپ کے پاس یقیناً مناسب الفاظ ہونا چاہیے؟

☆☆ میرے بھائی۔ میں لوگوں کی تشفی کے لئے ادب کے میدان میں نہیں آیا۔کیا آپ تارڑ صاحب کو بسیار نویس کہیں گے؟اور کہیں گے تو کیوں کہیں گے۔ان کے پاس تخلیقی ذہن ہے۔وہ لکھتے ہیں۔اسی طرح میں بھی لکھتا ہوں۔میں نے پچھلے دس برس میں ایک کہانی نہیں لکھی۔پھر بھی بسیار نویس؟دس برس میں تین ناولوں کا آنا گناہ ہے؟کسی ایک برس بہت زیادہ ہوئیں تو تین کہانیاں۔اب آپ دیکھئے، مجھ پر کیسے کیسے الزامات لگائے گئے۔لوگوں نے دوستوفسکی، بالزاک، ٹیگور سے نہیں پوچھا کہ بھائی آپ بسیار نویس کیوں ہیں؟ طویل بیانیہ؟ پھر مارخیز کا ادب کیا ہے۔مارخیز کی تحریروں کے بارے میں یہ بھی کہا گیا کہ بائبل کے بعد دوسری بڑی تحریر مارخیز کی ہے۔میں نے تو ان سب سے بہت کم لکھا ہے۔ جو شخص تیرہ سال کی عمر سے افسانہ لکھ رہا ہو کیا اس کے پاس سات افسانوی مجموعے بھی نہیں ہونا چاہئے۔؟

☆ آپ کے اپنی تخلیق کے انجام سے مطمئن نہ ہونے کی سزا قاری کو کیوں بھگتنا پڑتی ہے؟

☆☆ میں کہانیوں کے باضابطہ نوٹس لیتا ہوں۔ ہر کہانی اپنے انجام کے ساتھ میری مکمل گرفت میں ہوتی ہے۔

☆ بلند قامت اہل قلم سیاسی چاشنی سے مملو ادب کو غیر ادبی گردانتے ہیں جبکہ آپ کے ہاں یہ لازم وملزوم تصور کیا جاتا ہے؟

☆☆ واہ۔ سیاست چاشنی ہوگئی۔ سماج چاشنی نہیں ہے۔اس لئے کہ سماج ادب کا آئینہ ہے۔کیا کسی سماج کو آپ سیاست سے الگ تصور کرتے ہیں؟ یہ نہ کل ممکن تھا اور نہ آج ممکن ہے۔اور ایسے لوگوں کو آپ بلند قامت کہہ رہے ہیں۔ ایسے لوگوں کو تو پستہ قد بھی نہیں کہا جا سکتا۔اور سیاست چاشنی نہیں ہے صاحب، عذاب ہے۔ایک خوفناک عمل ہے۔اور اس لئے دنیا کے تمام بڑے ناول پڑھ جائیے آپ کو سیاست کا غلبہ صاف نظر آئے گا۔سروانٹس کے ناول ڈان کیخوٹ کو لیجئے، سارتر، مارخیز، ملان کنڈیرا، نجیب محفوظ، اورہان پامک، سلمان رشدی، جس کو چاہیے، پڑھ جائیے۔ایک بات سن لیجئے۔ ہمارے فکشن کے نقاد نابالغ ہیں۔ یہ پڑھتے ہی نہیں۔اور ظاہر ہے جب پڑھتے نہیں تو ان کا کام سوچنا بھی نہیں ہے۔اور آپ کی بات پر حیران ہوں کہ ہمارے بلند قامت، سیاست کو ادب کا حصہ نہیں مانتے۔

☆ انگریزی ادب سے اکتساب، کٹنگ، پیسٹنگ اور ڈبنگ کا ہنر کہاں سے ہاتھ لگا؟

☆☆ میں یہ کام نہیں کرتا۔ یہ کام نقاد کرتے ہیں۔میں نے فکشن پر مضامین لکھے تو مغرب سے کسی کا حوالہ نہیں دیا۔صرف اپنے مطالعہ کا سہارا لیا۔ جو نام یاد آئے، ان کو حوالہ بنایا۔یہ الزام تو مخصوص گروپ کے برصغیر کے نمائندہ افسانہ نگاروں پر آنا چاہئے جو مغرب سے استفادہ کبھی کبھی سرقہ بھی کرتے ہیں۔

☆ ایک مہربان نے آپ کو عظیم قلم کار کہہ کر پکارا تو ہم نے اختلاف کرتے ہوئے کہا'' الحمدللہ ہمارے درمیان ابھی اتنے قد آور ادیب، شاعر، نقاد اور دانشور موجود ہیں جن کے قدموں میں بیٹھنا ہمارے اور ذوقی صاحب کے لیے باعث فخر ہے لفظ عظیم اُن کے ساتھ بھی نہیں لگایا جا سکتا جبکہ ارتضٰی کریم نے آپ کو اکیسویں صدی کا کرشن چندر ٹھہرا کر آپ کے ناول'' نیلام گھر'' سے مایوسی کا اظہار بھی ضروری جانا، کریم صاحب کی کس بات پر اعتبار کیا جائے؟

☆☆ میرے بھائی۔آپ اچھا لکھتے ہیں اور کوئی آپ کو عظیم قلم کار کہہ کر پکارتا ہے، تو مجھے خوشی ہوگی۔عظیم کا مطلب کیا ہوتا ہے؟ جس کی عظمت کا اقرار کیا جائے۔ایسے کئی دانشور ابھی بھی ہیں جن کی عظمت کا اعتراف کرتا ہوں مگر قدموں میں بیٹھنا نہ بیس برس کی عمر میں گوارہ تھا اور اب تو سوال ہی نہیں۔۔۔وہ اپنی جگہ، میں اپنی کٹیا میں اپنی جگہ۔اب رہی بات ارتضٰی کریم کی تو یہ مضمون ارتضٰی نے اس وقت لکھا جب آتش جواں تھا۔میں نے کمپوزر کو ڈیسک ٹاپ سے کچھ مضامین آپ کو بھیجنے کے لئے کہا تھا، یہ مضمون غلطی سے آپ کے پاس چلا گیا۔اس میں

کوئی ایسی بات نہیں کہ آپ اسے شائع کریں۔اور ارتضیٰ نے مجھے کرشن چندر کیوں کہا، یہ بھی سن لیجئے۔ یہ بسیار نویسی کا ہی الزام ہے۔، جو شروع سے مجھ پر لگتا رہا۔ لیکن ارتضیٰ اور ہمارے دیگر نقاد کرشن چندر کی عظمت کا اعتراف آج بھی نہیں کر پائے۔ کرشن چندر کی کئی کہانیاں اور ناول ایسے ہیں جنہیں واقعی شاہکار کہا جاسکتا ہے۔

☆ آپ کے ہاں دعویٰ بڑے بڑے ہوتے ہیں۔ دونوں بھائی آپ کے دولت کدے سے اُتر کر دلّی کی گلیوں میں اردو پڑھنے لکھنے والا نوجوان تلاش کریں تو مشکل سے ایک فیصد کا تناسب نکلے گا پھر بھی آپ نئی نسل کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں وہ بھی اردو ادب کے بل پر؟

☆☆ بھائی، میری چھوٹی سی کٹیا ہے۔ بلکہ فلیٹ نما گھر کو آپ قید خانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ دولت خانہ ہرگز نہیں ہوسکتا۔ نئی نسل سامنے نہیں آئے گی تو ہمیں کون یاد کرے گا؟ عبداللہ حسین، قرۃ العین، تارڑ صاحب کو کون پڑھے گا۔ اردو ایک زندہ زبان ہے۔ جب آزادی کے ۷۰ برسوں میں، روزی روٹی سے رشتہ منقطع ہونے کے بعد بھی زندہ رہی، تو جان لیجئے، اردو مر نہیں سکتی۔ اردو ہندوستان کی تہذیبی شناخت ہے۔ ہم اسے ختم نہیں ہونے دیں گے۔ اس لئے نئی نسل کا سامنے آنا بہت ضروری ہے۔

☆ آپ اردو جیسی پِٹی اور بَٹی زبان کے ذریعے نوجوانوں کی تقدیر بدلنا چاہتے ہیں اب تو ہندی کو بھی اپنے بچاؤ کے لالے پڑے ہیں ایسے میں اگر اردو زبان رومن رسم الخط پر چلی گئی تو انجام کیا ہوگا؟

☆☆ ہندی کا مستقبل روشن ہے۔ زبان کے ایک عالمی سروے میں ہندی کو زندہ زبانوں میں ساتویں نمبر پر رکھا گیا ہے۔ یعنی ہندی بولنے والوں میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ اردو نہ دیوناگری میں لکھی جائے گی نہ رومن میں۔ اس سے اردو کا تشخص خطرے میں پڑ جائے گا۔ مجھے یقین ہے۔ یہ نوبت نہیں آئے گی۔

☆ کہنے والے اکثر یہ بھی کہتے سنے گئے ہیں کہ آپ کی خوش قسمتی یا خوش گمانی کے سبب ناقدین آپ سے ناخوش ہیں؟

☆☆ میں ناقدین کے لئے نہیں لکھتا۔ اس لئے ان کے کہے سے نہ خوش ہوتا ہوں، نہ بدگمان۔ میں ناقدین کے پاس اپنی کتابیں بھی نہیں بھیجتا۔ جو دوست ہیں، ان کے مطالعے کے لئے بھیجتا ہوں، ناقد سمجھ کر نہیں بھیجتا۔ میں کسی سے کبھی نہیں کہتا کہ مجھ پر لکھو۔ کیا ضرورت ہے۔ ایک وقت آئے گا جب لکھا جائے گا۔ ابھی بھی لکھا جارہا ہے۔ نہ تنقید و تنقیص سے بدگمان ہوتا ہوں نہ تعریف و توصیف سے خوش۔ میرا کام ذمہ داری کو محسوس کرتے ہوئے لکھنا ہے۔ اس سے زیادہ نہیں۔

☆ جب بھارت کی آبادی ۱۰۰ کروڑ تھی تو آپ کے خیال میں مسلمان بیس کروڑ تھے ایک سو تیس کروڑ کے بھارت میں یہ تعداد کیا ہونی چاہیے اور اُن کی شرح نمو سے کیا آپ مطمئن ہیں؟

☆☆ ہندوستان میں مسلمانوں کی آبادی ۲۵ کروڑ تصور کی گئی ہے۔ حکومت کے سروے کے مطابق ۱۸ کروڑ۔ سچر کمیٹی اور رنگناتھ مشرا کمیشن کی رپورٹ کے مطابق مسلمانوں کی حالت دلتوں سے بھی بدتر ہے۔ یہ سروے کانگریس نے کرایا تھا۔ لیکن کانگریس نے مسلمانوں کے مستقبل کو بہتر بنانے کے لئے کوئی لائحہ عمل اختیار نہیں کیا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کو سب سے زیادہ نقصان کانگریس نے پہنچایا۔ اس کی ایک مثال دیکھ لیجئے۔ انگریزوں نے ریزرویشن کے لئے جو قانون بنایا تھا اس میں ہندوستان کے تمام مذاہب کو شامل کیا تھا۔ جواہر لعل نہرو نے ۱۰ اگست ۱۹۵۰ء ترمیم کر کے سبھی مذاہب کی جگہ ہندوؤں کو دیئے جانے والے ریزرویشن کا انتظام کیا اور اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند راجندر پرساد کی مہر لگا کر قانون پاس کرالیا۔ جب ہنگامے ہوئے تو بودھ مذہب کے ماننے والوں اور سکھوں کو ریزرویشن میں درجہ دے دیا گیا لیکن کانگریس نے مسلمانوں کے لئے دروازے بند رکھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مالی اور اقتصادی طور پر مسلمان کمزور سے کمزور ہوتے چلے گئے۔ مسلمانوں سے اس ملک میں کئی غلطیاں ہوئیں۔ ایک تو مسلم لیڈر شپ کی کمی تھی۔ دوسری اہم بات یہ کہ مسلمانوں نے ہمیشہ غیر مشروط رویہ اپنایا۔ کانگریس انہیں بی جے پی اور جن سنگھ کا خوف دکھاتی رہی۔ جبکہ مسلمانوں کو اپنی شرطوں کے ساتھ ووٹ میں حصہ داری کرنی چاہئے تھی۔ جیسا کہ یادو، دلت اور دیگر ذات کے لوگ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو یہ سمجھنا ہوگا کہ کوئی بھی حکومت ان کی نہیں ہے۔ اور ہندوستان میں کسی مسلم پارٹی کے لئے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن ایک سچ اور بھی ہے۔ اس ملک میں فیصلہ مسلمانوں کے ووٹ سے ہوتا ہے۔ مسلمان اپنی طاقت پہچان لیں تو فرقہ پرستوں کے حوصلے کمزور ہو جائیں گے۔

☆ دوسری قوموں، ملکوں اور مذاہب کا ماتم کرنے کے بجائے اپنے گریبان میں جھانکا جائے تو طرح طرح کے ببول مذہب کے نام پر انسان اور انسانیت کو جس بُری طرح پائمال کر رہے ہیں اُس سے ہمارا مستقبل کے خدوخال کی بابت آپ کی دوٹوک رائے؟

☆☆ ہمارا یعنی مسلمانوں کا مستقبل۔؟ جب بھی مسلمانوں کی بات کی جائے گی، عالمی سیاست کے اُفق روشن ہوں گے۔ اس وقت ایک پوری دنیا میری نگاہوں کے سامنے ہے اور شاید کوئی بھی جگہ ایسی نہیں جہاں مسلمانوں کو نشانہ نہ بنایا جارہا ہو۔ میانمار کو لیجئے۔ یہ بودھ مذہب کے ماننے والے ہیں جو امن و شانتی میں یقین رکھتے ہیں۔ روہنگیا کے مسلمانوں کو بے دردی اور ظالمانہ طریقے سے قتل کیا جارہا ہے اور ان کی قابل انعام یافتہ لیڈر خاموش ہے بلکہ یہ کہنا بہتر ہوگا کہ مسلمانوں کی مخالفت میں کھڑی ہے۔ امریکہ، فرانس، روس، برطانیہ، کیا کوئی مسلمانوں کے ساتھ ہے۔؟ ٹونی بلیئر کے ساتھ مل کر بش نے عراق میں تباہی مچادی۔ صدام کو قتل کر دیا۔ اور آج یہ کہا جارہا ہے کہ صدام بے

قصور تھے۔ لیبیا کے کرنل قذافی کو مار گرایا۔ فلسطین، چیچنیا، جہاں دیکھئے افراتفری کا ماحول ہے۔ اسامہ کو کس نے پیدا کیا، یہ حقیقت سب جانتے ہیں۔ پچھلے سولہ برسوں میں ایک دنیا مسلمانوں کے خلاف متحد ہوگئی ہے۔ چین کا وہی حال ہے۔ ہندوستان نے اسرائیل کے ساتھ دوستی کے معاہدہ کے بعد اپنا موقف ظاہر کر دیا ہے۔ دہشت گردی ہے، جسے عالمی سیاست نے اسلامی دہشت گردی کا نام دیا ہے۔ آئی ایس آئی ایس اور داعش کے لوگ مسلمان نہیں ہیں، بلکہ دہشت گردی میں ملوث افراد کا تعلق کسی بھی مذہب سے نہیں ہوسکتا مگر اس خیال کے باوجود عالمی نشانے پر کون ہے؟ مسلمان ہیں۔ کیا مسلم ممالک اگر متحد ہوتے تو عالمی سطح پر مسلمانوں کا یہ حال ہوسکتا تھا۔ اور اب بھی، اس ماحول میں بھی، کسی بھی طرح کے اتحاد کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ آپ نے پوچھا ہے، اپنے گریبان میں جھانکیں۔ اب گریبان کہاں بچا ہے۔ چاک چاک ہو چکا ہے۔ ہم اب بھی اپنی اسلامی شناخت کے لئے لڑ رہے ہیں۔ کب تک لڑیں گے۔ مشکل یہ کہ ہمارا اسلامی نام بھی دہشت گردی کی علامت بن چکا ہے۔ کیا صورتحال بہتر ہوگی؟ کوئی امید نظر نہیں آتی۔ امریکہ میں ٹرمپ نے پہلے ہی مسلم مخالفت کا اعلان کر دیا تھا۔ اس کی چونکا دینے والی فتح کے پیچھے اسلامی دہشت گردی کا خاتمہ بھی ہے۔ اسلام جیسے امن پسند مذہب کو سازش کے ساتھ (اس میں اپنوں کی مکاری بھی شامل ہے) دہشت گردوں کا مذہب قرار دے دیا گیا۔ اس میں شک نہیں کہ چوتھی جنگ عظیم کی شروعات ہو چکی ہے۔ اس شروعات کی ایک اہم کڑی عربوں کے پٹرول کو ہتھیانا بھی ہے۔ لیکن اس کی سب سے اہم کڑی اسلام کا خاتمہ ہے۔ میرے بھائی، جنگوں کے اس خوفناک ماحول میں آپ انسانیت کیوں تلاش کر رہے ہیں۔ صرف مسلمانوں پر ذمہ داری عائد کرنے سے کام نہیں چلے گا۔ عالمی سیاست پر مسلمان تقسیم تھے اور عالمی سیاست نے اس کا فائدہ اٹھایا۔ اور اب بہت دیر ہو چکی ہے۔

☆ بیرونی دنیا کے مسلمان ہندی حکمرانوں بلخصوص مغلوں کو اگر ہند کے قدیم باشندے ڈاکو یا لٹیرے کہہ کر مخاطب کرتے ہیں تو کچھ غلط بھی نہیں؟

☆☆ اس بات سے اتفاق نہیں ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ملک کسی ایک کا نہیں ہوتا۔ طاقتور حکمرانوں کا ہوتا ہے۔ ہندوستان میں آریہ آئے۔ دراوڑ قوم کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ جنگیں شروع ہوئیں۔ اور آریہ ورت آٹھ حصوں میں بٹ گیا۔ ہندوستان سونے کی چڑیا کہلاتا تھا۔ جس کو موقع ملا، ہندوستان لوٹنے چلا آیا۔ مگر قابل غور نکتہ یہ ہے۔ مغل حکمراں لوٹنے نہیں آئے تھے۔ اگر لوٹنے آئے ہوتے تو لوٹ کر واپس چلے جاتے۔ بابر نے تزک بابری میں لکھا ہے۔ جب وہ ہندوستان پہنچا تو اپنے سپاہیوں سے کہا۔ یہاں ہندو قوم رہتی ہے۔ معصوم لوگ ہیں۔ ان کو اپنا بنالو۔ ان میں گھل مل جاؤ۔ مغل حکمرانوں نے جزیہ ضرور لگایا مگر ہندوؤں کی نفسیات کو سمجھا۔ انگریزوں کی طرح ہندو مسلمانوں کو تقسیم نہیں کیا۔ تاریخ کے حوالہ سے یہ بحث کافی لمبی ہوجائے گی۔ انگریز مٹھی بھر تھے مگر طاقتور تھے۔ جب گئے تو ہندوستان کو تقسیم کر گئے۔ لیکن مغلوں کے ہم پر احسانات بھی رہے ہیں۔ انہوں نے حکومت کا طریقہ سکھایا۔ دارا شکوہ کا کردار بھی ایک مثبت کردار تھا۔ اورنگ زیب ایک سخت اور کٹر مسلمان تھا۔ تاریخ کی کتابوں سے یہ اشارے بھی ملتے ہیں کہ اورنگ زیب ہندو کش، ظالم اور ستم گر نہیں تھا، جیسا اسے بنا دیا گیا۔ مگر یہ حقیقت ہے کہ اورنگ زیب کے بعد حکومت کمزور ہوگئی۔ اور یہاں فرنگیوں کی حکومت ہوگئی۔ یہ غلط فہمی ہے کہ ہندوستان کے باشندے مغلوں کو ڈاکو یا لٹیرے کہتے ہیں۔ یہ فضا دو تین برسوں میں پیدا ہوئی ہے۔ ظاہر ہے ایک مخصوص سیاسی جماعت کی حکومت ہے۔ لیکن یہ یقین ہے کہ یہ سیاہ بادل ہندوستان پر بہت دنوں تک حکومت نہیں کریں گے۔

☆ ڈاکو اور لٹیروں کی اولادوں کا ہندوستان میں بڑھتے اور پھیلتے ہندتوا کے درمیان مستقبل کیا ہے؟

☆☆ آزادی کے ۷۰ برسوں میں ہندوتو، ہندوستانی سیاست کا ایجنڈا کبھی نہیں رہا۔ ۲۰۱۴ میں ان کی حکومت آئی۔ اس سے قبل باجپائی حکومت نے ۵ سال بھی پورے نہیں کئے۔ آپ غور کریں تو کانگریس کی ناکامیوں سے بی جے پی کا عروج ہوا۔ ہندوستان کی مین اسٹریم میں اب یہ دو ہی پارٹیاں ہیں۔ باقی ریاستی سطح پر الگ الگ پارٹیاں ہیں۔ ۷۰ برس کے ہندوستان میں جمہوریت صرف نعرہ نہیں تھا، بلکہ جمہوریت ہندوستان کی اصل طاقت کے طور پر سامنے تھا۔ مسلمانوں نے اس درمیان کبھی بھی خود کو لاچار اور بے بس محسوس نہیں کیا۔ آزادی کے بعد کا سب سے اہم پڑاؤ بابری مسجد کی شہادت ہے۔ یہ حادثہ ۱۹۹۲ء میں ہوا۔ اور بی جے پی جو محض دو کی تعداد میں تھی، بابری مسجد کی شہادت کے بعد اس کی طاقت میں غیر معمولی اضافہ ہوا۔ لیکن آپ یہ بھی دیکھئے کہ چھ دسمبر بابری مسجد شہید ہوئی اور ۷ دسمبر ۹۲ کو ہندوستان کی ہر زبان کے اخبار نے اس کی مذمت میں پہلا صفحہ سیاہ رکھا۔ ہندوستان ماتم میں ڈوبا تھا۔ کسی نے بھی بی جے پی کے اقدام کی تعریف نہیں کی۔ اس کے بعد بھی سترہ برسوں تک مسلسل بی جے پی فرقہ وارانہ فسادات کے ذریعہ حکومت میں آنے کا راستہ بناتی رہی۔ لیکن ہندوستانی گنگا جمنی تہذیب نے یہ موقع نہیں دیا۔ ۱۷ برسوں بعد بی جے پی کی پہلی حکومت بنی۔ لیکن محض چار برس بعد ہندوستانی عوام نے اس حکومت کو ریجکٹ کر دیا جبکہ اٹل بہاری باجپائی ایک ہوشیار اور منجھے ہوئے سیاستداں تھے۔ اس درمیان کانگریس اپنے منشور کو بھول کر کرپشن کا شکار ہوگئی اور ہندوتو کے راستے بی جے پی نے اقتدار سنبھال لیا۔ آر ایس ایس اس کے لئے ۱۹۲۵ سے کوششیں کر رہی تھی لیکن اب تک ناکام تھی۔ اس لئے یہ یقین رکھئے کہ ہندوستان کے عوام اگلے انتخاب تک موجودہ زعفرانی نظام سے باہر آجائیں گے۔ ہندوستان کی جمہوریت یہ بھی ہے کہ مسلمان اگر کسی پر اعتبار کرتا ہے، تو وہ ہندو ہے۔ ہندو مسلمان پر اعتبار کرتے ہیں۔ اس رشتہ کو کوئی سازش، کوئی منصوبہ، کوئی سیاست ختم نہیں کر سکتی۔ مسلمانوں کو ہندوتو سے زیادہ بڑا خطرہ کانگریس سے ہے۔ اس لئے

ہندوستان میں مخلوط حکومت کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو سیاسی، سماجی، اقتصادی سطح پر مضبوط ہونا ہوگا۔

☆ ہندوستان کے علاقائی ادیب اور اردو زبان کے اہل قلم کے مراسم کی نوعیت کیا ہے اور دوسری زبان کے اہل قلم اردو زبان کے معیار کی نسبت کیا رائے رکھتے ہیں؟ زیادہ دلچسپی ہمیں ہندوستان کے علاقائی ادب کی نسبت آپ کی رائے سے ہے؟

☆☆ ہندوستان کے علاقائی ادیب ایک دوسرے سے ملتے رہتے ہیں۔ بنگلہ، ملیالم، کنڑ، تیلگو میں بہت عمدہ لکھا جارہا ہے۔ لیکن اردو زبان کہیں پیچھے نہیں ہے۔ اردو میں جسقدر تجربے ہوئے، شاید کسی اور زبان میں نہیں ہوئے۔ یہاں لکھنے والوں کی تعداد کم ہے۔ پھر بھی بہت سے لوگ ہیں جو دیگر زبانوں کے مقابلے عمدہ لکھ رہے ہیں۔ میں دیگر علاقائی زبانوں کی کہانیاں پڑھتا رہتا ہوں۔ مراٹھی میں علامتوں کی سطح پر کئی خوبصورت تجربے ہوئے۔ دیگر زبانوں میں بیانیہ اور کہانی پن پر زور ہے۔ اردو میں اب بھی جدیدیت کا اثر صاف نظر آتا ہے۔ علاقائی زبانوں کے مقابلے اردو ادب مجھے کہیں کمزور نہیں آتا۔

☆ کرنسی کے موجودہ بحران کو آپ یوپی پنجاب اور غالباً کرناٹک کے الیکشن جیتنے کا حربہ گردانتے ہیں یا حقیقی تبدیلی سے تعبیر کرتے ہیں؟

☆☆ کرنسی کے موجودہ بحران یا سیاست میں حکومت گھرتی جارہی ہے۔ اب حکومت کیش لیس تہذیب کا نعرہ دے رہی ہے۔ ۷۰ فیصدی عوام کا رشتہ بینک سے ہے ہی نہیں۔ جب کیش ہی نہیں تو یہ کیش لیس تہذیب کیسے کامیاب ہوگی۔ ابھی یوپی پنجاب کے علاوہ بھی کئی ریاستوں میں انتخابات ہونے ہیں۔ لیکن یہ انتخابات کا کھیل نہیں۔ یہ کچھ اور ہے جس کی وضاحت آہستہ آہستہ ہوگی۔

☆ آپ کی مقبولیت کے پیش نظر اگر کوئی سیاسی جماعت آپ کو الیکشن کا ٹکٹ پیش کرتی ہے تو آپ قبول کرلیں گے؟

☆☆ اگر عام آدمی پارٹی، کانگریس، بی ایس پی ایسا سوچتی ہے تو ضرور قبول کروں گا۔ میں سیاست میں آنا چاہتا ہوں۔

☆ آپ کا ذاتی پروڈکشن ہاؤس کس قسم کے پروگرام بناتا ہے نیز آپ کے کتنے ڈرامے سیلولائیڈ پر منتقل ہوئے اور کامیابی کا تناسب کیا ہے؟

☆☆ میں نے ۱۰۰ سے زاید ڈاکیومنٹری فلم بنائی۔ ہم دلی والوں کی اپنی انڈسٹری ہے۔ ہم محدود وسائل میں کام کرتے ہیں۔ میری کئی کہانیوں کے مجموعوں مثلاً صدی کو الوداع کہتے ہوئے، لینڈ اسکیپ کے گھوڑے پر سیریل بن چکا ہے۔ ناول مسلمان پر بھی سیریل بہت مقبول ہوا تھا۔ بلونت سنگھ کے ناول رات چور اور چاند پر بھی سیریل بنایا۔ سو سے زیادہ اسکرپٹ لکھ چکا ہوں۔ ہاں، بالی وڈ میں کبھی جانے کا خیال نہیں آیا۔

☆ ہندوستان سے باہر آپ کو کہاں کہاں سے اچھا فیڈ بیک ملا اور مستقبل کے حوالے سے آپ کے منصوبے اور ارادے کیا ہیں؟

☆☆ سیریل ہو یا ادب، میں فیڈ بیک کی پرواہ نہیں کرتا۔ میری کہانیوں کے کئی ترجمے دیگر زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ مستقبل میں کئی منصوبے ہیں۔ جن پر کام کرنا شروع کیا ہے۔ تین ناولوں پر ایک ساتھ کام کر رہا ہوں۔ داراشکوہ بھی ایک پراجیکٹ ہے، جس پر جلد کام کرنے کا ارادہ ہے۔

- بقیہ -

## گلیشیئر ٹوٹ رہے تھے

باپ نے دوبارہ کہا۔ طوفان کے تھمنے کے آثار نہیں ہیں۔

'ہاں۔'

'کافی تباہی ہوئی ہے۔ آگے بھی ہوگی۔'

باپ پریشانی کے عالم میں کمرے میں ٹہلنا شروع کردیتے تھے۔ اس وقت بھی وہ ٹہل رہے تھے.... وہ اچانک میری طرف مڑے۔

'کیا جادوگر کی کوئی خبر ملی۔؟'

'نہیں۔'

'مجھے بھی نہیں ملی۔' انہوں نے ٹہلنا جاری رکھا۔ پھر میری طرف دیکھا۔ 'ہاں تمہیں بتانا بھول گیا۔ تمہاری تلاش میں دو پولیس والے آئے تھے۔'

'پولیس والے...'

'ہاں۔' وہ تمہارے پاؤں کے بارے میں پوچھ رہے تھے...' میں اپنی جگہ پر تیزی سے اچھلا۔ مگر کیوں....

'تفتیش چل رہی ہے۔ کچھ باغی اور بھی ہیں جو نیند میں جادوگر کو قتل کرنا چاہتے تھے۔ رات ہی رات ایسے باغیوں کے پیر چھوٹے بڑے ہوگئے۔' وہ ہنس رہے تھے۔ کیا یہ ممکن ہے؟'

ٹھیک اسی وقت پڑوس کے گھر سے تیز آواز آئی۔ وہاں ٹین کی چھت تیز ہوا میں اڑ گئی تھی....

'طوفان تیز ہے۔'

ہاں۔ مجھے احساس ہوا۔ باپ ٹہلتے ہوئے رک گئے ہیں۔ ان کی آنکھیں غور سے میرے ننگے پاؤں کا جائزہ لے رہی ہیں۔ وہ کچھ بولے نہیں، مگر ایسا احساس ہوا، جیسے وہ پوچھنا چاہتے تھے کہ میرا جوتا کہاں ہے؟ وہ شک سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔

اسی درمیان دروازے پر دوبارہ دستک ہوئی۔

باپ کی آواز میں تلخی آ گئی تھی۔ 'لگتا ہے وہ پھر سے آ گئے ہیں۔'

# کھوئے ہوؤں کی جستجو

مشرف عالم ذوقی

## کہانی کا پہلا چہرہ

''تمہارے ہاتھوں پر
ناچتی رہی ہے
ناچتی رہی ہے
یہ دنیا''
—ناظم حکمت

پہلی بار یہ دنیا میرے ہاتھوں پر کب ناچی تھی، یاد نہیں—
پہلی بار یہ دنیا میرے اشاروں پر کب جھومی تھی، یاد نہیں—
پہلی بار یہ دنیا میرے اندر کب مسکرائی تھی، یاد نہیں—

کیوں یاد نہیں۔ میں تو وقت سے ٹوٹے ایک ذرا سے لمحے کا بھی حساب رکھا کرتا تھا۔ میں گھر کے ایک ویران سے گوشے میں تنہائیوں کو خط لکھنے والا، میں پر اسرار، خوبصورت رات کی آنکھوں سے نیندیں چرانے والا، میں خاموشی اور سناٹے سے نکلے نغموں کا شیدائی، میں پت جھڑ کے دکھ سمجھنے والا، اور میں موسم بہار اور اس کی راگنی کے الاپ پر مست مست ہو جانے والا...... میں، تصورات کی وادیوں سے کواب چرانے، مجھے حال سے کم اور ماضی سے زیادہ پیار رہا— مجھے عالیشان کوٹھیاں راس نہیں آئیں، ہاں، کھنڈرات کی ویرانیوں نے مجھے قدم قدم پہ سحر زدہ کیا۔ سوچتا ہوں، پہلی بار یہ دنیا میرے ہاتھوں پر کب ناچی تھی، کیوں یاد نہیں——؟

یادوں کے پتھریلے راستوں سے گزرتا ہوں تو ایک چھوٹا سا، حسین سا شہر نظر آتا ہے— آرہ— مجھے سب کچھ یاد آرہا ہے۔ یہ بھی، کہ پہلی بار یہ دنیا میرے اندر کب مسکرائی تھی—

شاید، میں کچھ بھی نہیں بھولا۔ شاید مجھے سب کچھ یاد ہے...... عمر کے پاؤں پاؤں چلتے ہوئے جلتے ریگستان میں میری 54 بہاریں اور 54 خزائیں جل کر خاکستر ہو گئیں—اور کتنی بہاریں بچی ہیں؟ اور کتنی خزائیں؟ ان کا حساب رکھنا نہیں چاہتا— میں، جس کا ہر ایک لمحہ ادب کی آغوش میں گزرا، آج محاسبہ کے پل صراط سے گزر رہا ہوں، کہ میرے یار ذوقی، ادب کی اس منڈی میں، تم نے حاصل کیا، کیا؟ تو سوائے مسکرانے کے میرے پاس کوئی جواب نہیں ہے—

مجھے شکوہ نہیں کہ ادب نے مجھے کیا دیا۔ مجھے بہت کچھ دیا ہے— مجھے ایک حسین زندگی عطا کی ہے— اس زندگی کو میں اپنے طور پر سوچتا ہوں، محسوس کرتا ہوں، اور اپنے سانچے میں اتارتا ہوں— میں ان میں نئے فلسفوں کی آمیزش کرتا ہوں۔ میں کچھ چلتے پھرتے زندہ کرداروں کو دوست بناتا ہوں، ان میں بیٹھتا ہوں، مسکراتا ہوں— میں آنکھیں بند کرتا ہوں، اور جیمس جوائز کے ڈبلن کی طرح، اس مہانگر میں میرا شہر آرہ میری آنکھوں میں زندہ ہو جاتا ہے۔ مچلتا ہے، مسکراتا ہے، شوخیاں کرتا ہے اور مجھے لکھنے کے لیے بے چین کرتا ہے— پھر یہ شہر کبھی میری فکر، کبھی میرا ذہن کبھی میرا قلم بن جاتا ہے—

میں لکھنے بیٹھتا ہوں......اور عمر کے برسوں پیچھے چھوٹا ہوا ایک ننھا منا شاہزادہ میری انگلیوں کو تھام لیتا ہے—

مسٹر دوستوفسکی مسکراتے ہوئے مجھ سے کہتے ہیں— آہ، یہ بھی تم ہو!

عمر کے گھوڑے دوڑاتا میں آج کی شاہراہ پر واپس آتا ہوں تو یہاں بھی ایک ننھا منا شاہزادہ ہوتا ہے—

میری ہی طرح الجھے الجھے بال—

آنکھوں میں بے پناہ چمک......شوخیاں بھی۔ شرارت بھی۔ ذہانت بھی۔

وہ مسکراتا ہے، تو میری اپنی ہی کھوئی ہوئی مسکراہٹ دوبارہ میری آنکھوں میں واپس آجاتی ہے......

اس کے پیر تھرکتے ہیں، تو گم شدہ شوخیوں کے ماہ و سال، عمر مجھے واپس کر دیتی ہے۔

وہ بولتا ہے تو انا کی چنگاریاں جیسے ایک بار پھر مجھے جلانے کے لیے تیار ہو جاتی ہیں۔

مسٹر دوستوفسکی مسکراتے ہوئے کہتے ہیں—'یہ ساشا نہیں۔ آہ، یہ بھی تم ہو—'

کن فیکون— دنیا ہر روز بن رہی ہے— تم کہیں گئے ہی نہیں۔ اس لیے تم گم بھی نہیں ہوئے۔ تم میں ایک بے چین آتما کا نواس رہا—اور— تم آئے، تم نے دیکھا اور تم نے فتح کیا—

لیکن کیا فتح کیا تھا میں نے؟ میں جو بچپن کے، چھوٹے چھوٹے کھیلوں میں ہار جاتا تھا۔ اپنی ہی عمر کے چھوٹے چھوٹے بچوں سے۔ میں بار بار ہارتا تھا۔ یا ہر بار ہارتا تھا— لیکن شکست سے گھبراتا نہیں تھا— بچپن سے کھیل— بچپن کی شرارتیں۔ کب اس ماحول میں میرے ہاتھوں میں قلم آگیا، نہیں جانتا—

اسی لیے، آج کل (نومبر 1992) کے ایک شمارہ میں اپنی کہانیوں کا ذکر کرتے ہوئے میں نے لکھا۔

''آنکھیں کھولیں تو ابا حضور جناب مشکور عالم بصیری کی شفقتوں بھرا آسمان تھا اور اٹھتے بیٹھتے شیکسپیر، ملٹن، غالب و اقبال کی صدائیں تھیں، پھر جب

لڑکپن کی حد شروع ہوئی تو دوسرے لڑکوں کی طرح میں نے بھی کھیل کود میں دلچسپی لینی چاہی۔ لٹو، گلی ڈنڈا، گولی سے لے کر کرکٹ، ہاکی، فٹ بال اور والی بال تک، مگر یہ کیا، آس پاس کے معمولی بچوں سے بھی میں شکست کھا جاتا، دل میں یہ خیال آتا کہ میں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ ہر بار کھیل میں، میں ہار جاتا ہوں۔ یہ بار بار کی شکست کا صدمہ کچھ ایسا تھا کہ ہاتھوں میں قلم اٹھا لیا۔ اب نہیں ہاروں گا۔ صرف جیتوں گا۔ تب سے اب تک پریم چند کی اس بات پر عمل کر رہا ہوں کہ ادیب تو مزدور کی طرح ہر دن مزدوری کرتا ہے۔ یہی کمٹمنٹ تب سے اب تک بنا ہوا ہے۔''

—نومبر۔1992 (آج کل)

تبسم مجھ سے پوچھتی ہے۔ اتنا کیوں لکھتے ہو؟ پھر دھیرے سے مسکراتی ہے— ''لڑتے رہتے ہو ساری دنیا سے۔ اب میں تمہیں کبھی لڑنے نہیں دوں گی مصلحت کے چراغ کیوں نہیں جلاتے؟ دوسروں کی طرح کیوں نہیں بن جاتے—''

کیسے کہوں، کہ بس، یہی مجھ سے نہیں ہو سکتا۔ میں دوسروں کی طرح نہیں بن سکتا۔ ادب میرے لیے زندگی سے زیادہ ہے— ادب میں، میں مصلحت کے چراغ نہیں جلا سکتا—

بس وہی اک کمٹمنٹ— ساری ساری رات...... میں اپنی ہی کہانیوں میں اتر رہا ہوں...... مجھے روکو مجھے سنبھالو، میری آنکھیں گم ہو رہی ہیں۔ سوچتا ہوں، یہ سب کیوں لکھ رہا ہوں۔ لیکن شاید، آنے والی نسلوں کو اس کی ضرورت محسوس ہو۔ اس لیے کہ میں نے ادب جیا ہے۔ میرا ہر پل ادب میں گزرا ہے...... ماضی میرا سرمایہ ہے۔ اور کھویا ہوا بچپن میرے لیے ایک ناقابل فراموش حادثہ—

بچپن میرے لیے ہر بار ایسا تھا، جیسے خواب نئے نئے پیرہن اتار اور بدل رہے ہیں— ہر بار ایک نیا لباس— ایک گھر تھا جو کوٹھی کے نام سے مشہور اور باہر کے راستے بچپن کے شرارتی قدموں کے لیے بند...... باہر کی دنیا، اور دنیا کی رنگینیاں تصور کی آنکھوں سے دیکھتا تھا۔ انتہائی کم عمری میں قلم کو ہی اپنا ہمدم و ہمساز بنا لیا...... آج جب گنتر گراس The Tin drum لکھتا ہے اور اپنے وطن کی ڈانزگ کے (Danzig) محبت کے قصے بیان کرتا ہے، جوائز ڈبلن شہر کے گیت گاتا ہے۔ روسی مصنفوں کی تصنیف میں ان کا شہر ہنستا گاتا ہے، گبریل گارسیا مارکیز One hundred years of solitude اور اپنی دیگر کتابوں میں اپنے شہر، اپنے لوگوں کو زندہ کرتا ہے تو مجھے تعجب نہیں ہوتا—

دلی میں 1985 میں آیا۔ 85 تک اور 85 کے بعد آج تک میری کہانیوں میں میرا شہر آرہ زندہ رہا ہے۔ شہر آرہ کے مختلف کردار الگ الگ بھیس بدل کر میری کہانیوں میں زندہ ہوتے رہے۔ خاص کر ان کہانیوں میں، جو میں 85 کے آس پاس لکھ چکا تھا۔ ان میں زیادہ تر کہانیاں ایسی ہیں، جس میں میرا شہر ہے، میرے اپنے ہیں اور میرے احساس ہیں—

یہ میری کہانیوں کا پہلا چہرہ تھا، اس چہرے کو دکھانا اس لیے ضروری ہے کہ میرا ہر پل محاسبہ اور تجزیہ سے گزرتا رہا ہے— اس طرح، میری کہانیوں کے کئی چہرے رہے۔ ایک چہرہ جس میں میرا شہر زندہ رہا، ایک چہرہ جہاں جدید تر ہونے کی بھول بھلیاں میں، میں نے آڑی ترچھی تجریدی کہانیاں بھی لکھیں...... میں نے باوضو ہو کر ''اساطیر'' کے بطن سے بھی کہانیاں چرائیں— پھر ایک نیا چہرہ میری کہانیوں میں جما— یعنی میں ترقی پسندی کی کھردری، دھوپ کی تمازت سے جلتی شاہراہ پر چلتا گیا— مگر آہ! سیاست یہاں بھی گرم تھی— اور میں Idealogy کے نازک سے شیشہ کو سینے سے چمٹائے رکھنا چاہتا تھا— میں جل رہا تھا، گم ہو رہا تھا...... محنت سے لکھی جانے والی کہانیوں کو انعام کیا ملتا، ایک طرف نہ جدیدیے انہیں اپنانے کے لیے تیار تھے نہ ترقی پسندوں کی سیاست انہیں پسند کرنے پر آمادہ۔ سب اپنی اپنی ہانک رہے تھے—

1999 کے آس پاس میں جیسے بھیانک خواب سے جاگا— اور میں نے اپنا محاکمہ کیا—

— مسٹر دوستوفسکی، کیا تم میری آواز سن رہے ہو؟

— آہ نہیں، تم سوچکے ہو اس لیے کہ روسی سلطنت کے کنگرے گر گئے۔ لینن کا بت ٹوٹ گیا—

— مسٹر دوستوفسکی، تمہارے کراموزوف برادر کیا کہتے ہیں۔ کیا تم میری آواز سن رہے ہو۔ کیا تم اب روس کی اس تقسیم پر کرائم اینڈ پنشمنٹ لکھ سکتے ہو؟

— آہ، مسٹر دوستوفسکی، تم مجھے سن کیوں نہیں رہے، تمہاری آواز مجھ سے دور کیوں جا رہی ہے؟

دوستوفسکی میرا آئیڈیل تھا اور سن 1999 یعنی ملینیم کے خاتمہ اور بیسویں صدی کے آخری برس مجھے ایسا کیوں لگا کہ میرے برسوں سے آئیڈیل کی تصویر دھندلی دھندلی ہونے لگی ہے— میں اس تصویر کی شناخت نہیں کر پا رہا ہوں۔ یہ تصویر آہستہ آہستہ میری نگاہوں سے اوجھل ہونے لگی ہے۔

کہانیوں کا پہلا چہرہ؟ بچپن کی شوخیاں، سرمستیاں — جی چاہتا ہے، ان کی کچھ جھلک آپ کو دکھاتا چلوں...... لیکن اسے کیوں دیکھیں گے؟ ایک گمنام سا ادیب، سیاست بازی کے اس عہد میں سب سے پچھڑا ہوا، یگانہ...... گوشہ نشیں...... جس کے پاس اپنے Projection کے لیے بھی کچھ نہیں۔

کیوں سلیم شیرازی؟ ٹھیک کہا نا؟

بچپن کے کسی گلیمر بھرے لہجے میں جب بھی خود سے مخاطب ہونے کو دل چاہتا خود کو اسی نام سے مخاطب کرتا—

کیوں سلیم شیرازی؟ تم تو لگاتار ہار رہے ہو؟

ہارتے جا رہے ہو؟

تو سلیم شیرازی، بچپن کے یہ قصے بھی ضروری ہیں کہ ان کے بغیر میری کہانیاں ادھوری ہیں— اور تم زمانہ نہیں ہو...... اردو والوں کی بھیڑ نہیں ہو۔

میں چاہتا ہوں مجھے سمجھا جائے۔ اس لیے کہ اب رات اتر رہی ہے...... رات دھیرے دھیرے اترتی جارہی ہے—

تو سلیم شیرازی ایک دن اچانک گم ہوجاتی ہے۔ لیکن کہانیاں زندہ رہتی ہیں—

**بچپن، امرود کا پیڑ اور کہانیاں**

اپنے اندر جھانکوں تو جیسے شرمیلے پن کی عمر پاؤں پاؤں پیچھے چلتی ہوئی ماں کی اسی اندھی کوکھ میں اتر جاتی ہے......

مسٹر اسلم شیرازی تم پیدا ہوئے تبھی سب شرمیلے تھے......

شرمیلے ہونے کی ایک سے بڑھ کر ایک کہانیاں— مجھے اپنے ہونے پر شرم آتی تھی...... مجھے لیٹرین یا پاخانے جانے پر شرم آتی ہے......ایسے موقع پر مجھے اپنا حلیہ دیکھنے پر شرم آتی تھی...... مجھے گھر کے باہر لٹکے ہوئے ٹاٹ کے پردے کو دیکھ کر شرم آتی تھی...... مجھے ٹوٹی ہوئی سیڑھیاں جھڑتی ہوئی قلعی، ٹوٹی ہوئی محرابوں کو دیکھ کر شرم آتی تھی...... مجھے مہمانوں سے شرم آتی تھی...... مجھے ان کے ساتھ دسترخوان پر بیٹھتے ہوئے شرم آتی تھی...... مجھے اسکول جانے میں شرم آتی تھی...... مجھے بہت سارے...... بہت سارے بچوں کے ساتھ بیٹھتے ہوئے شرم آتی تھی...... مجھے ان بچوں سے باتیں کرتے ہوئے شرم آتی تھی......

—مجھے شرم آتی تھی، اس لیے کہ میں تیز بولتا تھا......

اس لیے کہ یہ خیال کھائے جاتا تھا...... کہ کسی کو میری آواز سمجھ میں آتی ہے یا نہیں۔

بچے میری آواز نہ سمجھ پانے کے جرم میں قہقہہ بکھیرتے، تب بھی مجھے بڑی زور کی شرم آتی......

مجھے شرم آتی تھی کہ اپنے خیالوں میں، میں دنیا کا سب سے حسین اور خوبصورت بچہ تھا......

مجھے شرم آتی تھی کہ ملنے والا ہر شخص، شاہراہ سے گزرنے والا راہگیر مجھے غور سے دیکھ رہا ہوتا تھا......اس کی آنکھیں میری پیٹھ پر جمی ہوتی تھیں......اور اس چبھن کے ساتھ ہی میرے پاؤں کے زاویے بدل جاتے...... قدموں میں لرزش آجاتی......

یہ رنگ ہر پل، ہر لمحہ کسی نہ کسی نئی حسین کہانی کے جنم داتا بن جاتے...... یہ رنگ مجھے اپنی ہی آنکھوں کا ساحر بنا دیتا......

اور یہ رنگ مجھے اپنی ہی آنکھوں میں گرا دیتا......

میں اپنے شرمیلے رنگ میں، عمر کی نازک ننھی سیڑھیوں پر اپنی ہم عمر لڑکیوں میں مقبولیت کے جھنڈے گاڑ چکا تھا...... تنہائی کے ایسے ایسے گوشے مجھے میسر تھے جہاں گھر کے کسی بھی شخص کی نگاہیں سفر نہیں کرسکتی تھیں...... اور میں ان لمحات کا فائدہ اٹھایا کرتا......

میں بہت کچھ سیکھ رہا تھا—

بہت کچھ نیا—

بہت کچھ جس سے میرے ہاتھ سماج میں جینے والے بچے شاید انجان رہتے ہوں......

من مور سا ناچے......

من پپیہے سا بولے

من کوئل سا کوکے......

من مور سا لہرائے......

من......

اسلم شیرازی، ممکن ہے، بچپن میں تم نے بدتمیزیاں کی ہوں مگر داستان کی یہ گندی پوٹلی کھول کر کیوں بیٹھ گئے۔

کیونکہ،

میں پہلے پانیوں جیسا تھا......

نرم، ملائم، لچکیلا......

رحم دل، حساس اور جذباتی

میں ہوا کے دوش پر اڑتا تھا، بل کھاتا تھا......

میں مور سا لہراتا تھا، ناچتا تھا......

اور سارا سارا دن اپنی تعریف سنتا تھا......گھر والوں سے ملنے جلنے والوں سے، اسکول میں پڑھنے والے ساتھیوں سے اور......

تمام رشتے داروں سے...... ان آنکھوں میں میرے لیے پیار ہی پیار ہوتا......ہوا کے دوش پر لہراتا ہوا ایک گھوڑا ہوتا......گھوڑے پر کسی شہزادے کی طرح میں سوار رہتا......اور گھوڑا آسمان میں اڑ رہا ہوتا......

میں سب کو پیچھے چھوڑ کر اوپر ہی اوپر پرواز کررہا ہوتا......

اور حدِ پرواز میں کہیں ایک عجیب سی شرم بھی چھپی ہوتی......

واقعات کے رتھ دوڑتے ہوتے......

حادثات کے موسم اپنا رنگ دکھلاتے رہے......

اور میں...... اسلم شیرازی اپنی آنکھوں میں سنہلی پرچھائیاں سمیٹے، دنیا کو اپنے خوابوں کے رنگ میں دیکھتا اور محسوس کرتا رہا......

مگر ہر بار ایک آئینہ ٹوٹ جاتا......

میرے عزائم پر کوئی شرمیلا بچھو کے ڈنک کی طرح زہر گھول دیتا اور میں سرتاپا اپنی شرم میں ڈوب مرتا......

میں صرف اندر سے سوال پوچھتا تھا اور جواب ہونٹوں تک آنے کا راستہ بھول جاتے تھے......

میں برابری چاہتا تھا......

مساوات چاہتا تھا......

اور ایسی بہت ساری باتیں جو کہانیوں سے کتابوں سے، ابا حضور

کے ہونٹوں سے، اینجل اور مارکس کے فلسفوں سے ہوتی ہوئی میرے دماغ میں بس گئی تھیں......

ایسے بہت سارے خواب......

ایسے بہت سارے مناظر......جنہیں میں اپنے فلسفوں کی دھوپ سے زندگی کے آنگن میں اتار کر زندہ کرنا چاہتا تھا مگر......

کمزور اور دبو آدمی

نکما اور ہارا ہوا آدمی......

اور بہت زیادہ شرمیلا......

جو لڑکیوں کے قہقہوں سے ڈر جاتا...... ان کی آواز سے گھبرا جاتا......اس طرح سچ کی آواز پر بھی چپ ہو جاتا......

سچ کے لیے مصلوب ہونے کے قابل نہیں تھا، ہار مان لیتا......

اپنی تسلیوں کی، برف کی سل پر لیٹ جاتا......

اور خود کو ایک اندیکھے لمحے کی موت کو سونپ دیتا......

کل......جو ابھی ابھی پاس سے گزرا لگتا ہے...... ہزاروں کھٹی میٹھی کہانیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے......ایسی کتنی ہی کہانیاں ہیں جو آپ پہلے بھی سن چکے......جو میں پہلے بھی سنا چکا......اور جسے ہر بار سناتے ہوئے مزہ آتا ہے......

کہانیوں میں کہانیاں......واقعات در واقعات......

وہاں امرود کا پیڑ تھا...... بڑا سا صحن......اتنا بڑا صحن کہ ہم لٹو نچانے سے لے کر کرکٹ، والی بال اور فٹ بال تک کھیلا کرتے تھے......صحن کے دائیں جانب...... امرود کے پیڑ سے ذرا فاصلے پر بالائی منزل کو سیڑھیاں چلی گئی تھیں...... اونچی، لمبی سڑھیاں...... اس اطراف میں زیادہ تر خاموشی چھائی رہتی......کیونکہ یہ اندر کے دالان، باورچی خانہ اور سونے کے کمروں سے کٹا ہوا علاقہ تھا...... ہماری کل جنت کا حاصل یہی کمرہ تھا...... یہاں اتنی دھما چوکڑی ہوتی تھی......کہ......حافظے میں وہ سارے قصے، مونگ پھلی کا چھلکا اترنے کے باوجود تیرتے رہتے ہیں......

مونگ پھلی کا چھلکا— زندگی سے پھر کتنے چھلکے اترتے چلے گئے۔ ہر بار میرے ہاتھوں میں قلم تھا۔ بچپن تھا اور کہانیاں تھیں— ان میں وہی داستانی حویلی تھی۔ اور امرود کا پیڑ تھا۔ ابا حضور تھے— گرمی کی تپتی دوپہریا تھی— لوکے جھکڑ تھے اور کہانیاں تھیں۔ کہانیاں جو مجھے لکھ رہی تھیں۔ کہانیاں، جو مستقل مجھے لکھے جا رہی تھیں—

اور ایک پازیب تھی، جو مستقبل میرے اندر بجے جا رہی تھی—

امرود کے پیڑ پر آ کر ایک کوا بیٹھ گیا ہے۔ کائیں......کائیں، کاؤں، کاؤں......کوا پر کھولے اڑتا ہوا آنگن کا چکر مار کر دور نکل گیا ہے...... یہ میری ہتھیلیاں کانپ کیوں رہی ہیں......

ایک عجیب سا رنگ چہرے پر آتا ہے، جاتا ہے......ہوا میں کتنی تپش ہے......کتنی گرمی اور چبھن ہے...... جیسے سارے جسم کو پگھلا کر رکھ دیں گی...... بھون دیں گی...... جیسے کباب بھونے جاتے ہیں......اماں بھونتی ہیں...... بورسی میں ڈھیر سارے لکڑی کے کوئلے جلا کر......لکڑی کے کوئلوں میں آگ دھیرے دھیرے پکڑتی ہے...... اماں دھیرے سے ہتھ پنکھا ڈلاتی ہیں...... اور دھواں آنکھوں میں انگاروں کی طرح بھر جاتا ہے......اماں آنکھیں درد کر رہی ہیں...... مت جھلوا اتنا تیز......آنکھوں میں مرچی پڑ رہی ہے......

آنکھوں میں مرچی؟

سوچتا ہوں......عمر کی یہ انوکھی سی پازیب اچانک اس وقت کیوں بجی تھی: کسی ہیجان خیز پل پر سوار، کسی ننھی منی عمر کا گھوڑا ایک بھری بھری سیلابی ندی کی آغوش میں اترنے کو کیسے تیار ہو گیا تھا......ممکن ہے، جلتے بجھتے سے کچھ منظر رہے ہوں، جس نے لو کی اس تپتی دوپہریا میں مجھے اپنے احساس کا مجرم بنا دیا تھا......

ننھی عمر کی جھن جھن کرتی ہوئی پازیب مجھ میں کچھ ایسے بج رہی تھی کہ میں وجود میں اترے ہیجان کے دروازے کا قفل کھول رہا تھا......تمہیں لکھنا ہوگا......لکھنا ہوگا......سن رہے ہو نا تم؟

میرے خیالوں کو جس اشترا کی نظریہ نے اپنی زمین فراہم کی تھی، اس کی بنیاد میں بھی اس شرمیلے پن کا لہو ملا ہوا تھا...... میں صرف دیکھتا تھا......سوچتا تھا......کلپنا کرتا تھا یا تصور کرتا تھا...... یا صرف جذبات اور احساسات کی گیلی پگڈنڈیوں سے گزر کر رہ جاتا......اور انہی جذباتی پگڈنڈیوں سے اس وقت کی، میری زیادہ تر کہانیاں بھی گزر رہی تھیں۔

تو بچپن کے کیسے کیسے رنگ تھے۔ ان انوکھے رنگوں کی کہانیاں کسی اور دن سناؤں گا۔ آج تو میں صرف ادب کا تذکرہ لے کر بیٹھا ہوں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ داستانی حویلی، امرود کے پیڑ اور بچپن کی شرارتوں کے درمیان ہی کہیں میری کہانیوں کا جنم ہوا تھا۔

وحشت کا بائیسواں برس: گھر آنگن کے چہرے

کیسے کیسے واقعات— اور واقعات کی رم جھم بارش میں شرابور بچپن— یہ بچپن آج بھی میری کہانیوں میں اتر آتا ہے۔ بچپن کی محسوسات کو سمیٹ کر صرف سترہ سال کی عمر میں، میں نے اپنا پہلا ناول مکمل کیا— 'عقاب کی آنکھیں'— یہ وہ زمانہ تھا جب میں رائیڈر زہیگرڈ، الگزنڈر ڈیوما وغیرہ مصنفوں سے زیادہ متاثر تھا— عقاب کی آنکھیں کی بنیاد بچپن میں سیکس کے اثرات پر رکھی گئی تھی— اس ناول کے پیش لفظ میں، میں نے لکھا—

''یہ ناول میری زندگی کا پہلا ناول ہے۔ اس ناول کو میں نے انتہائی کم سنی میں تحریر کیا، اس وقت عمر ہوگی یہی کوئی 16-17 سال۔ خواہش تو تھی کہ سب سے پہلے یہ ناول ہی منظر عام پر آتا، مگر ایسا نہیں ہو سکا۔

لکھنے کا شوق بہت چھوٹی عمر میں شروع ہو گیا۔ چھٹے ساتویں درجے سے ہی بچوں کے رسائل میں کہانیاں شائع ہونے لگیں— ابا حضور فرمایا کرتے

کہ بیٹا، 24 سال کی عمر تک اگر کوئی شاہکار نہیں لکھا تو پھر کبھی نہیں لکھ پاؤ گے۔ بس ان کی یہ بات گانٹھ سے بندھ گئی اور اس طرح اس ناول کا سفر شروع ہوا—

78-79 کے آس پاس میں عقاب کی آنکھیں لکھ چکا تھا۔ یہ وہ دور تھا، جب میرے مشاہدے کی لو تیز تھی اور من کی کھڑکی سے سمندر کے رومانی لہروں کی گرج مجھے صاف صاف سنائی دینے لگی تھی، ان لہروں نے مجھے بھی بھگویا اور میری کہانیوں کو بھی—

آرہ میں نے 1985 میں چھوڑا تھا۔ یعنی 1985 میں، میں دلی آ گیا تھا۔ آج سوچتا ہوں تو عجیب سا لگتا ہے۔ وہ ساری کہانیاں آج سچ معلوم ہوتی ہیں، جنہوں نے میرے قلم سے 1985 سے پہلے جنم لیا تھا— 82 میں، میں نے گریجویشن مکمل کیا۔ یہ وہ دور تھا، جب نرم نرم احساس کی لہریں مجھے دور تک بھگوتی چلی گئی تھیں— ابا حضور کہا کرتے تھے۔ جس کی زندگی میں رومان نہ ہو، وہ اچھا ادب تحریر کر ہی نہیں سکتا۔ اور جس نے 24 سال کی عمر تک کچھ نہیں لکھا، وہ بڑا ادب تخلیق کر ہی نہیں سکتا۔ میں دل ہی دل میں خوش کہ 18-20 سال کی عمر میں چار ناول تخلیق کر چکا تھا...... نیلام گھر، لمحہ آئندہ، عقاب کی آنکھیں اور شہر چپ ہے— اس وقت تک ادب میں ناول کی ہوا نہیں چلی تھی یہاں تک کہ عبدالصمد کا ناول دو گز زمین بھی منظر عام پر نہیں آیا تھا۔ میرے پاس وسائل کی کمی تھی۔ عمر کا تجربہ نہیں تھا۔ اور دلی بہت دور ہے، کا محاورہ مجھ پر صادق آتا تھا۔ میں ان کتابوں کی اشاعت کے لیے دلی خط پر خط لکھتا رہا مگر دلی تو گونگی ہے۔ دلی کے پاس تو زبان ہی نہیں ہے— کسی نے بھی خط کا جواب دینا ضرور نہیں سمجھا۔ اور ناولوں کی اشاعت میرے لیے ایک مسئلہ بنتی چلی گئی۔ بہت ممکن ہے، یہ ناول اس عہد میں شائع ہو گئے ہوتے تو ہنگامہ مچا چکے ہوتے— نیلام گھر، اور شہر چپ ہے، تخلیق کے دس برسوں کے بعد شائع ہوئے۔ قمر رئیس نے لکھا، عظیم ناول لیکن زبان کمزور ہے— بہت ممکن ہے، دس سال قبل اسے ایک ابھرتے ہوئے نوجوان قلمکار کی کاوش ٹھہرا کر ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا۔ تب ممکن ہے یہ حوصلہ افزائی شاید مجھے کسی اور تخلیقی دنیا میں لے جاتی...... مگر چھوٹے شہر میں آنکھیں کھولنے کی بدنصیبی نے مجھ سے کئی تخلیقی برس، چھین لیے، مجھے زندگی بھر افسوس رہے گا—

85 سے پہلے لکھی جانے والی کہانیوں کے کچھ چہرے آپ کو دکھانا چاہتا ہوں۔ ان میں میرا گھر ہے۔ میری بیوی، تبسم ہے۔ میرے بچے ہیں (ان دنوں شادی کہاں ہوئی تھی، سب کچھ تو میں تصور کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا) مگر کہانیوں کے سارے واقعات، جیسے چپکے چپکے آنے والے کل میں اترتے چلے گئے۔ آج سب کچھ وہی ہے جو میں نے ان دنوں دیکھا۔ سوچا محسوس کیا، جن کے خواب دیکھے— میرا گھر۔ میرا کمرہ، میرا وجود، میرا سچ، میرے اندر کا جذباتی چہرہ۔ سچ سچ مکان بولتے ہیں۔ کمرہ بولتا ہے—

''آپ نے بھی غور کیا ہوگا اور میں نے بھی غور کیا ہے کہ آدمی جس مکان میں رہتا ہے وہ مکان اسے بے حد عزیز ہوتا ہے۔ مکان کا وہ کمرہ جس میں وہ لیٹتا ہے سوتا ہے، فرصت کے زیادہ لمحات گزارتا ہے، اس سے زیادہ اچھا کمرہ اسے پورے گھر میں کوئی دوسرا نہیں نظر نہیں آتا۔ یہ ممکن ہے کہ آپ کو اپنے کمرے سے اس شدت سے پیار نہ ہو جس شدت کے ساتھ مجھے ہے جب بھی میں کسی دوسرے شہر کا دورہ کرتا ہوں اور دو چار روز وہاں ٹھہرنا مقصود ہوتا ہے اپنے کمرے کی یاد مجھے توڑ کر رکھ دیتی ہے۔ کتنی ہی بار دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ دورہ منسوخ کر دوں اور بھاگ کر اپنے اپنے کمرہ میں لوٹ جاؤں...... وہاں سب کچھ تو موجود ہوگا...... میری بکھری گرد و غبار میں ڈوبی ہوئی کتابیں...... میرے ساتھ ساتھ سفر کرتی ہوئی یادیں...... یادیں! جن سے زندگی کا اتنا گہرا اجڑاؤ ہے کہ میں کبھی سنبھلتا ہی نہیں۔ اگر میرے مونس و غم خوار کمرے نے مجھے سہارا نہیں دیا ہوتا ان دنوں اچانک جب پورے مکان میں ایک خلاء سا پیدا ہو گیا تھا...... اور مکان چار بزرگوں کی رونق سے محروم ہو گیا تھا تو یہی کمرہ تھا جس میں گھنٹوں بیٹھ کر ان کی بھولی بسری پرچھائیوں سے دل بہلایا کرتا تھا......تو کمرہ بولتا ہے۔ گھر سے اچانک چار بزرگ اٹھ گئے۔ چار نعشیں...... وقت کے کندھوں پر سوار۔ میں بوجھل بوجھل سا، اپنے اندر اترتا ہوں۔ اپنی رومانی کہانیوں کے کرداروں میں پناہ ڈھونڈھتا ہوں تو ایک سرکش گھوڑا ہے اور میں پا بہ رکاب۔ ہوا میں بس اڑنے والا۔ اور عمر ہے، جسے ایک دن سب کو الگ کر دینا ہے۔ میں پاگلوں کی طرح، اپنے گھر اپنے کمرے کا جائزہ لیتا ہوں۔ کہانیوں کی آغوش نرم و نازک ہوتی ہے۔ میرے خیال ہوتے ہیں۔ میری رومانی کہانیوں کے حسین کردار ہوتے ہیں جو مجھے گھیر کر بیٹھ جاتے ہیں...... میری زندگی کا وہ عظیم حادثہ تھا۔ جب ماں وداع کی پہاڑیوں میں گم ہو گئیں۔ یہ حادثے میری کہانیوں میں کب کیسے داخل ہو گئے۔ میں نہیں جانتا۔ تو کیا یہ سب صرف جذباتی کہانیاں تھیں۔ شاید نہیں۔ ان کہانیوں کے طویل اقتباسات پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ ان میں، میں ہوں۔ برسوں پیچھے چھوٹا ہوا میں۔ اور برسوں پیچھے چھوٹے ہوئے مشرف عالم ذوقی کو سمجھنے کے لیے ان کہانیوں کا مطالعہ ضروری ہے۔

''پتہ نہیں کس نے کہا تھا۔ دنیا میں جتنے بھی ملک ہیں، سب سے اچھا ملک میرا ہے۔ اسی ملک میں جتنے بھی شہر ہیں، سب سے اچھا شہر میرا ہے، شہر میں جتنے بھی مکان ہیں، سب سے اچھا مکان میرا ہے۔ اور مکان میں جتنے بھی کمرے ہیں ان میں سب سے اچھا کمرہ میرا ہے۔ میں اکثر تبو کو بتایا کرتا ہوں...... زندگی کے شب و روز کی اتنی ساری گتھیوں کو اس کمرے میں سلجھاتا رہا ہوں کہ اب روز ہی اس کمرے کو دیکھنے کی عادت سی پڑ گئی ہے۔ پتہ نہیں، لگتا ہے کہ بھیا اگر نئے سرے سے وہ مکان بنائیں گے تو وہ کمرہ بھی بدل جائے گا......

اس وقت تک نہ میرے پاس روزگار تھا، نہ کوئی کرئے کا مکان نہ تبسم میری زندگی میں آئی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ مجھے بار بار یہ احساس ہو رہا تھا کہ مجھ سے میرا گھر چھوٹ جائے گا۔ مجھے ہجرت کرنی پڑے گی۔ اور ہجرت کے المیہ نے اس وقت مجھے ایسی دلدوز کہانیاں لکھنے پر مجبور کیا۔

'اس وقت کی ۵۰ سے زائد کہانیوں پر یہی جذباتی لہریں حاوی تھیں۔ وحشت کا بائیسواں سال، پینتالیس سال کا سفرنامہ، مجھے موسم بننے سے روک لو پلیز، اللہ ایک ہے، پاک اور بے عیب ہے، لاش گھر، سرمن از نالہ من دور نیست، بشنواز نے.....' گمان آباد ہستی میں، سات کمروں والا مکان، وغیرہ......

میں ایک حساس دل رکھتا تھا۔ اور اس حساس دل میں ان دیکھے جذبوں کا ڈیرا تھا...... یہ جذبات مجھے اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے پریشان کیے جاتے......زندگی اور موت کے فلسفوں پر آنکھیں رہ رہ کر بھیگ جاتیں......لوگ گم کیوں اور کیسے ہوجاتے ہیں......زندگیاں کیسے، کتنے کتنے خانوں میں بٹتی چلی جاتی ہیں۔

80 کے آس پاس کا زمانہ......رات کا کوئی پچھلا پہر......لائٹ نہیں ہے— لالٹین کا شیشہ کالا پڑ چکا ہے میں لمحہ آئندہ لکھ رہا ہوں۔ اور اچانک میں زور سے چیختا ہوں۔

'مجھے...... مجھے کچھ بھی نظر نہیں آرہا ہے۔ مجھے کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا ہے'

'لاش گھر' اللہ ایک ہے...... کہانیاں ان کہانیوں میں سے ہیں، جن میں، میں نے اپنی اس وقت کی کیفیت کا پورا پورا اظہار کیا ہے......

''مگر میں ایسا کیوں سوچتا ہوں کہ میں اس بھرے پُرے گھر میں اکیلا ہوں۔ تنہا ہوں۔ اور سب کے سب مجھ سے رخصت ہوگئے ہیں۔

—اللہ ایک ہے......

واقعات وحادثات کے اس سلسلے نے مجھے کتنا زخمی کیا، اسے میں ہی جانتا ہوں— لیکن یہ وہ سانحے تھے، جنہوں نے مجھے بھی متاثر کیا اور میری کہانیوں کو بھی—1985 میں، میں نے آرہ چھوڑ دیا— چھوڑنے سے قبل، میں ایک کتاب پڑھ رہا تھا، امرتا پریتم کی 'پنجر'—ایک انتہائی جذباتی کہانی—

میں نے خود سے کہا۔ ذوقی! اب میں کہانیوں میں جذبات کی عکاسی نہیں کروں گا— امرتا نے مجھے ڈرا دیا تھا— وہاں جذبات، کہانی پن پر حاوی تھا—

دلی میں نئے خیالات کے ساتھ آیا تھا لیکن اب مجھ پر ایک ترقی پسند چہرہ حاوی تھا—یہ میری کہانیوں کا تیسرا چہرہ تھا۔

**دلی، اور کہانیوں کا بدلا بدلا سا چہرہ**

کہانیوں کے پہلے اور تیسرے چہرے کے بیچ دوسرا چہرہ گم ہوگیا۔ میں اس چہرے کو تلاش کرنا بھی نہیں چاہتا— میں نے جان بوجھ کر اس چہرے کو Ignore کیا ہے۔ یہ چہرہ جدیدیت کی کوکھ سے جنما تھا۔ اس چہرے کی تاریخ پیدائش بھی وہی تھی، جو میری ناسٹلجیائی کہانیوں کی تھی—80 کے آس پاس کا یہ عہد مجھے الجھنوں میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھا۔ کیونکہ میں جو لکھنا چاہتا تھا، وہ اس عہد کے لیے موزوں نہیں تھا جو نہیں لکھنا چاہتا تھا، رسائل میں چھپنے کے لیے وہ لکھنے پر مجبور تھا— جدیدیت کی آندھی میں سچ پوچھیے تو میں بھی بہتا چلا گیا تھا—

''یہ وہ کہانیاں ہیں، جنہیں میں نے رد کیا۔''

دلی یعنی مہانگر، چھوٹے سے قصباتی شہر میں رہ کر، اس شہر کا تصور کر پانا بھی مشکل تھا— مجھے اس شہر سے بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ ہجرت کیا ہوتی ہے۔ اپنے گھر کا سکھ کیا ہوتا ہے۔ یہاں تو در در کی ٹھوکریں تھیں اور خالی ہاتھ تھے— دلی دل والوں کی دلی نہیں تھی تنگ دل لوگوں کی دلی بن کر رہ گئی تھی۔ بیشمار خطرات، ذہنی یاتنائیں، پریشانیاں— بہت ممکن ہے میں ہار گیا ہوتا، مگر، میں نے جو کچھ پڑھا تھا، اب وہی میرے کام آرہا تھا— کہتے ہیں، ایک زندگی وہ ہوتی ہے جسے آپ اپنے طور پر جینے کی کوشش کرتے ہیں— ایک زندگی وہ ہوتی ہے جو آپ کا مطالعہ آپ کا Vision آپ کو سونپتا ہے— الکزینڈر پشکن نکولائی گوگول، فیودر دوستوفسکی، لیوتالستائے، میخائیل شولوخوف، میکسم گورکی، ترگنیف— روسی ادب کا میں مداح تھا، اور یہ لوگ میرے لیے مشعل راہ— ان سب کے یہاں زندگی سے لڑنے کی جسارت موجود تھی۔ خاص کر آرہ چھوڑنے سے قبل ایک بہت بعد کے روسی مصنف کی کتاب میں نے پڑھی تھی۔ بورس پولوو، کتاب کا نام تھا۔ The story of a real man—ایک فوجی جس کا پاؤں کاٹ ڈالا جاتا ہے۔ اور جو اپنے ول پاور سے اپنی خوداعتمادی دوبارہ بحال کرنے میں کامیاب ہوتا ہے— مجھے ہیمنگ وے کے The oldman and the sea سے محبت تھی— ہیمنگ وے کی کہانیوں کے مرد آہن مجھ میں نیا جوش، نیا دم خم بھرتے تھے۔ مجھے ہنری ملر کے موبی ڈک سے پیار تھا— وکٹر ہیوگو، کفکا، ورجینا وُلف، البیر کامو، یہ سارے میرے اپنے تھے۔ خاص کر Les miserable کا پادری اور The plague کا Dr. Riox میرا آئیڈیل تھا۔ ٹھیک اسی طرح کرائم اینڈ پنشمنٹ کا رسکلانیکوو، گورکی مدر کا پاویل ولاسوف، اور ترگنیف کی The father and the son کے باپ بیٹے مجھے بے حد پیارے تھے— گوگول کی کتاب Deal soul مجھے ذہنی عذاب میں مبتلا کرتی تھی۔ وہیں گبریل گارشیا مارکیز کا ادب مجھے ایک نئی دشا میں لے جانے کی تیاری کر رہا تھا— عجیب بات تھی کہ مجھے الیکزینڈر سولنسٹین سے بھی اسی قدر محبت تھی۔ گلاگ آرکیپلا گو اور کینسر وارڈ دونوں مجھے پسند کر رہے تھے۔ نیتھنئیل ہیتھنے کی The scarlet letter بھی مجھے پسند تھی۔ جارج آرویل کی Animal farm اور 1984 مجھے نئی فکر سے روشناس کرا رہے تھے— میں سال بیلو کو بھی پڑھنا چاہتا تھا، ولیم گولڈنگ اور گراہم گرین کو بھی— اردو میں قرۃالعین حیدر کے یہاں مجھے تصنع کی جھلک ملتی تھی۔ منٹو مجھے چونکاتا تھا، لیکن فکری اعتبار سے زیادہ بلند نہیں لگتا تھا، عصمت مجھے راس نہیں آئیں۔ راجندر سنگھ بیدی کی کہانیاں ہر بار زیادہ سے زیادہ قربت کا احساس دلا رہی تھیں اور کرشن کی نثر کسی جادو کی طرح مجھ پر سوار تھی— مجھے اردو کی داستانوں نے لبھایا تھا اور مجھے لکھنا سکھایا تھا۔ مجھے پنچ تنتر بھی پسند تھی اور The magic mountain بھی۔ طلسم ہوشربا کا تو میں شیدائی تھا—

دلی کی پاگل بھیڑ بھری سڑکوں پر ہیمنگ وے کا The oldman

پیر تسمہ پا کی طرح مجھ پر سوار تھا— دلی کی پریشان حال زندگی اور لڑتے رہنے کا جذبہ، 85 سے 95 تک کے بیچ میری کہانیوں پر ترقی پسندانہ رنگ غالب رہا— میں سوچتا تھا نثر، غریب کے بدحال جسم کی طرح ہونی چاہئے۔ Glamour less نثر اس کی زبان عصمت کی کہانیوں کی طرح رواں دواں نہیں ہوسکتی۔ میں نے اپنا تجزیہ کیا اور ایک نئی روش اپنائی، نئی ڈگر پر چلا۔

بھوکا ایتھوپیا— بچھوگھاٹی، مرگ نینی نے کہا، میں ہارا نہیں ہوں کامریڈ، ہجرت، مت روسا لگ رام، فنی لینڈ، پربت، مہاندی، تحفظ، تحریکیں، کان بند ہے، جلاوطن، ہندستانی، دہشت کیوں ہے، کنتاوش، سورباڑی، تناؤ وغیرہ—

میری کہانیاں تقسیم کے بطن سے جنمی تھیں۔ گو آزادی کے پندرہ برس بعد میرا جنم ہوا۔ لیکن میرے ہوش سنبھالنے تک یہ زخم تازہ تھا— بوڑھے بزرگ ہونٹوں پر تقسیم کا درد زندہ تھا اور کراہتا تھا— غلامی، میرے لیے ایک اذیت ناک تصور تھا، اور آزادی کے بعد کے فسادات میرے نزدیک انتہائی بے رحم آزادی کی خوں بھری سوغات کی مانند تھے—

میں اپنی زمین نہیں چھوڑ سکتا تھا—

میں اپنے مسائل کو نظرانداز کر کے، قلم نہیں اٹھا سکتا تھا۔

فساد، ہندو، مسلمان، اردو اور پاکستان میں کئی چیزیں مشترک تھیں—

مجھے ڈر لگتا تھا جب خوف کی چنگاریاں بند کمرے میں سہما سہما چہرہ دکھایا کرتی تھیں۔ میں سوچتا تھا۔ کیوں ہوتا ہے ایسا—

گاندھی جی کا قتل ہوتا ہے۔ مسلمان اپنے اپنے گھروں میں چھپ جاتے ہیں— کسی مسلمان نے مارا ہو، تو—؟

خدانخواستہ قاتل کوئی مسلمان ہوا تو؟

اندرا گاندھی کی ہتیا ہوتی ہے— مسلمان اپنے اپنے گھروں میں چھپ جاتے ہیں۔

راجیو گاندھی کی ہتیا ہوتی ہے۔ مسلمان اپنے اپنے گھروں میں چھپ جاتے ہیں۔ کیوں؟ کیوں؟

۱۰۰ کروڑ کی آبادی والی جمہوریت میں ۲۵ کروڑ کی یہ آبادی اقلیت کہلاتی ہے؟ کیوں؟

میں ترقی پسندی کے راستہ پر اسی لیے چلا کہ میں ان سوالوں سے بچ بچا کر نہیں گزر سکتا۔ میرے اندر کا تخلیق کار ان سوالوں کو نظرانداز نہیں کرسکتا تھا۔ اور میں صرف شوقیہ ادیب نہیں بننا چاہتا تھا— میں، کسی ایک قاتل لمحے سے بھی کہانی چرا سکتا تھا—

اسی لیے بھوکا ایتھوپیا کے پیش لفظ میں، میں نے پہلی بار اپنے خیالات کا اظہار یوں کیا—

''دوست پوچھتے ہیں...... اتنا زیادہ کیوں لکھتے ہو سوچتا ہوں انہیں کیا جواب دوں؟ کبھی کبھی لگتا ہے کسی نظریاتی تبدیلی کا خواہاں ہے، میرے اندر کا تخلیق کار کچھ نیا چاہتا ہے۔ اور اس نئے کے لیے بھٹکتا رہتا ہے۔ اس نظریاتی تبدیلی سے زندگی کے کتنے ہی موڑ پر لکھنے کے زاویے بدلے۔ اس طرف چلو، نہیں اس طرح۔

آرہ۔ آرہ شہر کا آبائی مکان، مکان کی ایک ٹوٹی پھوٹی سی چھت سے جھانکتا تاحدِ نظر نیلگوں آسمان کا سمندر، اور سمندر میں بکھرے پڑے تارے، اور ان میں سناٹے میں صرف ایک تارہ، دلی کی بھاگم بھاگ زندگی میں میرے احساس میرے جذبات سب مجھ سے دور ہوتے جارہے تھے۔ آہستہ آہستہ مشینی ہوا جارہا تھا— ظاہر ہے اسی مشینی ہونے کا اثر میرے ادب پر بھی پڑا تھا۔ یہاں زندگی چٹان کی طرح سخت تھی۔ چھوٹے سے شہر میں کچھ نیا کرنے کا احساس اچانک آپ کو ہیرو بنا دیتا ہے۔ لیکن یہاں تو قدم قدم پر ہزاروں لاکھوں، ہیرے بیکار پڑے تھے۔ جنہیں کوئی پوچھنے والا بھی نہ تھا—

''تم کون ہو، اسلیم شیرازی؟''

خود کو دریافت کرنے والے راستے لہولہان پڑے تھے۔ دلی آنے کے بعد شاید سب سے پہلی کہانی میں نے بچھوگھاٹی لکھی تھی۔ سپنے کیا ایسے ٹوٹتے ہیں۔ پنجابی شاعر پاش، کی کویتا جیسے میرے اندر اندر اتر گئی تھی—

'سب سے خطرناک ہوتا ہے ہمارے سپنوں کا مرجانا'

چھوٹے سے شہر میں جو سپنے دیکھے تھے، مخمل و کمخواب کا بستر، ریشم کا تھال، شہزادوں جیسے بچے— سپنے جیسے ایک دم سے کھو گئے تھے۔

''میرے بچے کیسے ہوں گے؟ ویسے ہی نا...... جیسے خوابوں میں نظر آتے ہیں۔ جیسے پریوں کے دیس کے بچے ہوتے ہیں۔ داخل ہونے تک کتنے ہی ہاتھ پیشانیوں مگر— بچھوگھاٹی

بچھوگاٹی میں میں نے ۱۹۸۷ میں لکھی۔ اور یہ ۱۹۸۹ کے آج کل میں چھپی۔ یہ کہانی میرے ادبی کیریئر کے لیے میل کا پتھر ثابت ہوئی، ادبی حلقوں میں اسے کافی پسند کیا گیا۔ میرے لیے اہم بات یہ تھی کہ میں اپنے آپ کو بدلا بدلا سا محسوس کرنے لگا تھا— آئیڈیالوجی کی سطح پر بھی— ۸۰ کے آس پاس جس جدیدیت نے میرے اندر شترمرغ کی طرح خاموش سے اپنی گردن نکالی تھی، ایک بار پھر کسی آنے والی آندھی کے زیراثر دوبارہ اس نے ریت میں منہ چھپا لیا تھا—

میری کہانیوں کا پہلا مجموعہ بھوکا ایتھوپیا تھا— بھوکا ایتھوپیا میں میری ۲۳ کہانیاں شامل تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر کہانیاں اپنے عہد اور سلگتے مسائل کی کہانیاں تھیں— آنکھیں کھولنے کے بعد لگاتار ہونے والے فرقہ وارانہ فسادات مجھے متاثر کرتے آئے تھے۔ اس مجموعہ کی زیادہ کہانیاں اسی فساد کی دین تھیں۔ مرگ نینی نے کہا، ہجرت، مت روسا لگ رام، ہم خوشبو خریدیں گے،

مہاندی، تحفظ، جلاوطن، ہندستانی، دہشت کیوں ہے، کتناوش، سور باڑی، وغیرہ۔—

تبدیلیوں کے اس نئے دھویں میں، میں خود سے سوال کرتا تھا، اور اپنی کہانیوں سے جواب مانگتا تھا۔ کچھ کہانیوں کے اقتباس دیکھئے۔

''میں ہارنے کیوں لگا ہوں۔ یہ سوال اکثر اپنے آپ سے کرتا ہوں اور کوئی جواب نہیں سوجھتا، شاید اس لیے کہ اب خواب دیکھنے کی عمر نکل گئی۔ مگر یہ تو کوئی جواب نہیں ہوا۔ سچ کے لیے لڑنے کی طاقت تو ہر عمر میں ہونی چاہئے۔ پھر میں ہارنے کیوں لگا ہوں؟ — میں ہارا نہیں ہوں کامریڈ۔

کہانیوں کا دوسرا مجموعہ منڈی ۹۷ میں شائع ہوا۔ اس طرح دس سال کے گیپ کے بعد یہ مجموعہ منظر عام پر آیا تھا۔ تیسرا مجموعہ غلام بخش ۹۸ میں شائع ہوا۔

بھوکا ایتھوپیا سے منڈی تک، میرے اندر کافی حد تک نظریاتی بدلاؤ آ چکے تھے منڈی کی شروعاتی دس کہانیاں ہر اعتبار سے میرے مزاج اور آئیڈیا لوجی سے مختلف تھیں— اصل واقعہ کی زیراکس کاپی، ترلورشتے یہاں یہاں ٹوٹتے ہیں، ٹیلی فون، مادام ایلیا کو جاننا ضروری نہیں ہے، بھنوری میں ایلیس، مجھے جانوروں سے بھوتوں سے پیار کرنے دو، میں نے اپنے اسلوب کو بھی بہت حد تک بدل دیا تھا— منڈی میں احساس کی زیریں لہریں حاوی تھیں تو غلام بخش میں کرداراور واقعات پر زور دیے گئے تھے—

منڈی میں میں نے اپنے نقطہ نظر کی وضاحت کچھ یوں کی تھیں۔
''میں نے اپنے بچے کی آنکھوں میں دیکھی ہے۔
مسکراہٹ، شرارت، زندگی
زندگی اور صرف زندگی
جس میں خمار ہے، نشہ اور تازگی
نئی کہانی اسی سے جنمے گی، اسی مسکراہٹ سے
نئی کہانی کسی بغاوت کی کوکھ سے نہیں جنمے گی
وہ جنمے گی اسی زندگی سے
سرشار، بہت ساری خوبصورت غلط فہمیوں،
اور ایک خاص طرح کے بھرم کے ساتھ

—منڈی (نئی کہانیاں)

غلام بخش کو میں نے جان بوجھ کر ٹوبہ ٹیک سنگھ کے نام منسوب کیا غلام غلام بخش محض ہندستانی مسلمانوں کے درد سے گزرنے والی کہانی نہیں تھی کیوں کہ اس طرح کی کہانیاں ایک دو نہیں بلکہ میں پچاس سے زیادہ لکھ چکا تھا— وہی شک کی فضا، وہی ہر بار اسکول سے لے کر عام زندگی میں ہونے والا سلوک— وہی جن سنگھ، بی جے پی اور آر ایس ایس۔ اب مسلمانوں کی جانب سے ہونے والے ایک سنسنی خیز اعلان کی ضرورت تھی۔ اور میں نے غلام بخش کے کردار کے حوالے سے یہ اعلان کرتے ہوئے کوئی ہچک محسوس نہیں کی۔

میں دھیرے سے مسکرایا۔ ''مرا بھی کم بخت تو اپنے اسی باپ دادا والے پرانے گھر میں۔ ایسا کیوں کر ہوا، اس کا مطلب بتا سکتے ہیں آپ؟''

میں نے غور کیا۔ نوین بھائی کے چہرے کا مانس ذرا سا کھنچ گیا تھا۔

—غلام بخش

میں نے ادب میں کرداروں کو جیا ہے۔ لیکن غصہ تب آتا ہے جب بار بار اردو میں یہ باتیں سننے کو ملتی ہیں کہ اردو میں کردار نگاری نہیں ہو رہی ہے۔ نئے ادب میں کوئی بھی زندہ جیتا جاگتا کردار نہیں ہے— پڑھنے والے اپنے دائرے کو محدود کرلیں تو ایسے لوگوں سے مجھے کوئی شکایت نہیں ہے۔ مگر مجھے علم ہے کہ ذوقی کو پڑھنے والا یہ شکایت کبھی نہیں کرے گا کہ اس کا جیتے جاگتے زندہ کرداروں سے واسطہ نہیں پڑا ہے— کردار میرے نزدیک ہوا میں معلق نہیں ہیں۔ میں انہیں محض ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر لکھنے کی حد تک گوارہ نہیں کر سکتا۔ میں ان کی موت پر سوسو آنسو بھی بہاتا ہوں سب سے پہلے غلام بخش کا تذکرہ کرتا ہوں— یہ کردار میرے ذہن میں کیسے آیا—

بہت ممکن ہے کہ آپ اسے بار بار بھی دیکھتے۔ تب بھی کوئی خاص بات اس میں آپ کو نظر نہیں آتی۔ لیکن پہلی بار میں ہی غلام بخش مجھے اپنی طرف متوجہ کرنے میں کامیاب رہا تھا۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے، تب ہلکی ہلکی سردیاں پڑنی شروع ہوئی تھیں۔ ۱۹۸۶ کا زمانہ رہا ہوگا۔ نومبر یا دسمبر کا مہینہ — میرے بدن پر ایک پرانا کوٹ تھا۔ پرانے کوٹ میں کتنی ہی پرانی یادیں بسی تھیں— تیز تیز چلتے ہوئے کوٹ کے دونوں حصے جھولنے لگتے تھے۔ آصف علی روڈ پر اسٹار پاکٹ بکس کا دفتر تھا۔ میرے ہاتھوں میں ناول کا مسودہ تھا۔ دروازہ پار کرتے ہی کوٹ کا ایک حصہ دروازہ کی کنڈی میں پھنس گیا۔ جلد بازی میں نکالنے کی کوشش میں، میں ایک شخص سے جا ٹکرایا— مگر یہ کیا وہ شخص اپنی ہی دھن میں مست تھا۔ نہ اس نے میری طرف دیکھا۔ نہ ہنسا، نہ غصہ ہوا، وہ بس، کچھ بڑبڑاتا ہوا مسکرائے جا رہا تھا۔

پاگل ہے—

میں نے دل میں سوچا۔ دوبارہ اس کی طرف دیکھا۔ مگر اسے کسی کی پرواہ نہیں تھی۔ وہ ایسے ہی بڑبڑائے جا رہا تھا۔ بڑبڑاتا ہوا کبھی کبھی ہنسنے بھی لگتا۔ اسے اس بات کا احساس بھی نہیں تھا کہ کوئی اسے بغور دیکھ رہا ہے۔ بیچارہ غلام بخش لیکن یہ نام تو میری اپنی ایجاد تھی۔

مجھے پتہ بھی نہیں چلا۔ وہ ایک دم سے اچانک میرے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا..... ''مجھے لکھو۔ تمہیں مجھے لکھنا ہی ہوگا—''

مجھے کچھ چیزیں پاگل کر دیتی ہیں۔ کبھی کوئی البیلا سا قصہ۔ کوئی دلچسپ سی کہانی اور شاید ہمیشہ سے ہی ایسا ہوتا آیا ہے کہ کوئی کوئی کردار آلتی پالتی مار کر میرے سامنے بیٹھ جاتا ہے..... مجھے لکھو......

مجھے ان لوگوں پر رشک آتا ہے جو صرف نئے نئے کردار ہی نہیں گڑھتے بلکہ اپنے کرداروں کے بارے میں اس طرح کی باتیں کرتے ہیں جیسے وہ محض فرضی کردار نہ ہوں، بلکہ چلتے پھرتے آدمی ہوں...... زندہ مخلوق ہوں......

ابھی کچھ دنوں پہلے میں The fragrance of guava پڑھ رہا تھا۔ مارکیز نے اس کتاب میں اپنی کہانیوں اور کرداروں سے متعلق ایسے ایسے نکات پر گفتگو کی ہے، اس پر رشک کرنے کو جی چاہتا ہے۔ کہانیوں میں در آئی بہت چھوٹی چھوٹی سی چیزیں، واقعات، مثلاً گھر کا کوئی شخص کہانی کا کردار کیسے بنا یا وہ اس کردار میں فٹ نہیں ہو رہا تھا مگر کردار کے لیے اسی کا سراپا نقش و نگار اور تیور کی ضرورت تھی۔ پھر یہ کیسے ممکن ہوا۔ آس پاس گھومتا ہوا کوئی آدمی، رشتے دار، عزیز، دوست، شناسا، یوں ایک دم سے کہانی کا کردار نہیں بن جاتا۔ ہاں، کبھی کبھی وہ یوں بھی کہانی میں سما جاتا ہے کہ کہانی کا ہی ایک حصہ لگتا ہے اور کبھی کبھی محض ایک کردار کو تین چار کرداروں سے ''بھڑانا'' پڑتا ہے، تب جا کر ایک دلچسپ کردار کھڑا ہو پاتا ہے۔

یہاں میں خصوصی طور پر قارئین کے لیے The fragrance of guava یعنی امرود کی مہک سے وہ دلچسپ اقتباسات پیش کرنا چاہتا ہوں، جسے پلینو اپولیو فیدوزا نے مارکیز سے ہونے والے طویل مکالمے کے بعد ترتیب دیا تھا——

میری تحریروں میں وہ واحد کردار (پتوں کا طوفان) جو میرے نانا سے مشابہت رکھتا ہے۔ بے نام کرنل ہے۔ میرے نانا کی ایک آنکھ ایسے واقعے میں ضائع ہو گئی تھی جسے ناول میں شامل کرنا مجھے ضرورت سے زیادہ ڈرامائی محسوس ہوا۔ وہ اپنے دفتر کی کھڑکی سے ایک خوبصورت سفید گھوڑے کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک انہیں اپنی بائیں آنکھ میں کسی چیز کا احساس ہوا۔ اور وہ بغیر کسی درد کے اپنی بینائی کھو بیٹھے۔ میں نے اس واقعہ کی تکرار اپنے بچپن میں سنی تھی۔ جب میں نے کرنل کے کردار کو رنگ دینا شروع کیا تو اس میں جوں کا توں نانا کا رنگ آنے تھا۔ ہاں، یہ اور بات ہے کہ ناول میں کرنل اندھا نہیں بلکہ ایک ٹانگ سے لنگڑا ہے۔ اور میں نے یہ دکھایا کہ اس کا لنگڑا پن ایک جنگ میں زخمی ہونے کا نتیجہ ہے۔

One hundred years of solitude یعنی تنہائی کے سو سال میں کرنل کا کردار میرے ذہن میں میں نانا کا تصور کے قطعی برعکس ہے۔ نانا بھاری بھر کم تھے۔ ان کی رنگت سرخی مائل تھی۔ اور ان جیسا کھانے کا شائق میں نے پوری زندگی میں کوئی اور نہیں دیکھا۔ ان کی جنسی اشتہا بھی اسی درجے کی تھی، جیسا کہ مجھے بعد میں معلوم ہوا۔ کرنل کے برخلاف جنرل رافیل کا کردار میرے نانا سے زیادہ میل کھاتا ہے۔ بیشک میں نے جنرل کو کبھی نہیں دیکھا۔ مگر نانی نے مجھے بتایا کہ جنرل جیسا ایک آدمی نانا کے دفتر میں تھا۔

Chronicle of a death foretold ایک پیش گفتہ موت کی روداد سے پہلے کسی کتاب میں کوئی نسوانی کردار میری ماں سے مشابہت نہیں رکھتا۔ تنہائی کے سو سال کی ارسلا اگوار ان کردار میں ماں کے چند ایک خدوخال موجود ہیں۔ لیکن اس کردار میں میری جان پہچان کی اور بھی بہت سی عورتوں کی خصوصیات ہیں۔ دراصل ارسلا میرے لیے مثالی عورت کی حیثیت رکھتی ہے۔

ناول لکھنے کے دوران اس بات کا مجھے احساس رہتا ہے کہ کس کردار کے ساتھ کیا پیش آنے والا ہے۔ لیکن ناول لکھنے کے عمل میں غیر متوقع واقعات پیش آ جاتے ہیں۔ کرنل اور یلیانو، بوئندیا کے بارے میں مجھے پہلا خیال یہ آیا تھا کہ وہ خانہ جنگی کا ایک پرانا سورما ہوگا، جس کی موت ایک درخت کے نیچے پیشاب کرتے ہوئے واقع ہوگی—— جبکہ اس کی موت درحقیقت واقعی ہوئی تو یہ میرے لیے ایک انتہائی تکلیف دہ مرحلہ تھا۔ میں یہ تو جانتا تھا کہ کسی نہ کسی مقام پر اسے موت کے گھاٹ اتارنا ہی ہوگا لیکن مجھ میں اس کی ہمت نہیں تھی—— کرنل اس وقت تک خاصا معمر ہو چکا تھا۔ تب ایک سہ پہر میں نے سوچا۔ اب اس کا وقت آ گیا ہے۔ مجھے اس کو ختم کرنا ہی پڑا۔ جب یہ باب مکمل ہوا تو میں لرزتا ہوا مکان کی دوسری منزل پر مرسیدس کے پاس گیا۔ اس نے میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہی اندازہ کر لیا کہ کیا ہو گیا ہے۔ کرنل مر گیا، اس نے پوچھا۔ میں بستر پر لیٹ گیا اور دو گھنٹے تک روتا رہا۔

''ذبح'' کا عبدل سقہ ہو، یا ''بیان'' کا بالمکند شرما جوش، میں ہارا نہیں ہوں کا مریڈ کا ونے بہاری ہو—— سپنے دیکھنے والا مسیتا، ہو—— یا ہندو پریوار میں جنم لینے والی مرگ نینی—— میں ہر بار اپنے کرداروں کے ساتھ رہا ہوں۔ جیا ہوں اور مرا ہوں——

میں نے اپنی کہانیوں کا جائزہ لینا اسی لیے مناسب سمجھا کہ میری کہانیاں کیسی کیسی الہڑ، شوخ اور مستانہ لہروں سے گزری ہیں—— کیسے کیسے انوکھے واقعات میری زندگی کے ساتھ پیش آئے اور ان سب نے قدم قدم پر مجھے اور میری کہانیوں کو نئی تبدیلیوں سے روشناس کرایا۔

## اہلِ ثروت سے

ضرورت سے زائد ہے جو مال و دولت
نہیں، بالیقیں، وہ تمہارا نہیں ہے
وہ دراصل محروم و سائل کا حق ہے
تو کیوں اُن کو دینا گوارا نہیں ہے

**حافظ محمد احمد** (راولپنڈی)

القرآن:
(سورۃ البقرہ، آیت ۲۱۹، سورۃ الذاریات، آیت ۱۹)

# سانسوں کے زیروبم

ڈاکٹر منظر اعجاز
(پٹنہ، بھارت)

مشرف عالم ذوقی نے مشرق ومغرب کی شعریات کے مطالعے اور اکتسابات سے واقعات وواردات اور مسائل حیات وکائنات کے تجزیے کی بصیرت ہی حاصل نہیں کی ہے، ان کے فنی اظہار کا شعور بھی حاصل کیا ہے۔ اس کا احساس نہ صرف ان کے اکثر افسانوں بلکہ ناولوں سے بھی ہوتا ہے اور جہاں تک ناولوں کا تعلق ہے، ان میں ''لے سانس بھی آہستہ'' اپنے موضوعات ومسائل، معنوی جہات اور صوری تشکیل کے لحاظ سے بھی ایک منفرد اور ممتاز فنی کارنامہ ہے۔ اس سے مشرف کے امتیاز کے نقوش مزید گہرے اور روشن ہوئے ہیں۔

مشرف کا کینوس بہت پھیلا ہوا ہے۔ ان کے موضوعات متنوع اور مسائل نہایت ہی پیچیدہ اور بے شمار ہیں۔ بلکہ ایک انبار ہے مسائل کا جسے مشرف نے فلسفہ بنادیا ہے — ان معنوں میں کہ فلسفے مسائل کی آگہی دیتے ہیں، ان کا حل نہیں دیتے مگر باضابطہ غور وفکر کا ایک سلسلہ قائم کردیتے ہیں۔ گویا ان کے مقدمات فلسفیانہ ہوتے ہیں لیکن ان کی پیش کش فنکارانہ ہوتی ہے۔ تکنیک اکثر چونکانے والی ہوتی ہے — اس ناول میں خصوصیت کے ساتھ یہ امتیاز نظر آتا ہے۔ تمہید کے طور پر ہرمن ھیسے کے ڈیمیان سے ماخوذ اقتباس پیش کیا گیا ہے جس کا یہ آخری جملہ کلیدی اہمیت کا حامل ہے:۔

''ارتقا کے راستے میں اخلاقیات کا کوئی دخل نہیں۔''

اور پھر مختصر سے یہ تین جملے:۔

''کبھی کبھی قدرت کے آگے/
ہم بیحد کمزور ہوجاتے ہیں/
اور سپر ڈال دیتے ہیں''

ان عبارتوں سے یہ اشارے ملتے ہیں کہ یہ انسانی مقدرات کی ستم ظریفی کی داستان یا قدرت کے جبر کی کہانی ہے جس میں تہذیب انسانی کے ارتقا کی راہیں اخلاقیات کی دھجیوں سے اٹی پڑی ہیں۔

اردو میں بھی بہت سارے افسانے اور ناول لکھے گئے ہیں سنسنی خیز اور رونگٹے کھڑے کردینے والے مگر ''لے سانس بھی آہستہ'' اپنی کیفیت وکمیت کے اعتبار سے ممتاز، منفرد اور جداگانہ حیثیت کا حامل ہے۔ اس کی سنسنی خیزی میں برف زار کی طوفانی ہوا کا وہ جھونکا ہے جس سے رگ احساس شل اور روح منجمد سی ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ مشرف عالم ذوقی نے اپنے فکری سروکار اور فنی طریق کار سے اس ناول کو مذاہب، فلسفے اور حکمتوں کی ناکامیوں کا نوحہ بنادیا ہے۔ یہ ناول بنیادی طور پر جدیدیت کی فکری روایت اور فلسفیانہ اساس سے ہمکنار ہے جس کا نتیجہ حزن وملال سے پُر اور یاس انگیز ہے۔

اس ناول کا قصہ فلیش بیک کی تکنیک میں بیان کیا گیا ہے۔ قصے کے راوی عبدالرحمٰن کاردار ہیں جن کا آبائی تعلق بلند شہر سے ہے۔ رؤسائے بلند شہر میں کاردار خاندان کے علاوہ نور محمد کا بھی ایک خاندان ہے۔ ان دونوں خاندانوں کے تار حریر دورنگ (سفید وسیاہ دھاگوں) سے اس قصے کا بنیادی پلاٹ بنا گیا ہے اس میں حیرت وحسرت کی جھلک نمایاں ہے۔ حالانکہ بظاہر قصہ نور محمد ہی کے خاندان سے متعلق ہے۔

عبدالرحمٰن کاردار، مایوسی ومحرومی اور تنہائی ونارسائی کا زمانہ بلند شہر سے دور ایک پہاڑی سلسلے پر گزار رہے ہیں جہاں تھوڑے تھوڑے دنوں کے لیے ان کی سترہ سالہ پوتی سارا کاردار، جوان کے تنہا بیٹے ڈاکٹر شان الرحمٰن کاردار کی تنہا اولاد ہے، آجاتی ہے۔ ملازم اور ملازمہ ہیں۔ یہیں پروفیسر نیلے بھی اپنے آبائی علاقہ سے دور اپنی بیوی کے ساتھ وقت گزار رہے ہیں۔ ان کے بال بچے بھی اس عمر میں ان سے، ان کی آنکھوں سے دور ہیں۔ پروفیسر نیلے یہاں عبدالرحمٰن کاردار کے پڑوسی بھی ہیں اور دوست بھی — دونوں اکثر پہاڑی سلسلے پر ایک ساتھ گھومتے پھرتے ہیں حالات سابقہ وحاضرہ پر تبصرے کرتے ہیں خود اپنے حال واحوال ایک دوسرے کے ساتھ شیئر کرتے ہیں۔ ایسے ہی کسی موقع پر عبدالرحمٰن کاردار کو یاد آتا ہے جب نادرہ ان کی حویلی میں آئی تھی۔ سفیان ماموں کی بیٹی نادرہ۔ نادرہ کے سحر آنگیں حسن سے حویلی طلسم ہوش ربا بن گئی تھی جو پہلے آسیب زدہ سمجھی جاتی تھی۔ اپنے ان دنوں کے احساسات وجذبات کا اظہار عبدالرحمٰن کاردار اس طرح کرتے ہیں۔

''لمحے ٹھہر گئے تھے۔ یہ آسیبی حویلی اچانک طلسم ہوش ربا میں تبدیل ہوگئی — ایک ایسی ساحرہ جس کی آنکھوں کی پراسرار چمک نے اس وقت مجھے کسی بے جان بت میں تبدیل کردیا تھا۔''

لیکن یہ سحر کار حسن عبدالرحمٰن کاردار کے اندر ایسا انقلاب پیدا نہ کرسکا کہ وہ سفیان ماموں سے اپنے لیے نادرہ کا رشتہ مانگ لیتے۔ نادرہ کی شادی نور محمد سے ہوگئی اور اس طرح ایک زن بے زبان کی چاہتوں کا خون ہوگیا۔ یعنی روایتی اخلاقیات کی پابندی اور پاسداری نے معاشرتی نظام میں ایک طرح کی بیماری پیدا کردی۔ پھر اس بیمار نظام میں پیدا ہونے والے بہت سے بیمار بچوں کی طرح نادرہ نے بھی ذہنی طور پر معذور ایک بچی نگار کو جنم دیا۔ اصل کہانی اسی کے ساتھ جنم لیتی ہے۔ اب تک کی دنیا کی سب سے بھیانک کہانی — یا سب سے بدترین کہانی۔ دو چہروں کے تعاون سے لکھی جانے والی کہانی۔ پہلا چہرہ ایک مرد کا تھا۔ ایک بے حد معصوم سا مرد اور دوسرا چہرہ ایک چھوٹی سی معصوم بچی کا تھا۔ بے حد معصوم سی چھوٹی سی بچی کا...... بے حد معصوم سا مرد کوئی اور نہیں، نور محمد ہے اور ایک چھوٹی سی معصوم سی بچی، بے حد معصوم سی بچی، نور محمد کی بیٹی اور نادرہ کی بیٹی نگار ہے۔ یہ دونوں کردار ایسی بدنصیبی کے شکار ہوجاتے ہیں جن کے تصور سے روح کانپ اٹھتی ہے۔

اس ناول میں تجسس اور تحیر کے بے شمار عناصر قدم قدم پر دامن نگاہ کو تھام لیتے ہیں اور اس جہان سے سرسری گزرنے نہیں دیتے۔ ہر جا جہان دیگر کی نیرنگیاں دکھائی دیتی ہیں جن کا تعلق واقعات و واردات ہی سے نہیں بلکہ فکر و فن کی تخلیقی قوت سے بھی ہے۔

ہمارے تجربے میں معذور زندگی کا ایسا واقعاتی تناظر بھی ہے جس کے لیے MERCY DEATH کا نہ صرف فارمولا تیار کیا گیا بلکہ اس کے نفاذ کے لیے عدالتِ عالیہ سے گزارش بھی کی گئی لیکن عدالت نے اس کی منظوری نہیں دی، عدالت کا یہ بھی ایک تاریخ ساز فیصلہ تھا۔

اب ایسی زندگی جو موت سے بھی بدتر ہو اور اسے مرنے کی اجازت بھی نہ دی جائے تو گویا یہ بھی بے رحمی ہی کی ایک مثال ہے۔ عذاب الٰہی کا یہ نزول کسی ایک فرد پر نہیں بلکہ معاشرے کے متعدد افراد پر ہے اور دوسرے لفظوں میں آج کا انسانی معاشرہ ایسے عذاب میں مبتلا ہے۔ لیکن اس ناول میں نور محمد جس عذاب میں مبتلا ہے اس کی نوعیت سارے جہان سے مختلف ہے، اس کی کیفیت سارے زمانے سے جدا ہے۔

باپ بیٹی کے مقدس رشتے کی پامالی کے متعدد واقعات تاریخ کا بھی جزو اور ادب کا بھی حصہ بنے ہیں۔ لیکن یہاں نگار اور نور محمد کے رشتے کی پامالی کی نوعیت ایسی ہے جو تاریخ اور تخیل کی ہمکاری سے ایسی حیثیت اختیار کر گئی ہے جو فن کو شاہکار کے مرتبے تک پہنچا دیتی ہے، لیکن کہانی کے آغاز سے تکمیل تک عبدالرحمٰن کا ردار نا قابل فراموش کردار کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں کیونکہ ذہنی طور پر معذور نگار کی معذوری کا اصل سبب عبدالرحمٰن کا ردار سے تعلق سے نادرہ کی نفسیاتی اور جنسی گھٹن بھی ہو سکتی ہے۔ نگار پیدا ہوتی ہے تو اس بیماری کے ساتھ کہ اس پر رونے کے دورے پڑتے ہیں اور جب یہ دورہ پڑتا ہے تو لگتا ہے روتے روتے اس کا دم گھٹ جائے گا، وہ مر جائے گا۔ نگار کو جنم دینے کے بعد نادرہ بھی صحت مند نہیں رہتی۔ اس کی بیماری کے دوران عبدالرحمٰن کا ردار جب ملنے آتے ہیں تو وہ اپنے دل کا حال سنا ڈالتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے کہ زخم محبت اور درد جدائی سے ابھی بھی اس کا سینہ چھلنی بنا ہوا ہے۔ اور بالآخر نادرہ اپنے پس ماندگان میں نور محمد کے علاوہ سات سال کی نگار کو چھوڑ کر مر جاتی ہے۔ نگار جیسے بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ رونے کے علاوہ حوائج ضروریہ، یہاں تک کہ اپنے کپڑے لتے اور اپنے جسم تک کا کوئی خیال نہیں رہتا۔ آیا کے طور پر بانو کچھ دنوں تک خدمات انجام دیتی ہے لیکن وہ بھی بالآخر اوب جاتی ہے اور نتیجے کے طور پر اس کی نگہداشت کی تمام تر ذمہ داریاں نور محمد کو بحیثیت باپ نہیں، بطور ماں قبول کرنی پڑتی ہیں۔ وہ نادرہ سے اس کا وعدہ کر چکا ہے اور ہنوز پابند عہد ہے۔ کیونکہ نگار اس کی محبت، نادرہ کی تنہا نشانی ہے۔

اس قصے کا المیہ یہ بھی ہے کہ نور محمد کی چاہت نادرہ اور نادرہ کی چاہت عبدالرحمٰن کا ردار ہیں۔ پس منظر سے ابھرنے والے واقعے کی المناکی یہ ہے کہ نور محمد کی والدہ اور نادرہ کی والدہ بھی بے وقت موت کی آغوش میں پناہ لے لیتی ہیں۔ ماں کے کھو جانے کا غم نور محمد اور نادرہ دونوں کو ہے۔ یہ غم مشترک ہے جو دونوں کو ایک دوسرے سے قریب کر دیتا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے ہمدرد و غم گسار بن جاتے ہیں۔ نادرہ کے اس رویے سے عبدالرحمٰن کا ردار اس غلط فہمی میں مبتلا ہوتے ہیں کہ نادرہ نور کو چاہتی ہے۔ چنانچہ اپنی چاہتوں کو قربان کر کے اس کوشش میں مصرف ہو جاتے ہیں کہ نادرہ نور سے بیاہ دی جائے۔ سفیان ماموں نادرہ کی موت کے بعد خود اس کوشش میں ہیں کہ اپنی دوسری شادی کر لیں لیکن اس کے پہلے وہ نادرہ کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جانا چاہتے ہیں۔ نادرہ اپنے باپ کے اس رویے سے بددلی کا شکار ہو جاتی ہے۔ نادرہ کو عبدالرحمٰن کا ردار کی سرد مہری بھی کھلتی ہے۔ لیکن روایتی اخلاقیات کے تقاضے کے تحت اس کی زبان پر مہر ہی لگی رہتی ہے حالانکہ جب وہ بستر علالت بلکہ بستر موت پر ہوتی ہے اور عبدالرحمٰن کا ردار اس سے ملنے جاتے ہیں تو اس کی زبان پر حرف شکایت ہی نہیں آتے بلکہ زبان ہی برہنہ گفتار ہو جاتی ہے۔ ہجر کا غم دونوں کو ستاتا ہے۔ لیکن نادرہ اس غم سے نڈھال ہو کر بالآخر دم توڑ دیتی ہے۔ نور محمد نادرہ کے غم کو نادرہ کی نشانی نگار کے معذور وجود اور اس کی شب و روز کی خدمت سے ہلکا کرنا چاہتا ہے۔ لیکن نصیب کی بات کہ یہ غم شب و روز بھاری ہی ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ ناقابل برداشت ہو جاتا ہے۔ لیکن زندگی بہرحال زندگی ہے جو زہر بھی بن جائے تو پینا ہی پڑتا ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ یہ زندگی نور محمد کی ہے۔ یہ جینا نور محمد کا ہے۔ زندگی کا زہر بھی اسی کو پینا پڑتا ہے۔ لیکن اس ناول کی یاس انگیز فضا اور گھٹن بھرے ماحول میں کبھی آہستہ کبھی تیز تیز سانس لیتا ہوا کردار نور محمد زندگی کے زہر کو گھونٹ گھونٹ اور گھٹ گھٹ کر پیتے پیتے بالآخر بے تکلفی کے ساتھ پینے لگتا ہے، گویا زندگی کی ولولہ انگیزیاں لوٹ آتی ہیں۔ عبدالرحمٰن کا ردار شدت کے ساتھ اس بات کو محسوس کرتے ہیں کہ نور محمد کا روپ بہروپ میں ڈھل چکا ہوتا ہے۔ لیکن یہ ہوتا تب ہے جب نور محمد نگار کے ساتھ شہر سے ہجرت کرتا ہے اور ایک گاؤں میں جا کر بس جاتا ہے ایک پرانی تہذیب نیا قالب اختیار کرتی ہے۔ بطور ناول نگار یا فنکار مشرف عالم ذوقی کے فکری و فنی زاویے سے قطع نظر ایک قاری کے ذہن میں یہ سوال ضرور ابھرتا ہے کہ کیا ناول نگار شہر کی آلودگی پر گاؤں کی آب و ہوا کو ترجیح دینا چاہتا ہے۔ کیا گاؤں کی آب و ہوا آج بھی ایسی راحت بخش اور جانفزا ہے؟

میں تو قدرے ضخیم اس ناول کے مطالعے کے دوران اکثر یہ محسوس کرتا رہا ہوں کہ ناول کے توضیحی بیانیہ کے مقابلے میں یہاں ہمارا واسطہ افسانویت سے پڑتا ہے۔ اور افسانوی خصوصیات میں تجسس اور تحیر کے عناصر و عوامل کے علاوہ کسی کڑی کا کسی خوبصورت موڑ پر گم ہو جانا بھی شامل ہے۔ اور گم شدہ کڑیوں کی تلاش جس متجسسانہ تشنگی میں مبتلا کرتی ہے، اس کا تعلق یقیناً فن کاری کے محاسن سے ہے۔

نادرہ، نگار کو سات سال کی عمر میں چھوڑ کر مر جاتی ہے نور محمد دس سال تک شہر ہی میں نگار کو جھیلتا ہے۔ اس دوران نور محمد کی نفسیاتی الجھنیں، طرز عمل، اور اسلوب بیان پر مشرف عالم ذوقی نے جو بحیثیت ناول نگار توجہ صرف کی ہے۔ فنی شعور کی پختگی

اورفنکاری کا جومظاہرہ کیا ہے۔ ناقدری ہوگی اگر اسے نظرانداز کردیا جائے۔

عبدالرحمٰن کا کردار بحیثیت راوی ایک موقع پر نورمحمد کے بیان اور اپنے مشورے کو دہراتے ہیں:

''نورمحمد بتا رہا تھا۔۔۔ 'مجھے رات اور رات کے احساس سے ڈر لگتا ہے بھیا۔۔۔ جب وہ جسم کے کپڑے پھینک کر بیہوشی کے عالم میں اپنا جسم میرے جسم پر ڈال دیتی ہے...... میں اسے مشکل سے الگ کرتا ہوں۔ بالکنی میں آجاتا ہوں۔ ساری رات ٹہلتا رہتا ہوں...... آپ بتا سکتے ہیں بھیا...... یہ کیا ہے۔ یہ کیسا امتحان ہے؟ اور یہ امتحان مجھ سے ہی کیوں لیا جا رہا ہے......'

'اب یہ سب سوچنا بند کرو نورمحمد۔ جتنا سوچو گے، اتنا ہی ذہن پریشان ہوگا۔۔۔ بس یہ سوچو کہ اللہ نے ایک معذور بچی کی ذمہ داری تمہارے سپرد کی ہے اور تم یہ ذمہ داری نبھا رہے ہو......؟

اس نے سر جھکا لیا۔۔۔''

نادرہ کا جب انتقال ہوا تھا، نگار سات سال کی تھی۔ اور ذہنی طور پر معذور تھی۔ اس پیچیدہ صورت حال اور عمومی معاشرتی اخلاقیات کا تقاضہ تو یہ تھا کہ نورمحمد شادی کر لیتا۔ اپنے لیے نہیں تو کم از کم نگار ہی کے لیے۔ یہی مشورہ خود ایک ہمدرد اور غمگسار ہونے کی حیثیت سے عبدالرحمٰن کا کردار کا بھی تھا۔ لیکن نادرہ کی محبت میں پاگل پن کی حد تک گرفتار نورمحمد کسی بھی صورت میں شادی کی بات سننا تک گوارہ نہیں کرتا تھا۔ غالباً اسے اندیشہ تھا کہ اس کے شادی کر لینے سے نگار کو تکلیف ہوگی۔

یہ وہ واقعی صورت حال ہے جو دوسرے معاشرتی افراد کو بھی مختلف قسم کے اندیشے میں مبتلا کر سکتی ہے۔ اسی صورت حال سے گزرتے ہوئے خود عبدالرحمٰن کا کردار بھی کئی سوالوں میں الجھتے ہیں:۔

''لیکن ایک سوال جو بار بار مجھے پریشان کر رہا تھا کہ کیا اسے کبھی کسی بھی طرح کی جنسی طلب پریشان نہیں کرتی؟

اور اس سے بھی بڑا ایک سوال تھا۔ کیا اس عمر میں جنسی خواہش کا خیال بھی لانا کوئی گناہ ہے؟

کیا کوئی جوان آدمی اپنی جنسی خواہشات کا قتل کر کے زندگی گزار سکتا ہے؟

نادرہ کا جب انتقال ہوا تب اس کی عمر ہی کیا تھی...... نگار صرف سات سال کی تھی۔۔۔ اور اس عمر میں تو جنسی طلب اپنے شباب پر ہوتی ہے۔۔۔ مجھے نورمحمد سے ہمدردی تھی۔۔۔ اپنی جنسی طلب کو سلا کر بیٹی کے لیے پوری زندگی وقف کر دینا کوئی کھیل نہیں۔ لیکن نورمحمد نے یہ کر دکھایا تھا۔۔۔''

مشرف عالم ذوقی کے فنی شعور کی پختگی اور فنکاری کا مظاہرہ غیر روایتی انداز و اسلوب میں ہوا ہے۔ انہوں نے تہذیب و اخلاق کو نئے معنوی تناظر میں دیکھنے اور دکھانے کی کوشش کی ہے تو جنسیات کو مرکزیت عطا کر دی ہے اور اسے عصر حاضر کے آفاق گیر مسئلے کے طور پر پیش کیا ہے۔ لیکن جنسی مسائل کو وہ، خواہ وہ انفرادی ہوں یا اجتماعی، تسلسل کے ساتھ بیان نہیں کرتے۔ اس سلسلے میں اکثر تخلیقی رکاوٹ (Creative interruption) پیدا کر دیتے ہیں۔ اس رکاوٹ کے دوران دوسرے سنجیدہ اور پیچیدہ مسائل قاری کے پیش نظر ہوتے ہیں جن کا بیشتر تعلق ناعاقبت اندیش سیاست اور گھناؤنی صارفیت سے ہوتا ہے ان کے پیدا کردہ محرکات وعوامل سے ہوتا ہے۔ یہاں غور طلب امر یہ بھی ہے کہ عبدالرحمٰن کا کردار یا پروفیسر نیلے اپنے وجود سے کوہ و بیابان میں زندگی کی رمق گھولنے پر کیوں مجبور ہیں جب کہ بہ اعتبار عمر ان کی زندگیاں موت کی سرحدوں کو چھو رہی ہیں۔ دراصل ان کی اولاد اور اولاد کی اولاد بھی قابل لحاظ فاصلے پر اپنی اپنی زندگی اور اس سے گوناگون مسائل میں الجھی ہوئی ہے۔ اس اولڈ ایج میں ان کی حویلیوں میں ان کا پرسان حال کوئی نہیں۔ اور ان کا تہذیبی تعلق اس اقداری نظام سے بھی نہیں جس میں اس عمر کے لوگ اللہ اللہ اور رام نام کے جاپ میں باقی ماندہ عمر تمام کر دیا کرتے تھے۔

یہ ایک تاریخ سچائی ہے کہ تہذیبیں رنگ بدلتی رہتی ہیں اور ان ہی رنگوں سے ارتقا کا رنگ پھوٹتا ہے۔ ان رنگوں کے چھینٹے کا کردار پر بھی پڑے ہیں اور پروفیسر نیلے پر بھی۔ انہیں ان رنگوں کا احساس ہے لیکن وہ اس سے وحشت زدہ نہیں جیسا کہ عبدالرحمٰن کا کردار کے درج ذیل بیان سے واضح ہے:۔

''ایک بار پھر پہاڑ روشن تھے۔۔۔ یا پہاڑ جاگ گئے تھے۔۔۔ آج ہم Family Incest کے موضوع پر گفتگو کر رہے تھے۔۔۔ مرغزاروں کی ہری بھری گھاس نے دھند کا لباس پہن رکھا تھا۔۔۔ پروفیسر نیلے کے پاؤں میں کچھ تکلیف تھی۔ اس لیے آج وہ لاٹھی کے سہارے ٹہل رہے تھے۔۔۔ میں نے انہیں باہر نکلنے سے منع بھی کیا۔۔۔ لیکن انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔۔۔ اس عمر میں آرام کرنے سے ہڈیاں کمزور ہو جاتی ہیں۔ ہم دیر تک جنسی اشتعال انگیزی اور شہوت انگیزی کے موضوع پر گفتگو کرتے رہے۔ بہر حال وہ ان باتوں سے ذرا بھی فکرمند نہیں تھے۔۔۔''

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ بوڑھے اس عمر میں کس قسم کی گفتگو کرنا پسند کرتے ہیں؟ پھر یہ بھی کہ پروفیسر نیلے پر اس قسم کی گفتگو کا ردعمل کیا ہوتا ہے؟ واقعاتی تسلسل میں نہ جانے ایسے کتنے ہی مقامات آتے ہیں جہاں قاری کے ذہن میں اس طرح کے سوالات ابھرتے رہتے ہیں۔ قاری متجسسانہ تشنگی کے مرحلے سے گزرتا رہتا ہے اور اکثر اس کی آنکھیں تحیرات کے عالم سے دوچار ہوتی ہیں۔ معرض التوا میں پڑے ہوئے واقعات وواردات تازہ دم ہو کر گرد سفر جھاڑتے ہوئے پیش نگاہ ہوتے ہیں۔ یہ مسافران واقعات وواردات کبھی سست رو اور کبھی تیز رفتار ہوتے ہیں۔ لیکن جب حلقہ نظر میں آتے ہیں تو ناظر کو ادھر سے ادھر نہیں ہونے دیتے۔ جذب وکشش کا یہ عالم فنی سلیقہ شعاری اور ہنرمندی سے ہی پیدا ہوتا ہے۔

نورمحمد اور نگار کے سلسلے کا واقعہ جس کی کڑی ٹوٹ گئی تھی، آگے بڑھ کر اگلی کڑی سے مل جاتا ہے۔ اور ایک درمیانی کڑی بھی اپنی اگلی پچھلی کڑیوں سے مل جاتی ہے۔ اس درمیانی کڑی کا تعلق انوار سے ہے جو نورمحمد کا رشتہ دار ہے۔ لیکن

بے روزگار ہے۔ نورمحمد اس کا ہمدرد، معاون اور مددگار بن جاتا ہے۔ اور اپنے اسی گھر میں اوپر والے کمرے میں اس کے رہنےسہنے کا انتظام کرتا ہے اور تاکید کر دیتا ہے کہ وہ ہرگز نیچے کا کبھی رخ نہ کرے۔ لیکن جس اندیشہ کے تحت یہ تاکید کی جاتی ہے۔ ہونی کے طور پر وہی حادثہ پیش آتا ہے۔ اس سلسلے میں نورمحمد نے عبدالرحمٰن کاردار کو جو کچھ بتایا ہے۔ کاردار بار دگر اسے بیان کر رہے ہیں:۔

''وہ خلا میں دیکھ رہا تھا......اس کی آنکھیں گہری فکر میں ڈوب گئی تھیں۔

'اس دن......جیسا میں نے آپ کو بتایا......انوار کے بارے میں......'

وہ کہتے کہتے رک گیا تھا— 'اور جب دوسرے دن شام چھ بجے......میں نے تالہ کھولا اور میری بیٹی اپنے کمرے کے باہر برہنہ پڑی تھی—اور یقیناً یہ میرا شک نہیں تھا کہ اس نے کچھ تو بدسلوکی کی کوشش کی تھی— ممکن ہے وہ کسی بہانے نیچے آیا ہو—اور ممکن ہے اس نے میری بیٹی کو دیکھا ہو—اور ممکن ہے اس وقت بھی اسے کپڑوں کا کوئی ہوش نہ ہو— جیسا کہ عام طور پر وہ اپنے لباس سے بے ہوش ہی رہتی ہے......''

قیاسات اور خدشات پر مبنی یہ بیان قدرے طویل ہو جاتا ہے جہاں دست درازی کے شبہے پر یقین کا رنگ چڑھتا چلا جاتا ہے لیکن ایک نیم برہنہ حقیقت کے بیان میں باپ کی زبان برہنہ گفتار نہیں ہوتی:

'' 'میری غلطی یہ تھی کہ میں نے ایک نوجوان، ایک گرم خون پر بھروسہ کیا تھا، جو مجھے نہیں کرنا چاہئے تھا۔ خاص کر ایسے وقت میں جب پوری کوٹھی میں سوائے میری بیٹی کے کوئی نہیں تھا، مجھے اس پر بھروسہ کرنے کا حق ہی نہیں تھا۔ مگر—میں نے بھروسہ کیا اور ممکن ہے اس نے دست درازی کی کوشش کی ہو— دست درازی......''

مشرف عالم ذوقی کا یہ فنکارانہ اسلوب اس لیے بھی قابل لحاظ ہے کہ ایک باپ اپنی معذور بیٹی اور اپنے ایک رشتہ دار نو وارد انوار کے تعلق سے شبہات کا شکار ہے جس میں یقین کا رنگ گھلا ملا ہوا ہے لیکن ایک باپ کی مجبوری ہے کہ وہ یقین کے رنگ کو شبہات کے پردے میں ہی ڈھکا چھپا رہنے دینا چاہتا ہے۔ لیکن وہ اپنے ایک مخلص، ہمدرد اور غمگسار کے آگے اپنے تجربات، اپنے مشاہدات اور اپنے قیاسات کو بے کم و کاست اشارے کنائے میں بیان کر دینا چاہتا ہے۔ نورمحمد ایک لمحے کے لیے رک کر پھر قیاسات پر مبنی اپنے بیان کے سلسلے کو آگے بڑھاتا ہے:

''اور اپنے سامنے ایک انجان آدمی کو پا کر اس پر پھر سے دورہ پڑ گیا ہو—یا ممکن ہے اسکے باوجود......آپ سمجھ رہے ہیں نا بھیا— ایک باپ کی لاچاری اور مجبوری کو سمجھئے......میں شاید اس سے زیادہ واضح الفاظ میں آپ کو نہ سمجھا پاؤں— مگر کچھ ہوا تھا— شاید اس کی چیخ سننے کے بعد بھی ممکن ہے...... اس نے بیٹی کے ہاتھوں کو چھوا ہو—یا پھر...... یہ بھی ممکن ہے کہ وہ بھاگ کھڑا ہوا ہو—لیکن اتنا طے ہے کہ......''

عبدالرحمٰن کاردار کے بیان کے مطابق:

''وہ (نورمحمد) ایک بار پھر خلا میں دیکھ رہا تھا— 'اس نے کچھ اور نہیں کیا ہوگا— اس لیے کہ اس کے ڈرنے، خوفزدہ ہونے کے امکانات زیادہ مضبوط ہیں......مگر اس رات......اس پوری رات......اور اس کے جانے کے بعد کی یہ تین راتیں—وہ رکا...... یہ سب بتانا آسان نہیں ہے۔ اور اس کے لیے پتھر کا کلیجہ چاہئے—''

عبدالرحمٰن نہ جانے کس نفسیات کے شکار ہیں کہ کرید کرید کر نورمحمد سے سب کچھ اگلوا لینا چاہتے ہیں اور نورمحمد بالآخر اقرار کر لیتا ہے کہ نگار کے اندر سیکس جاگ گیا تھا۔ ۱۸ سال کی بچی میں جسے کوئی شعور نہیں تھا، اچانک انوار کی آمد یا موجودگی نے اس کے اندر سیکس کو جگا دیا تھا۔

روتی، بلکتی اور سسکیوں میں ڈوبی ہوئی نورمحمد کی آواز ابھرتی ہے اور واضح طور پر اس کے یہ الفاظ سنائی دیتے ہیں:۔

''وقت اور حالات مجھ سے جو کہانی لکھوا رہے ہیں، میں اس کے لیے قطعی تیار نہیں تھا بھیا— لیکن اب......مجھے بس نگار کی زندگی چاہئے—جب نادرہ کا انتقال ہوا تھا۔ آپ کو یاد ہے، میں نے آپ سے کیا کہا تھا......وہ جو بھی کہے گی کروں گا...... اس کی ہر بات مانوں گا— مگر اسے مرنے نہیں دوں گا......یاد ہے؟'

'ہاں......'

اس رات پہلی بار......

نورمحمد نے نگاہیں پھیر لی تھیں— 'رات کے تین بجے کا وقت ہوگا—وہ دوا کھا کر سو گئی تھی— مجھے بھی نیند آ گئی تھی—اچانک تین بجے کے آس پاس میری نیند کھل گئی...... مجھے جسم میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں...... اچانک مجھے احساس ہوا...... میں نیچے کچھ بھی نہیں پہنے ہوں......کسی نے پائجامے کا ازار بند کھول لیا ہے......میرا پائجامہ اتر چکا ہے...... اور اچانک میں نے دیکھا......

'کیا—؟' میں زور سے چلایا......'کیا دیکھا نورمحمد......'

'یہ نگار تھی...... جو میرے پاؤں کے پاس جھکی ہوئی تھی......اور میرے ننگے جسم کو غور سے دیکھ رہی تھی......اور فقط ان تین دنوں میں......'

وہ مجھ سے کہیں زیادہ زور سے چیخا— 'اس کے اندر سیکس کے مطالبے جاگ گئے ہیں۔''

اس دھماکہ خیز انکشاف سے عبدالرحمٰن کاردار کے اندر بھی کوئی دھماکہ ہوا تھا اور شدت جذبات سے مغلوب ہو کر چیختے ہوئے انہوں نے اپنے دونوں کان بند کر لیے تھے۔

مشرف عالم ذوقی نے اس سنسنی خیز سچویشن کو بھی فنکارانہ مہارت کے ساتھ پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔ کاردار کا سارا جسم پسینے سے تربتر تھا اور سارہ انہیں جگا رہی تھی گویا انہوں نے کوئی بھیانک سا خواب دیکھا تھا۔ سارہ نے بھی یہی سمجھا تھا لیکن اس نے اپنے دادا کو مشکوک نظروں سے دیکھا تھا۔ اسے

محسوس ہوا تھا جیسے اس سے کوئی بات چھپائی جا رہی ہے۔ اس نے اپنے اس خیال کا اظہار بھی براہ راست کر دیا تھا۔ لیکن سارا ہی کیا، اس ناول کا کوئی بھی قاری عبدالرحمٰن کا ردار کے اس جملے پر کہ:

''سارا بیٹی......زندگی کبھی کبھی ڈراؤنے خواب سے بھی زیادہ ڈراؤنی لگتی ہے۔''

ٹھٹھک کر رک جائے گا اور زندگی کے اسرار و رموز پر غور و فکر کرنے لگے گا۔ اس طور سمجھنا مشکل نہیں کہ مشرف کے سادہ بیانیہ میں بھی پرکاری کے ایسے ایسے عناصر و عوامل کی کثرت ہوتی ہے جن سے زندگی تمام تر سادگی کے باوجود پیچیدگی اختیار کر لیتی ہے۔ اپنی طرحداری کے باوجود اس قدم مبہم اور تہدار ہو جاتی ہے کہ فلسفیانہ موشگافیوں کا جواز پیدا کر دیتی ہے۔

واقعات و واردات کی نوعیت اور کیفیات سے جو متنوع صورتیں پیدا ہوتی ہیں وہ بیان کے اسلوب کو بھی زیر و زبر کرتی رہتی ہیں۔ کہیں تاریخی صداقت اور کہیں صحافیانہ واقعیت اسلوب میں شفافیت اور قطعیت بھی پیدا کر دیتی ہے۔ اور جہاں تک مضامین و موضوعات یا واقعات و واردات کا تعلق ہے تو وہ سیاسی ہوں یا اخلاقی، تہذیبی ہوں یا مذہبی، جنسی ہوں یا نفسیاتی، ملکی ہوں یا غیر ملکی، انفرادی ہوں یا اجتماعی ان کی سنسنی خیزی نمایاں وصف کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

تہذیب، ترقی اور عصری صورت حال کے تناظر میں بچوں کی تربیت سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے واشگاف اور قطعی انداز و اسلوب میں پروفیسر نیلے اپنا اعتراض درج کراتے ہیں:

''مہذب دنیا میں ایسی کسی بھی تقسیم پر میں اعتراض درج کرتا ہوں جہاں بہانہ کوئی بھی ہو، مگر عورتوں کو مردوں سے کم تر سمجھا جاتا ہو۔''

عبدالرحمٰن کا ردار اسی تسلسل میں اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''وہ میری طرف مڑے......'ہاں، تم اس دنیا کے بارے میں جاننا چاہتے تھے، جہاں باپ اور بیٹی......؟ اور جیسا کہ تم نے بتایا......؟ تم ابھی بھی کانپ رہے ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری آج کی دنیا میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ آسٹریلیا کے شہر Amstetten میں ایک شخص نے اپنی سگی بیٹی الزبتھ کے ساتھ 22 سال تک جنسی تعلقات بنائے......خود ہندستان میں اس قسم کے کتنے واقعات ہوئے ہیں اور ہو رہے ہیں اور یہ مت بھولو کہ تمہاری اس کہانی میں ابھی صرف اس مانگ نے جنم لیا ہے— اور ایک باپ ڈر گیا ہے— ایک معذور بیٹی، جس نے 18 سال تک ہوش و حواس سے الگ کی دنیا میں پناہ لی، اب اس کے اندر ایک مانگ پیدا ہو رہی ہے— مگر بھیانک......''

اس موقع پر پروفیسر نیلے مسکراتے بھی ہیں لیکن ان کی مسکراہٹ معنی خیز ہوتی ہے۔ بین السطور میں محسوس کیا جا سکتا ہے نگار کی مانگ، بھیانک مانگ یا طلب کے سلسلے میں عبدالرحمٰن کا ردار نے نور محمد کا بیان جس انداز میں دہرایا ہے، اسے پروفیسر نیلے جس زاویہ نظر سے دیکھ رہے ہیں وہی حقیقت ہو اور نور محمد نے جو کچھ سنایا ہے اس کی حقیقت افسانے سے زیادہ نہ ہو، کیوں کہ پروفیسر نیلے واضح لفظوں میں کہتے ہیں کہ— ''ابھی اس کہانی سے باہر نکلو۔'' یہی نہیں، وہ عبدالرحمٰن کا ردار کو کچھ دکھانا چاہتے ہیں۔ کچھ بتانا چاہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ کسی ایسی دنیا کا انکشاف کرنا چاہتے ہیں جس کا ہماری تہذیب نے کبھی تصور تک نہیں کیا ہوگا۔ پہلے ہزارے کی پہلی دہائی کے مکمل ہونے تک ایسی دنیا پیدا ہو چکی ہے جسے شاید بچوں اور بچوں کے بچوں نے تو دیکھی ہو لیکن کا ردار اور ان کی عمر کے لوگوں نے نہیں دیکھی۔ اگر وہ اس دنیا کو دیکھیں تو صرف لرز سکتے ہیں مگر زمانے کے اس بھیانک سچ کے ساتھ قدم سے قدم ملا کر نہیں چل سکتے۔ پروفیسر نیلے کہتے بھی ہیں:

''ممکن ہے، ہمارے تمہارے بچوں نے اس سچ کو ہزار بار دیکھا ہو— پھر بھی ان کے اندر کوئی تبدیلی نہیں آئی ہو۔ کسی بھی طرح کوئی لہر، کوئی بغاوت پیدا نہیں ہوئی ہو۔ وہ ایک لمحے کے لیے بھی سنسکرتی، تہذیب اور اخلاق کو ہونٹوں پر نہ لائے ہوں، اور دیکھ کر بھی اس واقعہ سے ایسے گزر گئے ہوں، جیسے جنک فوڈ کھا رہے ہوں— برگر، پیپسی، یا پزا......''

پروفیسر نیلے صرف اپنے بیان پر اکتفا نہیں کرتے۔ وہ اسکرین پر کا ردار کو جو کچھ دکھاتے ہیں وہ واقعی حیرت انگیز انکشاف کی حیثیت رکھتا ہے لیکن INTERNET سے منسلک پروفیسر نیلے جیسے لوگوں کے لیے حیرت کی کوئی بات نہیں۔ یہاں Google ہے...... Facebook ہے۔ Picasa, Smugmug, Webshots, vimeu, Yautube, Zoom اور Padora ہے۔ Google کے اسکرین پر Family incest لکھ کر پروفیسر نیلے ہزاروں خانے روشن کرتے ہیں اور اس روشنی میں جو کچھ نظر آتا ہے، وہ آج کی مہذب، ترقی یافتہ اور روشن خیال دنیا کا کڑوا سچ ہے:

''باپ بیٹی میں سیکس— ماں بیٹے میں سیکس— خاندان کے ساتھ گروپ سیکس...... بھائی بہن میں سیکس......سوتیلی بہن کے ساتھ......ماں اور بیٹی کے ساتھ باپ کا دونوں کو Seduce کرنا......

پروفیسر نیلے کے ہاتھ سانپ بن گئے تھے—''

مشرف عالم ذوقی نے یہ کہانیاں گھڑی نہیں ہیں۔ بلکہ اپنی فنکارانہ ہنرمندی سے کٹنگ (Cutting) پیسٹنگ اور ڈبنگ کا کام کیا ہے۔ تہذیب، ترقی اور روشن خیالی کے دعوے کو آئینہ دکھایا ہے۔ مواد صحافتی، مسالہ اخباری ہے لیکن اسے ادب کے قالب میں ڈھالنا فنکاری ہے اور یہاں مشرف عالم ذوقی کی یہی کارگزاری نظر آتی ہے اس صورت حال کی سنسنی خیزی شدید سے شدید تر ہو جاتی ہے جب پروفیسر نیلے عبدالرحمٰن کا ردار کو احساس دلاتے ہیں کہ معاملہ سیکس سے رشتوں تک آ گیا ہے۔ یہاں ہزاروں فلمیں ہیں جہاں رشتوں کے مقدس دھاگے ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئے ہیں۔ پروفیسر نیلے کہتے ہیں:

''اب یہ دیکھو— یہاں میں لکھتا ہوں India, incest family یا پاکستان کا نام لکھو— اور یہ دیکھو— وہ دکھا رہے ہیں...... یہاں کوئی

یوروپین نہیں ہے۔ امریکہ، برطانیہ یا آسٹریلیا کے جوڑے نہیں ہیں۔ تمہارے لوگ ہیں کاردار— پاکستان کے، ہندستان کے۔ اپنے سگے جو جنسی اشتعال انگیزی میں گم ہیں۔ تم کہہ سکتے ہو، ممکن ہے، یہ سگے نہ ہوں۔ محض فلمیں بنادی گئی ہوں۔ لیکن یہاں سگے رشتوں کا نام کیوں درج ہے کاردار؟ کیونکہ بازار سے مارے، گلوبلائزیشن سے بور ہوجانے والے اب دوسروں کے سیکس کا ڈرامہ دیکھ کر بور ہو چکے ہیں اور نتیجہ...... وہ سیکس کو آپسی رشتوں میں تلاش کر رہے ہیں۔''

اس صورت حال میں باپ بیٹی، نور محمد اور نگار کے جنسی تعلقات کی سنسنی خیزی اپنی شدت تاثیر اگر کھو نہیں دیتی تو کم سے کم ضرور ہوجاتی ہے۔ اس کے باوجود نور محمد کے اس انکشاف سے کہ اس نے نگار کی مانگ مان لی ہے، اس کی طلب پوری کردی ہے، یہاں تک کہ اب وہ حاملہ ہے— عبدالرحمٰن کاردار چیخ پڑتے ہیں۔ لیکن وہ یہ قیاس کرنے سے باز نہیں رہتے کہ نور محمد اس کا ابارشن کرادے گا۔ البتہ وہ نور محمد کو اس کا مشورہ نہیں دیتے۔ جب کہ وہ نور محمد کے ہمدر وغمگسار اور رازدار واصلاح کار بھی ہیں۔ وہ نور محمد کو یہ مشورہ ضرور دیتے ہیں کہ وہ شہر کی اپنی کوٹھی فروخت کردے اور کہیں دور جا بسے جہاں اجنبیت ہی اجنبیت ہو، کوئی شناسا نہ ہو۔ اور نور محمد یہی کرتا ہے۔ وہ ولاس پور نام کے ایک گاؤں میں جا بستا ہے۔ ترک وطن کے بعد اس کی صورت وسیرت اور ہیت کزائی میں بھی نمایاں بتدیلی آتی ہے۔ وہ گاؤں میں ملاجی کی حیثیت سے اپنی شناخت بنالیتا ہے۔ نگار کے بارے میں گاؤں والوں میں یہ تاثر قائم ہوجاتا ہے کہ ملاجی نے کسی بیمار غریب لڑکی کو آسرا دے رکھا ہے۔ بہر حال گاؤں کے ماحول سے نور محمد مطابقت پیدا کرلیتا ہے اور ملاجی کے نام سے مشہور ہوجاتا ہے...... اسی اثنا میں مذہب کے دروازے اس پر کھل جاتے ہیں۔ ایسے ہی حالات میں خود نور محمد کے بیان کے مطابق:

''اکثر رات گئے نگار کی طلب بڑھ جاتی۔ میں غصے میں دھکّا دیتا تو وہ پاگلوں کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑتی۔ میں روتا— ہاتھ جوڑتا— تو وہ جنون کی حالت میں کپڑے پھینک کر مجھے وہ سب کرنے پر مجبور کرتی، جسے احساس گناہ اور احساسِ جرم کے ساتھ میں نے صرف اس کی زندگی کے لیے قبول کرلیا تھا—''

نور محمد اس بیان کے دوران اپنی مجبوری اور کسمپرسی پر روتا بھی ہے۔ اور اس سلسلے کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتا ہے:

''ہر رشتے کی اپنی اہمیت— مگر یہاں۔ رات گئے جیسے سانپ کے پھنکارنے کی آواز ہوتی تھی اور نگار کی خطرناک طلب— اور ایسے میں— شاید اس لمحے میرے لیے یہ بھول جانا ہوتا تھا کہ یہ جسم نگار کا ہے— میں آنکھیں بند کرلیتا۔ اور نادرہ کو محسوس کرتا— اور نادرہ کے احساس کے ساتھ ہی میرے جسم میں انگارے جمع ہوجانا شروع ہوجاتے— اور یقیناً سرد ہوتے ہوئے، سانپ سے خرگوش بنتے ہی وہی احساسِ گناہ مجھ پر حاوی ہوجاتا—''

عبدالرحمٰن کاردار کے اس سفر اور نور محمد کے تفصیلی ملاقات اور گفتگو کے دوران ذہن کا نگار کی طرف منتقل ہونا فطری ہے— عبدالرحمٰن کاردار کے ذہن میں بار بار یہ بات آتی ہے لیکن نور محمد کی ظاہری حالت اور ذہنی کیفیت کے علاوہ اس کی گفتگو کی رو میں نگار کا خیال محو بھی ہوجاتا ہے۔ اس کے ساتھ جینی کے سلسلے میں ذہن متجسس ہوتا رہتا ہے۔ سارہ کی عمر کی یہ لڑکی کون ہے؟ گاؤں کے الھڑ حسن کا پیکر...... یہاں تجسس متجسسانہ تشنگی میں تبدیل ہوتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ لیکن بالآخر یہ تشنگی بھی دور ہوجاتی ہے۔ یہاں تک کہ منظر نامے پر ابھرنے والا کردار چندو میاں اور کاردار کے ذہن پر چھائے ہوئے اسرار بھی کھل جاتے ہیں۔ اس لفافے کا رمز بھی آشکار ہوجاتا ہے جو پہاڑی سلسلے پر کاردار کے نام سارہ کو موصول ہوا تھا۔ اس نے ددو کو جب یہ لفافہ دیا تھا تو ایک بے نیازی کی سی کیفیت محسوس کی تھی۔ بند لفافے کو کھولا نہیں گیا تو اسے حیرت بھی تھی۔ سارہ نے محسوس کیا تھا کہ لفافہ موصول ہونے کے بعد اس کے ددو کی آنکھوں میں تفکر اور تردد کے آثار نمایاں ہوگئے تھے۔

نور محمد سے عبدالرحمٰن کاردار کی اس ملاقات میں اس لفافے کا راز بھی منکشف ہوجاتا ہے جسے دیکھتے ہی غالباً کاردار نے مضمون کو سمجھ لیا تھا اور بالآخر دیر یا سویر نور محمد سے ملنے کے لیے ولاس پور کے سفر پر نکل پڑے تھے۔ بہر حال اس موقع پر عبدالرحمٰن کاردار نور محمد کے ہر حرف، ہر لفظ، ہر جملے اور ہر عبارت پر اپنی خصوصی توجہ مرکوز رکھنے کے علاوہ نور محمد اور جینی کے ہر طرزِ عمل، گفتار اور رست ورفتار پر بھی گہری نظر رکھتے ہیں۔ اس موقع پر عبدالرحمٰن کاردار نے پہلے پہل چندو میاں کو بھی دیکھا تھا— چنانچہ وہ چندو میاں کے وجود سے بھی صرف نظر نہیں کرتے۔ وہ اس ملاقات کے دوران تمام تر حالات سے باخبر ہوجانا چاہتے ہیں۔ نور محمد بھی حسب سابق تمام ناگفتہ اور سابقہ وموجودہ واقعات وحوادثات اور صورتحال سے انہیں آگاہ کردینا چاہتا ہے کیوں کہ وہ اپنی علالت کی وجہ سے اپنی زندگی سے مایوس اور جینی کے مستقبل کے سلسلے میں فکر مند ہے۔ وہ عبدالرحمٰن کاردار سے اپنے خدشات کو بیان کرتا ہے۔ کاردار اسے دہراتے ہیں:

'''چندو میاں، جینی کو بیٹی کی طرح مانتے ہیں۔ مگر ہیں تو پرائے— یہاں کوئی اپنا نہیں— اور میں...... قبر میں پاؤں پھیلائے...... اس نے مجھے اشارے سے روک دیا تھا...... میں جانتا ہوں میرے پاس بہت کم عمر بچی ہے۔ مرنے کا غم نہیں ہے مجھے مگر جینی کی فکر کھائے جارہی ہے۔ جینی کا کیا ہوگا میرے بعد؟'

اس نے پلٹ کر میری طرف دیکھا— 'گاؤں کی ہوا راس آگئی ہے— لیکن ہے تو اکیلی— میں اس بے رحم زندگی کی جنگ میں اسے اکیلا نہیں چھوڑنا چاہتا—' اُس نے اچانک جھک کر میرے ہاتھوں کو تھام لیا تھا—

'بھیا— بس اسی لیے آپ کو خط لکھا— کون ہے آپ کے سوا میرا— اور میں......؟ کس امید پر بلند شہر کے رشتہ داروں سے ملنے جاتا— انہیں کیا بتاتا— جینی کو بھی کچھ نہیں معلوم...... آپ سمجھ رہے ہیں نا بھیا—'

میرے اندر نقاروں کی گونج شروع ہوگئی تھی......

ڈرم...... ڈرم......

'تو جینی......؟' میری سانس ٹوٹ رہی تھیں— 'تمہاری بیٹی ہے......؟

نگار کی......؟'

'ہاں......' اُس پر کھانسی کا دورہ پڑا تھا— 'بے رحم حقیقت— لیکن اسے تسلیم کرنا ہی ہے بھائی— میری بیٹی— لیکن قدرت کا ظلم کہ اس کی ماں بھی میری بیٹی تھی......' وہ رو رہا تھا......قدرت کا انتقام......اور یہی تو جاننا ہے مجھے کہ اس انتقام کے لیے خدا نے میرا انتخاب ہی کیوں کیا......کھوں......کھوں......''

یہ اس ناول کے بنیادی قصے یا مرکزی موضوع کا کلائمکس ہے جو دوسرے ذیلی مسائل اور واقعات وواردات کے مابین اپنی نمایاں شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہے۔ بے رحم حقیقتوں کے بے شمار الجھاوے ہیں جنہیں اپنی فنکاری یا فنکارانہ ہنرمندی سے مشرف نے زیب داستان کے طور پر بنیادی قصے میں پیوندکاری کی ہے، یا ان کی ہمکاری سے اصل قصے کو موثر بنادیا ہے۔ اس قدر موثر کہ ایسی بے رحم اور سفاک حقیقتوں سے آنکھیں چار کرنے کا حوصلہ پیدا ہوسکتا ہے یہی خصوصیت حالات کے جبر یا قدرت کے ستم کے احساس سے پیدا ہونے والے یاس انگیز یا قنوطی سیلان کو ایک رجائی نقطہ نظر بھی عطا کردیتی ہے۔

یہاں اچانک میرا ذہن ایک نکتے کی طرف متوجہ ہوگیا ہے جو میرے خیال میں نہایت اہم ہے۔ اور وہ یہ کہ مشرف نے انتساب کے صفحے کو ڈاکٹر محمد حسن کے نام معنون کیا ہے: ''کہ اس صفحہ پر......بس ان کا......حق ہے......

اور میر تقی میر کا درج ذیل شعر نقل کیا ہے جس سے اس ناول کا سرنامہ ماخوذ:

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہ شیشہ گری کا

میرا قیاس ہے کہ فکری یا فنی، کسی نہ کسی سطح پر ڈاکٹر محمد حسن کی شخصیت، یا ان کی کوئی فکری جہت مشرف کے اس ناول کی تخلیق میں اصل محرک بنی ہے۔ نہیں کہہ سکتا، میرا یہ قیاس کہاں تک درست ہے— لیکن یہ طے ہے کہ قیاس کی بھی کوئی نہ کوئی منطقی صورت ضرور ہوتی ہے۔ جواز کے طور پر میں ڈاکٹر محمد حسن کا ایک اقتباس نقل کررہا ہوں:

''......فن نے زندگی کی حقیقتوں پر صدیوں تک رنگین نقاب ڈالے ہیں۔ لوہے کی زنجیروں میں نقلی کاغذی پھول گوندھے ہیں۔ خاص طور پر شاعر وادیب نے لٹریچر، انسان اور حقیقت کے درمیان دھندلی دیوار بنا کر کھڑی کردی ہے۔ میں اس طلسم کو توڑنا چاہتا ہوں۔ انسان کا اصل روپ خدائی نہیں حیوانی ہے۔ اور اسے حیوان کے روپ میں زندگی کو دیکھنا اور گزارنا سیکھنا چاہئے۔ پوری کٹھورتا، تلخی اور بے باک سچائی کے ساتھ اور اگر وہ اس زہرناکی کو برداشت نہیں کرسکتا تو میں اسے موت کے حوالے کرتا ہوں جو ناتوانوں کا آخری سہارا ہے۔

مشرف عالم ذوقی کے ناول ''لے سانس بھی آہستہ' میں نور محمد ایک ایسا ہی کردار ہے جو پوری کٹھورتا، تلخی اور بے باک سچائی کے ساتھ زندگی کی زہرناکی کو برداشت کرتا دکھائی دیتا ہے۔ اس کی بین مثال اس کی بیٹی نگار کے ساتھ اس کا جنسی تعلق (Sexual Relation) ہے جو تقریباً دو دہائی کی عمر گزار کر اور اپنے باپ کے نطفے سے ایک بیٹی جینی کو جنم دے کر اس جہان فانی سے کوچ کر جاتی ہے— نگار میں جس طرح سترہ سال کی عمر کے بعد جنسی بھوک پیدا ہوگئی تھی، اسی طرح جینی کو جنم دینے کے بعد اس کے معذور ذہن میں قدرے صحت کی رمق پیدا ہوتی ہے— کسی حد تک اس کے شعور کا ارتقا ہوتا ہے۔ وہ اپنی نومولود بچی جینی کو دودھ پلاتی دیکھی جاتی ہے۔ یہی نہیں اس دوران وہ نور محمد کو نفرت اور حقارت کی نظر سے بھی دیکھنے لگتی ہے، جس کا اظہار اس کی بعض حرکتوں سے ہوتا ہے اور نور محمد اس کی اس کیفیت کو محسوس کیے بغیر نہیں رہ پاتا۔

جینی اب سارہ کی عمر کی ہوچکی ہے— اس نے سترہ سال پورے کرلیے ہیں۔ اس کے حسن، جوانی اور الہڑ پن، نور محمد کی عمر سے تقریباً پانچ سال کم لیکن مضبوط کاٹھی کے ملازم چندومیاں اور خود اپنی علالت اور گرتی ہوئی صحت کی وجہ سے نور محمد جینی کے مستقبل سے ہراساں دکھائی دیتا ہے۔ لیکن کاردار جیسے مونس وغمگسار کی حوصلہ افزائی اور مختصر سے علاج سے وہ نہ صرف روبہ صحت نظر آنے لگتا ہے بلکہ مراٹھی (پگڑی) باندھ کر لہلہاتی ہوئی فصلوں کے درمیان خود بھی سر سبز وشاداب نظر آتا ہے۔ اب وہ کل جیسا بجوکا نہیں لگ رہا۔ ناول کے اختتامیہ حصے میں یہ بڑا ہی معنی خیز اور فنکارانہ لمس (Touch) کے طور پر نظر آتا ہے— چلتے چلتے کاردار کا یہ فقرہ یا مشرف کا مکالمہ کہ......''بڈھے......ابھی مجھ سے زیادہ زندہ رہو گے تم......'' اس معنی خیز تاثر کو اور بھی گہرا کردیتا ہے۔ یہاں تک کہ ناول کے اختتام پر مولانا رومی کا درج ذیل مصرع اس معنی خیز تاثر کو آفاقیت کے رنگ وآہنگ میں ڈھال دیتا ہے:

ہر نفس نو می شود دنیا وما
ہر آن ایک نئی دنیا تعمیر ہورہی ہے۔

## عظمت کے نشان

البانیہ سے تعلق رکھنے والی بھارتی راہبہ مدر تھریسہ کو ایک بڑی تقریب میں ۴۔ دسمبر ۲۰۱۶ء کو رومن کیتھولک مسیحوں کے روحانی پیشوا پوپ فرانسس بعد از مرگ ''سینٹ کا درجہ'' دینے کا اعلان کریں گے۔

مدر تھریسہ نے ساری عمر بھارت میں دکھی انسانیت کی خدمت میں گزاری۔ مدر تھریسہ کو ۱۹۷۹ء میں نوبل انعام بھی دیا گیا تھا۔ مدر تھریسہ کا انتقال ۱۹۹۷ء میں ہوا اور اب تک اُن کا نام خدمت وعظمت کے نشان کے طور پر زندہ جاوید ہے اور آئندہ بھی رہے گا۔

# عہد ساز افسانہ نگار

ڈاکٹر سید احمد قادری
(گیا، بھارت)

**زود نویس** افسانہ نگاروں میں کرشن چندر، منٹو اور ذکی انور جیسے مشہور لیکن بسیار نویس افسانہ نگاروں کے بعد جس زود نویس افسانہ نگار پر نظر ٹھہرتی ہے، اس فنکار کا نام مشرف عالم ذوقی ہے۔

مشرف عالم ذوقی بہت زیادہ کیوں لکھتے ہیں؟ جواب اس کا یہ ہوسکتا ہے کہ ذوقی کی روح بے چین ہے، انھیں کسی خاص چیز کی تلاش ہے، جس کی حصولیابی، ذوقی کا خاص مقصد ہے، اس کے لئے حیات و کائنات کی وہ سیر کرتا ہے تو اس کے ہاتھوں میں اسرار و رموز سے بھرے رنگ و نور آتے ہیں لیکن انہیں دیکھ کر وہ مایوس ہوجاتا ہے۔ ذوقی سمندر میں غوطے لگاتا ہے، سمندر کی تہہ سے بہت ساری اسے سیپیاں ملتی ہیں، وہ ایک ایک سیپیوں کو کھولتا ہے، دیکھتا ہے، پھر اسے وہ اسی سمندر کے حوالے کر دیتا ہے، دراصل انھیں کسی خاص موتی کی تلاش ہے، وہ اب بھی اس کا متلاشی ہے ـــــ اور تلاش و جستجو کے اسی منطقے نے ذوقی سے ڈھیر سارے افسانے لکھوائے، لکھوائیں گے اور اس وقت تک لکھواتے رہیں گے، جب تک کہ ذوقی کو حیات و کائنات کا وہ انمول موتی حاصل نہ ہوجائے۔ اس کے لئے ذوقی طرح طرح کے کٹھن، پُر خار، گرم گرم شاہراہوں پر یہ فنکار چلتا رہے گا۔ مخالف سمت کے طوفان میں گھرتا رہے گا اور نمکین پانی کے سمندر میں غوطہ زن ہوتا رہے گا ـــــ ذوقی لکھتے ہیں:

''ادب میں مصلحت کے چراغ نہیں جلاسکتا.....''

بس وہی اک کمٹمنٹ۔ ساری ساری رات......میں اپنی ہی کہانیوں میں اتر رہا ہوں.......سوچتا ہوں، یہ سب کیوں لکھ رہا ہوں....لیکن شاید آنے والی نسلوں کو اس کی ضرورت محسوس ہو.....''

(صدی کو الوداع کہتے ہوئے، صفحہ ۲۴۶)

''.......دھوپ کی تمازت سے جلتی شاہراہ پر چلتا گیا۔ مگر آہ! سیاست یہاں بھی گرم تھی ـــــ اور میں Idealogy کے نازک سے شیشہ کو سینے سے چمٹائے رکھنا چاہتا تھا ـــــ میں جل رہا تھا گم ہو رہا تھا ـــــ''

(ایضاً صفحہ ۲۴۸)

آنے والی نسلوں کے لئے کچھ دکھانے، کچھ دینے کے لئے سرگرداں، اس بے چین، بے قرار روح کے فنکار کا تپتی ریت پر سفر اسی وقت سے شروع ہوجاتا ہے، جب وہ سولہ سترہ سال کی عمر کا تھا، یہ عمر تو خواب بُننے کی ہوتی ہے، بادِ صبا کی سبک ہواؤں سے اٹھکھیلیاں کھیلنے اور صندلی جسم والی دوشیزاؤں سے قربت پانے کی ہوتی ہے، لیکن وہ تو کالی آندھیوں میں جگنو تلاش کر رہا تھا ـــــ اس تلاش و جستجو میں وہ ۲۰۔۱۸ سال کی عمر میں ''نیلام گھر، لمحہ آئندہ، عقاب کی آنکھیں، اور شہر چپ ہے جیسے چار ناولوں میں حیات و کائنات کے بہت سارے اسرار کو جو اس نے اپنے تصوراتی آنکھوں سے دیکھا تھا، انہیں اپنی توتلی لیکن پر اثر زبان میں، بیان کر چکا تھا۔

''........زندگی کے شب و روز کی اتنی ساری گتھیوں کو اس کمرے میں سلجھا تا رہا ہوں کہ اب روز ہی اس کمرے کو دیکھنے کی عادت سی پڑ گئی ہے.....''

(افسانہ ''کمرہ بولتا ہے'')

زندگی کے شب و روز کی ڈھیر ساری گتھیوں میں انمول موتی کی تلاش کے لئے ذوقی مضطرب اور بے چین ہیں، زندگی کے کیسے کیسے چہرے اس کی نظروں کے سامنے رقصاں ہیں، زندگی کے ان چہروں کو وہ دیکھتا ہے، پڑھتا ہے اور مایوس اور اداس ہوجاتا ہے ـــــ

''.......یہ جذبات مجھے اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے پریشان کئے جاتے.....زندگی اور موت کے فلسفوں پر آنکھیں رہ رہ کر بھیگ جاتیں......لوگ گم کیوں اور کیسے ہو جاتے ہیں.....زندگیاں کیسے کتنے کتنے خانوں میں بٹتی چلی جاتی ہیں۔''

(صدی کو الوداع....صفحہ ۲۶۱)

ذوقی کا حیات و کائنات کے درد و داغ و جستجو و آرزو کو دیکھنے، سمجھنے کا جیسے جیسے شعور بیدار ہوتا گیا، اس کی بے چینی، بے قراری، اس کا تذبذب بڑھتا ہی گیا اور اس بے چینی، بے قراری اور تذبذب نے ذوقی سے بھوکھائی، مرگ نینی نے کہا 'میں ہارا نہیں کامریڈ، ہجرت، مت رو سالگ رام، فنی لینڈ، پربت، مہاندی، تحفظ، تحریکیں، کان بند ہے، جلاوطن، ہندوستانی، دہشت کیوں ہے، کتنا وِش، سور باڑی، تناؤ اور لیبارٹری جیسے یادگار، مؤثر، معیاری، تہہ دار اور فکر و معنویت سے بھرپور افسانے لکھوائے، ان تمام افسانوں میں موضوعات، کردار، اسلوب، آرٹ، داخلیت، خارجیت، احساس کی گرمی، جذبات کی نرمی، مطالعہ کی گہرائی، مشاہدہ کی باریک بینی کی بھرپور چمک دمک اور انفرادیت تھی، جس نے ناقدین اور قارئین کی نگاہوں کو خیرہ کر دیا، لیکن خود ذوقی اس چمک دمک سے مطمئن ہوئے، نہ ہی متاثر ہوئے، انھیں تو تلاش ہے انوکھے چمک دمک والے موتیوں کی، ان جگنوؤں کی، جو تاریکی کو تار تار کرتے ہوئے چاروں سمت اُجالا پھیلا دے، لیکن زندگی اس قدر تیرگی میں ڈوبی ہوئی ہے کہ کوئی ایک جگنو بھی اندھیرے کو چیرنے کی کوشش کرتا ہے تو کبھی فرقہ وارانہ فساد، کبھی دہشت گردی کے نام پر معصوم اور بے گناہوں کا انکاؤنٹر، کبھی ہندوتو کے نام پر شیطانی کھیل، کبھی صوبائی عصبیت تو کبھی نسلی امتیاز، کبھی لسانی تفرقہ، کبھی سیاسی بازی گری، کبھی سماجی و جنسی استحصال، کبھی تہذیبی بحران اور کبھی قدروں کی پامالی، اس جگنو کو شکار بنا لیتی ہے، اور پھر ہر سمت اندھیرا ہی اندھیرا، خوف، دہشت، بربریت، سراسیمگی، تحیر کا عفریت منھ کھولے نظر آتا ہے، ذوقی کا حساس قلم پوری شدت سے ان کی نشاندہی

کررہا ہے۔ ذوقی کے پہلے افسانوی مجموعہ ''بھوکا ایتھوپیا'' کے بیشتر افسانے عصری مسائل پر مبنی افسانے ہیں، خاص طور پر فرقہ وارانہ فسادات، جو تقسیم ہند کی دین ہے، جسے آزادی کے بعد ہرنسل نے نت نئے روپ میں دیکھا۔ کرشن چندر، منٹو، بیدی نے بھی دیکھا اور ذوقی نے بھی دیکھا، لیکن ان کے انداز اور نوعیت مختلف ہیں، ان کی شدّت، حدّت اضطراب، بے چینی الگ ہیں۔ ہم خوشبو خریدیں گے، ہندوستانی، جلاوطن، دہشت کیوں ہے، کتنا وِش، اور سور باڑی وغیرہ جیسے افسانوں میں ذوقی فکری وفنی لحاظ سے کافی بلندی پر نظر آتے ہیں۔ ذوقی کے ایسے ہی افسانوں سے متاثر ہوکر ڈاکٹر قمر رئیس نے لکھا تھا ـــــ

''مشرف عالم ذوقی کے یہاں ہم عصر زندگی کے تجربات کا وقیع ذخیرہ ہے، ان کا اضطراب، ان کا تخّیل، حقیقتوں کی قید میں اتر جاتا ہے۔''

ڈاکٹر قمر رئیس نے ذوقی کے افسانوں کے مطالعہ کے بعد جو رائے قائم کی ہے، وہ یقینی طور پر حقیقت سے بے حد قریب ہے۔ ذوقی کے یہاں ہم عصر زندگی کے تجربات کا وقیع ذخیرہ ہے۔ اور میرے خیال میں ذوقی کے پاس جو وقیع ذخیرہ ہے، وہ ایسا ذخیرہ ہے کہ ذوقی اس ذخیرہ سے جتنا لُٹا تا ہے، اس سے کہیں زیادہ اس کے حصّے میں آجاتا ہے یہی وجہ ہے کہ ذوقی کے یہاں موضوعات کی کمی نہیں، وہ متذکرہ بالا موضوعات پر بے تکان حوصلہ، ہمّت، جرأت اور بے خوف ہوکر لکھتا ہے اور چونکہ بقول، خورشید اکرم ـــــ

''قصّہ گوئی کی بے پناہ قوت، رواں دواں بیانیہ، چست مکالمے، واقعات کا ارتباط وتسلسل اور کہانی کی مجموعی بنت کی وجہ سے ان کے افسانے کی اپیل بہت وسیع ہے۔''

ذوقی کے افسانوں کے محور، یوں تو سماجیات اور معاشیات بھی ہیں لیکن سیاسیات، جو، ہر طبقۂ حیات پر اثر انداز ہے، اور ذوقی پوری شدت و احساسات وجذبات، تفکرات اور تغیرات کے ساتھ منظر نامے مرتب کررہا ہے، ان پر ذوقی کی بڑی گہری نظر ہے۔ ذوقی اس امر کا اعتراف یوں کرتے ہیں ـــــ

''سیاست آج کے فکشن کا بنیادی منتر یا ہتھیار ہے۔'' (صدی کو الوداع.... صفحہ ۲۸۷)

اسی بنیادی منتر یا ہتھیار کا استعمال جس خونریزی، دلوں کے بٹوارے، تفرقہ اور نفرت وبغض کے لئے کیا گیا ہے، انھیں تاریخ کس انداز میں دہرائے گی اس کا اندازہ تو ہے۔ ایسی تاریخ کی داغ بیل ذوقی جیسے فنکار اپنے عہد میں کررہے ہیں، تاکہ تاریخ رقم کرنے والوں کو عہد کی ایسی گھناؤنی، اور کریہہ تاریخ لکھنے میں دشواری نہ ہو ـــــ ذوقی کی فکری پرواز اور احساس کی شدّت کو دیکھئے ـــــ

''لیکن۔ کیسا پیس مشن...؟ جہاں دلوں کو سیاسی دیواروں نے بانٹ رکھا ہو، وہاں شانتی اور امن کے پیغام بھی بے معنی لگنے لگتے ہیں...... شاید اسی لئے ان دو گھوڑوں کی محبت بھری ادا کو دیکھ کر میں نے پوچھا تھا۔ ان میں سے ایک ہندوستان ہے اور دوسرا.....''

(افسانہ ''لینڈ اسکیپ کے گھوڑے'' صفحہ ۶۷)

اس افسانہ اور اس نوع کے کئی افسانوں میں ذوقی نے Pathos کی جو شدت پیدا کی ہے اور قومی و بین الاقوامی سطح پر بارود کے ڈھیر پر بیٹھی انسانیت جس طرح کراہ رہی ہے، اس کا پورا منظر نامہ ذوقی بڑے ہی انہماک اور دردمندی کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ ذوقی اس امر کا اعتراف یوں کرتے ہیں۔

''...اجودھیا اور ملک میں ہونے والے فسادات نے نئے سیاسی پس منظر کا موضوع دے دیا تھا۔ ادیبوں میں ایک خاص طرح کا Political Concsciousness پیدا ہورہا تھا..... یہ جاننا اہم تھا کہ نیا لکھنے والا مین اسٹریم سے کسی حد تک جڑا ہوا ہے۔ اس میں Political Sensibility کتنی ہے۔ اس کا سماجی شعور کیا، وہ اپنے عہد کا تجزیہ کس طرح کرتا ہے اور منظر پس منظر کی آنکھ سے اپنے آپ کو کیسے دیکھتا ہے یا محاسبہ کرتا ہے....''

(مباحثہ ۔۶ صفحہ ۴۰ ۔ ۳۹)

ذوقی کے افسانے کو پڑھتے جائیے، ان میں نہ صرف نئے تجربات، بلکہ تہہ در تہہ زندگی کے حقائق اور Multidimensional approach ملتے جائیں گے۔ اور مجھے اس امر کا اعتراف ہے کہ ذوقی کے افسانوں میں جس قدر Political Consciousness یا Political Sensibility کی کارفرمائیاں ہیں، وہ ذوقی کے ہم عصر اور پیش رو افسانہ نگاروں کے یہاں کم ہیں۔ ذوقی کی ان خصوصیات کا اعتراف فکشن کے نوجوان اور ذہین نقاد ڈاکٹر غضنفر اقبال نے اس طرح کیا ہے۔

'' مشرف عالم ذوقی نے اپنے افسانے بالکل نئے ابعاد (Dimension) میں لکھے ہیں۔ ان کی سماجی، ثقافتی اور سیاسی بصیرت تیز ہے۔ انھوں نے اپنی شناخت کی بنیاد محض انحراف یا رد تشکیل پر نہیں رکھی ہے، بلکہ ان کے افسانوں میں ہمارے عہد کی دھڑکنیں شامل ہیں....''

(اردو افسانہ ۱۹۸۰ء کے بعد، صفحہ ۴۲)

ذوقی کی ان تمام خصوصیات کے ساتھ ساتھ ان کے افسانوں میں کچھ خامیاں اور کچھ کمزوریاں بھی عیاں ہیں۔ اوّل تو یہ کہ ذوقی کو اپنے قارئین کی فہم وفراست پر یقین نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ اپنے بیشتر افسانوں میں وہ اپنے قاری کی انگلی پکڑ کر ساتھ ساتھ آگے بڑھنا چاہتے ہیں، جگہ جگہ پر اپنی لمبی لمبی تقاریر سے اپنے قاری کو سمجھانے اور مرعوب کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس سمجھانے اور مرعوب کرنے کے چکّر میں افسانے کی روانی بہر حال اثر انداز ہوتی ہے۔ ذوقی بعض اوقات اپنے افسانہ کے ایک اختتام سے خود مطمئن نہیں ہوتے ہیں، نتیجہ میں قاری کو کئی کئی اختتام سے متاثر کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس کے لئے کئی طرح کی تاویلیں دیتے ہیں۔ اس سے بھی ان کے افسانے کی Spirit اثر انداز ہوتی ہے اور ذوقی کے افسانے کی جو سب سے بڑی خامی ہے،

وہ ہے ان کے افسانوں کی بے جا طوالت ، اس کے لئے ذوقی کوئی بھی وجہ بتائیں،لیکن حقیقت یہ ہے کہ بے جا طوالت سے ان کے افسانے نہ صرف بوجھل پن کے شکار ہوجاتے ہیں، بلکہ Compact افسانوں کا جو حسن اور معیار ہوتا ہے،اس کی کمی شدّت سے کھٹکتی ہے۔اس کمی کو ڈاکٹر غضنفر اقبال نے بھی محسوس کیا اور وہ لکھتے ہیں ــــــ

'' مشرف عالم ذوقی کے افسانے طویل ہوتے ہیں ۔ افسانے پڑھتے ہوئے احساس ہوتا ہے کہ یہ ناولٹ تو نہیں ہے۔وہ طول نویس کہے جاسکتے ہیں یہاں تک کہ ان کے افسانوں کے نام بھی طویل ہوتے ہیں.....''

(اردو افسانہ ۱۹۸۰ء کے بعد صفحہ ۴۳)

ذوقی کی طول نویسی سے ڈاکٹر وہاب اشرفی بھی بدظن نظر آتے ہیں ،جس کا طنزاً اظہار اپنے رسالہ ''مباحثہ'' ۲۸ میں ذوقی کے افسانہ ''فیصلہ'' کو شامل اشاعت کرتے ہوئے یوں کرتے ہیں۔

''.....حالانکہ مشرف عالم ذوقی عام طور سے طوالت پسند ہیں ۔ اختصار کی وجہ سے کہانی میں مزید جان آگئی ہے....''

(مباحثہ ۲۸ صفحہ ۷)

ذوقی نے یقیناً کئی خراب افسانوں کے ساتھ ساتھ کئی اچھے افسانے بھی تخلیق کئے ہیں۔لیکن اس کا فیصلہ قارئین اور ناقدین کو کرنا ہے،ذوقی کو بذات خود نہیں کرنا ہے، کہا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ ہر ماں باپ کو اپنی ہر اولاد پر ناز ہوتا ہے ۔ یہ ناز فطری ہے، تخلیقی عمل میں جس کرب اور اذیت سے تخلیق کار گزرتا ہے اور اس کے بعد جو تخلیق عالم وجود میں آتی ہے وہ اس کی نگاہ میں یقینی طور پر قابل قدر اور قابل فخر ہوتی ہے،لیکن وہ تخلیق واقعی قابلِ قدر اور قابلِ فخر ہے؟ اس کا فیصلہ تو لوگوں پر چھوڑ دینا چاہئے ۔ذوقی اس سلسلے میں خود فریبی کے زیادہ شکار نظر آتے ہیں ۔ذوقی کا ایک افسانہ ہے ''لوتھڑہ'' جس کے بارے میں کلام حیدری نے رائے دیتے ہوئے لکھا تھا۔

''....کہانی گنجلک شروع سے آخر تک ہے،اس کا ثبوت یہ ہے کہ شروع، درمیان یا آخر جہاں سے چاہئے کوئی پیرا گراف نکال دیجئے کوئی اثر کہانی پر نہیں پڑے گا۔ویسے ہر کہانی کو اپنے جدید ہونے کا حق ہے اور یہ کہانی اپنے جیسی ہے۔''

(نئی کہانی نیا مزاج،صفحہ ۸۷)

اس رائے کے ساتھ خود فنکار ذوقی کی اس افسانہ سے متعلق جو رائے آئی وہ دیکھئے:

''.......استحصال کی جو نئی صورت میں نے ''لوتھڑہ'' میں پیش کی ہے اس پر کافی بحثیں ہونی چاہئیں، بقول تاج پیامی 'میں نے ''لوتھڑہ'' میں Das Capital کے آگے کے فلسفے کی تلاش کی کوشش کی ہےــــــ یہ کہانی بڑی باریکی سے پڑھنے کی چیز ہے۔''

(نئی کہانی نیا مزاج ، صفحہ ۵۸)

افسانہ ''لوتھڑہ'' کے متعلق اتنے بلند بانگ دعوے کے بعد اس افسانے کے خالق ذوقی کی نگاہ میں یہ افسانہ ایسا گرا کہ وہ ذوقی کے مرتب کردہ کسی افسانوی مجموعوں میں کہیں بھی جگہ نہیں پاسکا۔ذوقی کی خودنمائی،خودستائی اور خود فریبی کی ایک اور مثال دیکھئے۔

''اردو میں جو لوگ بھی لکھ رہے ہیں، مجھے سب سے شکایت ہے۔ نہ کوئی نظریہ، نہ افق۔سیاست کے بڑے منظر نامے سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ آپ خود دیکھئے کیا یہ کہانی (بازار، طوائف اور کنڈوم) اردو میں کوئی اور لکھ سکتا تھا......''

(مباحثہ ۱۷،صفحہ ۱۶۳)

ذوقی کے ان جملوں نے یقینی طور پر ان کے اس افسانہ کو پڑھنے پر مجبور کیا،لیکن افسانہ اچھا،اچھوتا اور نیا پن کے باوجود لوگ اس افسانہ کے بجائے ذوقی کے، بقول شخصے عبرتناک مراسلہ میں الجھ کر رہ گئے اور چونکہ افسانہ میں ویسی آفاقیت نہیں تھی، جس کا دعویٰ ذوقی نے کیا تھا،اسی لئے لوگوں کو مایوسی ہوئی، جس کا اظہار اس طرح کیا گیا۔

''......افسانے کے Craft اور Content پر بات نہیں کروں گا ، کیونکہ جو چیز موجود ہی نہیں ہے، اس پر گفتگو کا جواز بھی نہیں......اچھا افسانہ لکھنے کے لئے خون تھوکنا پڑتا ہے،اگر شریانوں میں موجود ہو تو

(شاہد اختر ،کانپور مباحثہ ۱۸،صفحہ ۱۷۹،۱۷۸)

ذوقی کو ایسے جملوں سے پرہیز کرنا چاہئے اور قاری کی ذہانت پر اعتماد کرنا چاہئے ، قاری جو یقینی طور پر ذہین ہوتا ہے،اس کے اوپر اپنے فیصلے نہ تھوپیں،افسانہ میں اگر دم ہے تو وہ اپنی اہمیت منوالے گا۔

ان چند خامیوں اور کمزوریوں پر اگر ذوقی قابو پالیتے ہیں تو یقیناً ذوقی نہ صرف نئی نسل بلکہ موجودہ عہد کے بیشتر افسانہ نگاروں سے آگے نکل جانے کی بھرپور صلاحیت رکھتے ہیں۔چونکہ ذوقی کے اندر بدلتے وقت، حالات، مزاج کا گہرا شعور ہے اور ان تغیرات پر گہری نظر ہے اور سیاسی بصیرت اور بصارت بھی ہے، ان کے سامنے کروٹ لیتی زندگی کا نیا منظر نامہ بھی ہے، اور وہ افسانے کی ایک خاص کیفیت اور رمزیت کے اظہار پر قادر بھی ہیں، اس لئے وہ جس منطقے کی تلاش میں ہیں ، جس آفاقیت کی انھیں جستجو ہے ، جس انمول موتی کو پالینے کی خواہش ہے وہ ضرور پوری ہوگی اور وہ اپنی اس تحریر پر عمل کریں۔

''......لکھتے جاؤ، یہ مت دیکھو کہ کون تمہیں کیا کہتا ہے۔لکھتے جاؤ ......تخلیق ایک بہاؤ ہے۔تمہیں تو بہتے جانا ہے، مسلسل ...''

(صدی کو الوداع.....صفحہ ۲۸۹)

ذوقی کی تلاش و جستجو کا یہ سلسلہ مسلسل جاری ہے ۔آنکھوں کو خیرہ کردینے والی کئی موتیوں کو ذوقی نے حاصل بھی کیا ہے،لیکن یہ ایک فال نیک ہے کہ ذوقی ان موتیوں سے مطمئن نہیں ہیں۔مطمئن ہونا بھی نہیں چاہئے ،اس لئے کہ مطمئن ہوجانے کا عمل دراصل سپر ڈال دینا ہے اور ذوقی کے اندر جو فنکارانہ شعور

وادراک ہے اور فکر واحساس کی جو آگہی، تازگی، ندرت اور سنجیدگی ہے، وہ انہیں مائل بہ ارتقاء رکھے گا اور ایک وقت ایسا آئے گا، جب لوگوں کی آنکھیں، ذوقی کی تلاش وجستجو سے حاصل کی گئی آبدار موتیوں سے خیرہ ہوجائیں گی۔

''...... مجھے ہمیشہ اس بات کا احساس رہا ہے کہ میں ادب کے بحر ذخار سے دوچار کارآمد موتی حاصل کرنے کی جستجو کررہا ہوں۔''

(مباحثہ۔٦ صفحہ ۴۴)

تلاش وجستجو کے اس سفر میں کئی پڑاؤ آئے ہیں، بھوکا ایتھوپیا، بچھو گھاٹی، مرگ نینی نے کہا، میں ہارا نہیں ہوں کامریڈ، ہجرت، مہاندی، جلا وطن، سور باڑی، ٹیلی فون، بھنور میں ایلیس، غلام بخش، لاش گھر، چوپال کا قصہ، صدی کو الوداع کہتے ہوئے، باپ بیٹا، لینڈ اسکیپ کے گھوڑے، فزکس، کمسٹری، الجبرا، فریج میں عورت، اور'ایک مٹھی خاک وغیرہ ذوقی کے لئے یقیناً پڑاؤ ہیں، جن کے سایہ میں ذوقی کچھ دیر اپنی تھکان مٹانے کے بعد پھر مائل بہ سفر ہیں، تلاش جاری ہے۔

''افسانوی سفر میری آخری سانس تک جاری رہے گا۔ میں نے کیا دیا اور کیا دے رہا ہوں۔ یہ ابھی نہیں، آنے والا وقت طے کرے گا۔''

(پیش لفظ ''بھوکا ایتھوپیا'' صفحہ:٨)

ذوقی نے اپنے اس افسانوی سفر میں بلا شبہ کئی معیاری اور خوبصورت افسانے لکھے ہیں، اور ہر افسانہ اپنے موضوع، مواد، اسلوب، کردار، واقعات، سانحات، اور وحدت تاثر کے لحاظ سے اہمیت کے حامل ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ذوقی کا عصری مسائل پر بہت گہری نظر ہے اور وہ قومی اور بین الاقوامی سطح پر سیاسی، سماجی اور معاشرتی بدلتے منظر نامے کو بہت باریک بین نگاہوں سے نہ صرف دیکھتے ہیں، بلکہ شدّت سے محسوس کرتے ہیں۔ اپنی ان محسوسات کو افکار واظہار کی ندرت فنّی حسن سے افسانوی قالب میں ڈھال کر نہ صرف معنویت سے بھرپور اور معیاری بناتے ہیں، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ذوقی نے اپنے بیشتر افسانوں میں اپنے عہد کو سمیٹنے کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کی تاریخ اور نوحہ دونوں بیان کرنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔

## ''آج کی جنریشن''

اگرچہ تمہارا ناول 'پوکے مان کی دنیا' بہت پہلے مل گیا تھا۔ غالباً میں نے تمہیں فون پر اُس کے موصول ہونے کی اطلاع بھی دے دی تھی۔ مصروفیات کی وجہ سے ناول پڑھ نہیں پایا تھا حالانکہ ناول میرے مطالعے کی میز پر ہی رکھا تھا۔ اتفاق سے پچھلے دنوں میرا پوتا آیا ہوا تھا جو دوسری جماعت میں پڑھتا ہے۔ اُس کی نظر کتاب پر پڑی اور وہ خوشی سے اُچھل پڑا۔ اُس نے کتاب اُٹھالی اور کتاب کے سرورق پر چھپے 'پوکے مان' نام گنوانے لگا۔ پکاچو، جنگل پف، ہگ برادر، گیسلر اور جانے کیا کیا اور ساتھ ہی وہ تمہارے بیٹے عکاشہ عالم کی طرح اُن میں سے ہر ایک کی کارکردگی پر روشنی ڈالنے لگا۔

میری دلچسپی اس قدر بڑھی کہ میں نے اپنی تمام مصروفیات طاق پر رکھ دیں اور تمہارا ناول پڑھنا شروع کیا اور پھر پڑھتا ہی چلا گیا۔ دو تین روز تک سوائے تمہارے ناول کے میں نے دوسری کوئی کتاب نہیں پڑھی۔ ذوقی! تم نے 'پوکے مان کی دنیا' کی شکل میں عصر حاضر کے ایک سُلگتے موضوع کی ایسی حقیقت پسندانہ تصویر کھینچی ہے جس میں مستقبل کی تشویش ناک جھلکیاں بھی صاف نظر آرہی ہیں، سائبر کرائم پر اردو میں میری نظر سے ایسا عمدہ ناول ابھی تک تو نہیں گزرا ہے۔ کمپیوٹر کے ذریعے سائبر کرائم، ایڈز کے مہلک جراثیم کی طرح ہمارے معاشرے میں داخل ہوگئے ہیں۔ باہر سے ہمارا معاشرہ کتنا ہی چمکیلا چمکیلا نظر آرہا ہو اندر سے کھوکھلا ہوتا جارہا ہے۔ ایڈز کا تو آج نہیں کل علاج دریافت ہوجائے گا مگر کیا سائبر نام کے روگ کا علاج ممکن ہوسکے گا؟

ناول پڑھتے ہوئے مجھے محسوس ہورہا تھا اگرچہ اب دنیا میں حیرت زدہ کرنے جیسا کچھ بھی نہیں بچا ہے۔ تاہم ناول میں ہمارے آس پاس کی روز مرّہ بیتنے والی وارداتوں اور باتوں کو اس انداز سے پیش کیا گیا ہے کہ قاری حیران رہ جاتا ہے۔

ناول میں سنیل کا کردار ایک ہوس مند، باخبر مگر دردمند مصنف کے طور پر اُبھرتا ہے اور قدم قدم پر قاری کو اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔

نکھیل اڈوانی اور ویلیسی کے کردار قاری کے ذہن پر ان مٹ نقش چھوڑتے ہیں جبکہ 'ریا' کا آج کی جنریشن کا نمائندہ کردار ہے، اور روسا کنچن ـــــ روی کنچن تو قاری کی یادداشت میں ایک پھانس کی طرح گڑ جاتا ہے۔ البتہ اسنیہہ کا کردار قدرے کمزور لگا۔ پورا ناول عصری حسیت کے تقاضوں سے شرابور ہے۔ کچھ سیاسی ناموں سے احتراز برتا جاتا تو زیادہ بہتر ہوتا۔ کیونکہ یہ نام ناول کے زمانی العباد کو محدود کردیتے ہیں۔ زبان عمدہ اور مکالمے پُر مغز ہیں۔ مندرجہ ذیل پیراگراف ناول کی تفہیم کو مزید بلیغ بنادیتا ہے۔

''یہ بچّے کچھ بھی کرسکتے ہیں۔ سارے گناہ، سارے ناجائز غلط دھندے، یہ بچے اگر پیدا ہونے کے ساتھ ہی ایپ کرنے لگیں تو مجھے حیرت نہیں ہوگی۔ وہی تمہارا نئے زمانے کا ڈائناسور ـــــ یہ ڈائناسور تمہارے جوراسک پارک کے ڈائناسور سے زیادہ بھیانک ہے۔ وہ حملہ کرتے ہیں تو پتا چلتا ہے یہ حملہ کرتے ہیں تو پتا بھی نہیں چلتا اور جب پتا چلتا ہے تو کافی دیر ہوچکی ہوتی ہے۔''

سلمان بن رزّاق

# منٹو سے ذوقی تک

ڈاکٹر مشتاق احمد
(بھارت)

**اردو فکشن** کا سفر طویل رہا ہے اور اس سفر میں کئی تحریکوں کا ساتھ رہے۔ پریم چند کو اردو افسانے کا بابا آدم تصور کریں تو ۱۱۸ سال کے عرصہ میں جو ادبی تاریخ نظر آتی ہے وہ ترقی اور کامیابی کی تاریخ ہے۔ اور یہ ادبی تاریخ یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے کہ اردو فکشن کو ہندی اور دیگر زبانوں کے فکشن کے مقابلہ میں کہیں بھی کم نہیں کہا جاسکتا۔ پریم چند نے معاشرے اور سماج سدھار کے نام پر جو کہانیاں لکھیں وہ اس وقت کی بڑی ضرورت تھیں۔ اس وقت زیادہ تر روایتی قسم کی کہانیاں لکھی جا رہی تھیں مگر ان کہانیوں میں اپنے زمانے کے سچ اور ترقی پسندی کو بھی دیکھا جاسکتا تھا۔ ترقی پسند تحریک نے اردو ادیبوں کے لیے ترقی پسندی کی راہیں کھول دیں۔ یہ اس وقت کی ضرورت بھی تھی۔ سجاد ظہیر کی تحریک میں اس وقت کے تمام بڑے نام شامل ہوئے۔ ملک راج آنند سے لے کر فیض احمد فیض اور پریم چند تک نے اس تحریک کی نگہبانی کی اور اسی ترقی پسند عہد میں اردو کو منٹو جیسا عظیم افسانہ نگار ملا۔ منٹو کی کہانیوں نے اپنے عہد کو متاثر کیا۔ منٹو میں نشتریت تھی—— اس کی تحریر کی روانی قاری کو بے چین کر جاتی تھی۔ اس کے کاٹ دار جملوں پر اردو کے نقاد بھی فدا تھے۔ منٹو کی کہانیوں نے اپنی شروعات کے ساتھ ہی اردو کہانی کے منظر نامہ کو یہ مژدہ سنا دیا کہ اب پرانی روایتی کہانیوں کا عہد نہیں رہا۔ منٹو اپنے عہد سے بہت آگے کا فنکار تھا۔

اس وقت جہاں کہانیوں سے الگ گھر اور معاشرے میں ایک تنگ نظر مرد کی پرورش ہو رہی تھی، منٹو آزادیِ نسواں کی بات کرتا تھا اور وہ بھی ایسے بولڈ انداز میں کہ اس کی کہانیوں پر فحاشی کے الزام بھی لگنے لگے۔ اس عہد میں اردو کو پچاس سے زیادہ بڑے نام میسر آئے، آج بھی جن کے بغیر اردو کہانیوں پر ہونے والی گفتگو کو ادھورا تصور کیا جائے گا۔ ممتاز مفتی، اشفاق حسین، بانو قدسیہ، احمد ندیم قاسمی، کرشن چندر، عصمت چغتائی وغیرہ۔ ان میں بیشتر ایسے نام ہیں جو آج بھی اردو فکشن کی تاریخ کا ایک اہم جز بن چکے ہیں۔ راجندر سنگھ بیدی کی کاٹ دار کہانیوں نے اردو افسانہ کو بلندی پر پہنچا دیا۔ لمبی لڑکی اور لاجونتی جیسی کہانیوں نے اس وقت کے نقاد اور قاری کو بھی حیران کر دیا تھا۔ اسی دور میں ایشیا کے عظیم افسانہ نگار کرشن چندر کی زبان، اسلوب اور کہانیوں کی مخصوص بناوٹ نے بھی قارئین کا دل جیت لیا۔ عصمت چغتائی، کہانیوں میں بغاوت کے راستہ سے آئی تھیں۔ چوتھی کا جوڑا ہو یا چچا بڑے یا پھر ان کی شہرہ آفاق کہانی لحاف۔ عصمت چغتائی عورتوں کے استحصال اور کمزوریوں سے نالاں تھیں۔ وہ مردانہ حکومت سے بیزار تھیں۔ ان کے چٹخارے دار جملوں نے ترقی پسند کہانیوں میں جان پھونک دی۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ترقی پسند تحریک نے ۱۹۴۰ تک اردو کہانیوں کا دامن لازوال اور نہ بھولنے والی کہانیوں سے بھر دیا۔ ۱۹۴۰ کے بعد جدیدیت کی تحریک نے اردو افسانے کے تابناک اور اجیالے مستقبل میں ٹھہراؤ پیدا کر دیا۔ جدیدیت کی لایعنی تحریک نے اردو افسانے سے اس کا قیمتی جزو یعنی بیانیہ چھین لیا۔ اس تحریک نے اردو افسانے کو بہت نقصان پہنچایا۔ ایک بڑا نقصان یہ بھی تھا کہ اردو پڑھنے والے قارئین کی تعداد کم ہوگئی۔ لوگ باگ افسانوں سے ہی خوف کھانے لگے، لیکن ۱۹۸۰ کے بعد یہ تحریک بھی دم توڑ گئی۔ لایعنی افسانے بھی کھو گئے اور بیشتر لکھنے والے بھی وقت کی آندھی میں بکھر گئے۔

۱۹۸۰ کے بعد لکھنے والوں میں سب سے اہم نام مشرف عالم ذوقی کا ہے۔ یوں تو ۸۰ کے بعد بیانیہ کی واپسی کے ساتھ ہی کئی نام ابھر کر سامنے آئے۔ کچھ لوگ ۸۰ سے پہلے سے، لکھ رہے تھے۔ جیسے حسین الحق، شوکت حیات، شموئل احمد، عبدالصمد، سلام بن رزاق، انور قمر، مقدر حمید، م ق خان، علی امام نقوی وغیرہ۔ ان میں کئی ایسے افسانہ نگار تھے جن کو ۸۰ تک ایک بڑی شناخت مل چکی تھی۔ عبدالصمد بارہ رنگوں والا کمرہ سے پہچانے گئے۔ علی امام نقوی کو ڈونگر واڑی کے گدھ نے شناخت دی۔ سلام بن رزاق کا جھکاؤ جدیدیت کی طرف ہوا لیکن بعد میں وہ بھی بیانیہ کی طرف واپسی کر گئے۔ ۸۰ کے بعد ذوقی کے ساتھ ادبی افق پر کئی ستارے چمکے۔ غضنفر، سید محمد اشرف، طارق چھتاری، بیگ احساس، مشتاق احمد نوری، شائستہ فاخری، تبسم فاطمہ، ان میں ہر فنکار کی اپنی تخلیقی فکر تھی۔ اپنا انداز بیان تھا۔ زبان کی سطحوں پر بھی ان کی کہانیوں کے رنگ الگ الگ تھے۔ غضنفر کی سانڈ، شائستہ فاخری کی کہانی اداس لمحوں کی خود کلامی، بیگ احساس کی کئی کہانیوں نے اردو افسانے کو نئی پہچان دی۔ ۱۹۸۰ کے بعد اقبال مجید کی بھی نئے انداز میں واپسی ہوئی۔ ان کے ناولٹ بھی ۸۰ کے بعد ہی سامنے آئے۔ غرض یہ کہا جاسکتا ہے کہ جدیدیت کے اثرات سے باہر نکل کر ایک بار پھر کہانی کو نیا افق مل گیا تھا۔ اور مشرف عالم ذوقی کی صورت میں اردو افسانے کو ایک ایسا لیجنڈ مل گیا تھا جس نے منٹو کے بعد کی روایت میں نہ صرف اضافہ کیا بلکہ اردو افسانے کو وہاں لا کھڑا کیا جہاں اردو فکشن پر بلا شک وشبہ اعتبار اور فخر کیا جاسکتا ہے۔ ذوقی نے کہانیوں کے موجودہ منظر نامہ سے پرہیز کیا۔ ان کی شروعاتی دور کی کہانیوں نے ہی یہ ظاہر کر دیا تھا کہ اردو فکشن کو منٹو کے بعد ایک بڑا ادیب حاصل ہو چکا ہے۔ بارہ تیرہ سال پہلے بہار کے لوکل اخبار میں میرا ایک مراسلہ شائع ہوا تھا کہ ذوقی کو اب تک ساہتیہ اکادمی ایوارڈ کیوں نہیں دیا گیا۔ غور کریں تو ۱۲-۱۳ سال قبل ہی ذوقی اپنی کہانیوں کی شناخت سے اردو فکشن کی تاریخ میں اضافہ کا سبب بن چکے تھے۔

یہاں مثال کے طور پر میں ذوقی کی چند کہانیوں کو سامنے رکھنا ہوگا۔

''آہ تم غلط سمجھے سموئل، ابھی تم نے جن کلچرز کا ذکر چھیڑا، وہ سب دکھ کی پیداوار ہیں...... دکھ...... جو ہم برداشت کرتے ہیں— مہاتما بدھ کے مہان بھشکر من سے

لے کر بھگوان کی آستھاؤں اور نئے خداؤں کی تلاش تک —— پھر ہم کسی روحانی نظام کی طرف بھاگتے ہیں —— کبھی اوشو کی شرن میں آتے ہیں...... کبھی گے (GAY) بن جاتے ہیں تو کبھی لیسبین ۔قتل عام ہورہے ہیں...... اور بھاگتے بھاگتے اچانک ہم کنڈوم کلچر کی طرف آجاتے ہیں —— ہم مررہے ہیں سموئل اور جونہیں مررہے ہیں وہ جانے انجانے ایچ آئی وی پازیٹیو کی تلاش میں بھاگ رہے ہیں......''

''ہمارا ملزم اپنا دفاع نہیں کرپارہا ہے۔اس لئے مقدمہ خارج۔''

وہ غصّے سے سموئل کی طرف مڑا —— ایک باپ پشیمانی کی انتہا پر کھڑا ہے اور تم اسے اپنی بات مکمل کرنے کا موقع بھی نہیں دینا چاہتے۔ ویدک ساہتیہ کو لو۔ دھرم کے بعد کام کا ہی استھان ہے۔ موکش کا نمبر اس کے بعد کا ہے۔ گیتا میں کہا گیا ہے، شری کرشن سب جگہ ہیں...... انسانوں کے اندر وہ کام کے روپ میں موجود ہیں —— کھجوراہو کے مندروں میں سمبھوگ کے چتر اس بات کے ثبوت ہیں کہ سمبھوگ پاپ نہیں ہے —— اگر پاپ ہوتا، اپوتر ہوتا تو اسے مندروں میں جگہ کیوں کرملتی سموئل —— ؟

—— اصل واقعہ کی زیراکس کاپی

ایک مثال اور دیکھئے

''باپ نارمل ہو چکا ہے۔''

''کیا؟'' لڑکی چونک گئی تھی۔

''ہاں، اس میں توازن لوٹ آیا ہے۔ وہ برابر برابر ہنستا ہے یعنی جتنا ہنسنا چاہئے، وہ برابر برابر...... یعنی اتنا ہی مسکراتا ہے، جتنا مسکرانا چاہئے اور کبھی کبھی، کسی ضروری بات پر اتنا ہی سنجیدہ ہوجاتا ہے، جتنا......''

''یعنی وہ لڑکی اس کی زندگی سے دور جا چکی ہے؟''

''یا اسے باپ نے دور کردیا؟''

لڑکی کی آنکھوں میں جیسے اندھیرا چھا گیا ہو۔ وہ ایک لمحے کے لئے کانپ گئی تھی۔ شاید ایک قطرہ آنسو اس کی آنکھوں میں لرزاں تھا ——

''کیا ہوا تمہیں؟''

''کچھ نہیں۔ ماں کا خیال آگیا''

''اچانک۔ مگر کیوں......؟''

لڑکی نے موضوع بدل دیا۔''اب سوچتی ہوں میری ماں مکمل کیوں نہیں ہوسکی۔؟

—— باپ بیٹا

ذوقی کی ان کہانیوں میں عام بستیاں آباد نہیں ہیں۔ یہ فکرونظر کی بستیاں ہیں۔ یہ محض خیال پیکر کی دنیا ہے۔ یہاں زندگی سے جڑے ہوئے حیران کرنے والے واقعات اور ان واقعات سے پیدا شدہ فلسفے نے کہانیوں میں جو رنگ بھرا ہے، اس کی مثال دور تک اردو تو کجا ہندی اور دیگر زبانوں کی کہانیوں میں بھی نہیں ملتی۔ اس طرح غور کریں تو ذوقی اپنی ہر کہانی میں فکرو خیال کی ایک نئی دنیا سجاتے ہیں۔ اس لیے میں ذوقی کو دنیا کے ان حساس فنکاروں میں شامل کرتا ہوں جو نہ صرف اپنے عہد سے وابستہ ہیں بلکہ اس سڑے گلے نظام کے لیے زندگی کا نیا فلسفہ بھی لے کر آتے ہیں۔ ذوقی مبہم اور تجریدی دنیا میں سانس نہیں لیتے۔ وہ حقیقت سے پیکر تراشتے ہیں۔ اور بیک وقت ان کی کہانیوں میں بیانیہ، علامتیں، فنتاسی کا حسین پیکر بھی نظر آتا ہے۔ اس عہد میں سلام بن رزاق سے لے کر عبدالصمد، شموئل احمد، شوکت حیات، غضنفر اور دیگر فنکاروں نے بھی ایسی کہانیاں لکھی ہیں جنہوں نے اردو فکشن کے قد کو بلند کیا ہے مگر غور کیجئے تو ذوقی کے فکشن کا رنگ سب سے مختلف ہے۔ اس جائزے کا یہ مطلب نہیں کہ میں دوسرے افسانہ نگاروں کے قد کو ذوقی سے کم کرنے کی کوشش کررہا ہوں مگر اس بات پر بھی غور کرنے کی ضرورت ہے کہ ذوقی کی تحریر میں جادو ہے۔ جیسے ایک وقت تھا جب منٹو کے جادو کو قبول کیا گیا تھا۔ آج ہمارے درمیان ایک سے بڑھ کر ایک لکھاری موجود ہیں مگر ذوقی کی تخلیقی قوت نے جو جادو جگایا ہے، اس نے ہندستانی اردو فکشن کو عالمی فکشن کے مقابلہ لا کھڑا کیا ہے۔

کچھ اور اقتباس دیکھئے۔

لڑکی کا چہرہ بجھ گیا تھا۔ اپنی اپنی باری کے انتظار میں سب امید بھری نظروں سے پوتے کو دیکھ رہے تھے، جس نے رسی کا ایک سرا پہاڑی کے ایسٹ پول میں پھنسا کر، دوسرا سرا اپنے آئرن بیلٹ سے جوڑ لیا تھا۔ اب وہ روشن نگاہوں سے، چمکتی برفیلی چٹانوں اور اپنے دوستوں کا چہرہ پڑھ رہا تھا۔

'اچھا مان لو، تم واپس نہیں آئے تو؟' ایک ساتھی نے مسکرا کر دریافت کیا۔

'—— کیا واپس آنا ضروری ہے؟' پوتے کے لہجے میں ہنسی تھی۔

'نہیں'—— دوست شرمندہ تھا۔

'—— پھر ہم کہاں ملیں گے؟'

'کیا پھر ملنا ضروری ہے —— ؟ پوتا اس بار زور سے ہنسا۔

'نہیں'

'—— لیکن! اس کے باوجود ہم ملیں گے۔ اگر واپس نہیں آئے تو؟'

'کہاں؟'

پوتے نے اشارہ کیا......'' وہاں —— گلیشیرس میں —— ٹھنڈی موجوں میں —— بہتے پانی میں...... اور چمکیلی برف میں......''

پوتے نے اس بار ہنسنے سے پہلے ہی چھلانگ لگادی۔

—— دادا اور پوتا

''آخر اسے ایک تہذیب مل گئی۔ جس کی کھوج میں وہ برسوں سے لگا تھا۔ ایک قدیم تہذیب...... یہ اس ڈراؤنے ویلنٹائن ڈے کے چوتھے دن بعد کا قصہ ہے۔ مسوری، ہماچل وغیرہ میں برف گری تھی شاید۔ سردی اچانک تیز ہوگئی

تھی......وہ رات کے 3 بجے آیا۔ میں سوگئی تھی۔ عام طور پر جب میں اکیلے ہوتی ہوں۔ بیڈروم میں —— تو برائے نام لباس پہنتی ہوں......وہ مجھے اٹھا رہا تھا۔ جانوروں کی طرح......

''ہوہو..اٹھو..اٹھو۔''

میں نے سمجھا، ایک جانور پیاسا ہے۔ عام طور پر وہ اسی طرح، ایک بے حس جانور کی طرح اپنی بھوک مٹاتا تھا۔ رات کے تین بجے اُٹھا کر اس نے مجھے صوفہ پر بیٹھا دیا۔

'بولو۔ اُٹھایا کیوں۔ میں گہری نیند میں تھی۔''

'مل گیا۔ یوریکا۔ ''اسے میرے لفظوں کی، نیند کی فکر نہیں تھی...... ''تمہیں یاد ہے......وہ کمرے میں ٹہل رہا تھا —— میں نے بتایا تھا نا، 1991ء کے آس پاس جرمن سیاحوں کو آلپس کی پہاڑیوں پر ٹہلتے ہوئے انسانی اعضاء ملے تھے۔ یاد ہے؟ وہ بیسویں صدی کی سب سے عظیم دریافت تھی —— سب سے عظیم دریافت۔ گیارہ برس بعد —— اس کے ٹھیک گیارہ برس بعد۔ آہ تم یقین نہیں کروگی۔ مگر ہم دنیا بدل دیں گے۔ تاریخ نئے سرے سے لکھی جائے گی۔ میں ان کچھ لوگوں میں سے ایک تھا —— گجرات کے ساحل سے 30 کلومیٹر دور کھمباٹ کی کھاڑی میں ایک عظیم خزانہ ہاتھ آگیا ہے۔ سونوفوٹو گرافی۔ تمہیں یاد ہے نا، چار دن پہلے......

'جلتے ہوئے گجرات میں، عظیم خزانہ......؟'

—— انکوبیٹر

''برسوں پہلے موہن جوداڑو کی کھدائی سے —— تمہیں یاد ہے...... 'سفید چادر میں اس کے ہلتے پاؤں نے میرے ننگے پاؤں پر اپنا گداز بوجھ ڈال دیا تھا —— تمہیں یاد ہے حسین، وہ آرکائیو والوں کے لئے یقیناً ایک انوکھی، قیمتی اور مہنگی چیز تھی۔ مجھے یاد کرنے دو......ایک عظیم بھینسا، ریچھ جیسا...... بڑی بڑی سینگیں......لیکن چھوٹا سر...... دونوکیلی سینگیں آسمان سے باتیں کر رہی تھیں...... میں نے یہ تصویر کسی امریکن میگزین میں دیکھی تھی......لیکن، مجھے یاد رہ گئی۔ پتہ ہے، وہ عظیم بھینسا کون تھا۔ وہ تم تھے حسین!''

وہ اچھلی......سفید چادر اس کے اجلے نرم ملائم بدن سے پھسل کر اس کی جانگھوں تک چلی گئی تھی ——

''تم اس وقت بھی تھے۔ موہن جودڑو کی تہذیب میں۔ ایک عظیم بھینسے کی صورت میں۔ لیکن اس وقت میں کہاں تھی حسین......؟''

وہ تارکول کی طرح میرے بدن پر پھسل رہی تھی...... ''میں بن رہی تھی شاید...... ہر بار بننے کے عمل میں تھی۔ عیسیٰ قبل کئی صدیاں پہلے یونان میں...... کبھی 'پارتھنیان'، کے آدھے گھوڑے آدھے انسانی مجسمے کی صورت......کبھی وینس اور 'اپالو' کی پینٹنگ میں......کبھی لیونارڈو دی ونچی کی مونالزا اور جن آف راکس، دی میڈونا اینڈ چائلڈ اور باچیوز میں......اور کبھی رافل، رمبراں اور جان اور میر کی تصویروں میں......''

—— لینڈ اسکیپ کے گھوڑے

انجلی بڑی ہو رہی تھی۔ باپ ڈر رہا تھا...... باپ دوست بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ لیکن، لڑکی یا عورت کے بدن سے جڑی ہوئی کچھ ایسی 'خفیہ' کہانیاں بھی ہوتی ہیں، جو اچانک پُراسرار راتوں کی طرح جاگ جاتی ہیں۔ کبھی کبھی، سہمی سہمی راتیں مجھ میں ڈر پیدا کر دیتیں...... خاص کر سرما جیسے موسم میں —— ایک ہی لحاف میں......انجلی کے بدن سے لپٹے ہوئے ہاتھ اچانک، خرگوش سے سانپ جیسے بھیانک ہو جاتے......

میں لیمپ روشن کر دیتا۔ کمرے کو اپنی لمبی لمبی، گہری گہری سانسیں سونپ دیتا ہوں۔

یہ مجھے کیا ہو رہا ہے۔ انجلی بیٹی ہے۔ بیٹی ہے۔ دو ایکم دو۔ دو دونی چار...... انجلی بیٹی ہے......بیٹی ہے...... بیٹی ہے...... دو ایکم دو۔ دو دونی چار/ انجلی بیٹی ہے......بیٹی ہے......بیٹی ہے......میں اپنی سانسوں سے الجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

—— فزکس، کیمسٹر، الجبرا

وہ آئینے کے سامنے کھڑی اپنی ریشمی ساڑی کی 'شکنوں' میں کھوگئی تھی ——

'تمہیں مجھے خوش رکھنا ہوگا۔ میری...... میری فرمائشیں پوری کرنی ہوں گی......سن رہے ہو، نربھے چودھری......میرے لئے......'

اس کی نقرئی، لڑکھڑاتی آواز کا 'جل ترنگ' کمرے میں گونج رہا تھا۔

'سوچو میں...... ڈھل جاؤں تو؟ میں جیسی ہوں، ویسی نظر نہ آؤں تو —— یہ سب کچھ تم پر ہے نربھے چودھری......تم پر —— مجھے خوبصورتی پسند ہے۔ اس کمرے کو جنت سے زیادہ خوبصورت بنا دو...... مجھے خوشبوئیں پسند ہیں......میرے لئے خوشبوؤں کا خزانہ لے آؤ —— میرے لئے تم بھی اپنے آپ کو بدلو گے نربھے چودھری...... بدلو گے نا......؟ خوشبو کو، خوشبو اور ایک حسین جسم کو ایک حسین جسم کی چاہت ہوتی ہے...... میرے لئے تم یہ سب کرو گے نا، نربھے چودھری، ورنہ......ورنہ......'

—— فریج میں عورت''

۱۹۸۰ کے بعد اردو افسانے کی صورتحال میں بڑی حد تک تبدیلیاں سامنے آچکی ہیں۔ اردو افسانے کا مستقبل تابناک اور روشن ہے۔ ایک وقت تھا جب اردو افسانے پر منٹو کی حکومت تھی —— آج برصغیر میں ذوقی کی کہانیوں کی دھوم ہے۔ ذوقی کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ حال و ماضی کو ملا کر کہانیوں کا ایک ایسا کولاژ تیار کرتے ہیں جو اپنے پڑھنے والوں کو حیران کر جاتا ہے۔ ان کہانیوں میں حیات و ممات کے ایسے فلسفے بھی ہوتے ہیں جو مدتوں تک قاری کو پریشان رکھتے ہیں۔ ذوقی کی کہانیاں ماضی میں بھی سانس لیتی ہیں اور جدید سائنسی منظرنامے کی گواہ بھی بن جاتی ہیں۔

# اردو فکشن کا جن

نند کشور وکرم
(دہلی، بھارت)

دنیا میں کچھ فکشن نگاروں کا اسپِ تحریر اتنی تیز رفتاری سے دوڑتا ہے کہ اگر انہیں جن کہا جائے تو مبالغہ آمیزی نہ ہوگی۔ کانپور میں قیام کے دوران میرا ایک ہندی ادیب سے واسطہ پڑا جو صبح پریس چلے جاتے تھے اور لکھ لکھ کر ٹائپ سیٹنگ کے لئے مشین مین کے حوالے کرتے جاتے تھے۔ ان ہی دنوں ہندی ادب کے مقبول ناول نگار گوبند سنگھ کے بارے میں بھی خبر چھپی کہ انہوں نے پچیس سال کی عمر میں ۱۲۵ ناول لکھ کر دنیا کا ریکارڈ توڑ دیا ہے اور وہ بھی صرف پانچ سال میں کیونکہ انہوں نے بیس سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا تھا۔ یعنی ایک سال میں اوسطاً ۲۵ ناول۔ ایسے ہی اُردو میں بھی بہت سے زود نویس فکشن نگار گزرے ہیں جنہوں نے بیشمار ناول لکھ کر اس میدان میں غیر معمولی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا تھا اور اُن کے ناول باقاعدگی سے منظرِ عام پر آتے رہے مگر اس معاملے میں مشرف عالم ذوقی موجودہ دور کے ایک ایسے زود نویس فکشن نگار ہیں جنہیں ''اُردو ادب کا جن'' کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہ ہوگا۔ وہ اتنی تیزی سے تصنیف و تالیف کی دنیا میں سرگرمِ عمل ہیں کہ آج شاید ہی کوئی ان کا اس میدان میں مقابلہ کر سکے۔ وہ اتنی تیز رفتاری سے بڑے بڑے ضخیم ناول لکھتے ہیں کہ اُنہیں قاری ختم بھی نہیں کر پاتا کہ دوسرا ناول مارکیٹ میں آجاتا ہے اور یہی نہیں اس کے ساتھ ہی ان کے افسانوی مجموعے بھی منظرِ عام پر آتے رہتے ہیں۔ حیرانی اس بات کی ہے کہ وہ اتنے جلدی جلدی اتنے ضخیم ناول اور افسانوی مجموعے کیسے منظرِ عام پر لا رہے ہیں؟

جہاں تک میرے علم میں ہے۔ اُردو اور ہندی میں ذوقی کیلگ بھگ ایک درجن ناول، آدھ درجن افسانوی مجموعوں کے علاوہ ڈرامے، تنقید اور دیگر موضوعات پر بھی متعدد تصنیفات و تالیفات شائع ہو چکی ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ ابھی اُن کا پہلا ناول زیرِ بحث و تبصرہ ہی ہوتا ہے کہ ان کا نیا ناول منظرِ عام پر آجاتا ہے۔ اس کی تازہ مثال یہ کہ اُن کا ۴۸۰ صفحات ''لے سانس بھی آہستہ'' پر ابھی تبصرے شائع ہی ہو رہے ہیں کہ ان کا نیا ناول۔۔۔ مارکیٹ میں آ گیا جس پر زور شور سے ادبی حلقوں میں چرچے شروع ہو گئے ہیں۔

ذوقی اُردو ادب کی اُس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جن کی ولادت ملک کی آزادی کے پندرہ سولہ سال بعد ہوئی جب ہندوستانی مسلمانوں کی نوجوان نسل کو کئی مسائل کا سامنا درپیش تھا اور جنہیں قیامِ پاکستان کے بعد مشتبہ نظروں سے دیکھا جاتا تھا حالانکہ اس نسل کا اس سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ پھر سیاسی بحران، فرقہ وارایت سے مسموم فضا، بے روزگاری، مسلمانوں کی تعلیم اور روزگار میں پسماندگی ایسے مسائل نے اس نسل کا جینا دوبھر کر رکھا تھا۔ ذوقی نے ان حالات و واقعات کا مشاہدہ ہی نہیں کیا بلکہ ہوش سنبھالتے ہی اسے اپنے طلسمی قلم سے صفحہ قرطاس پر بڑی جرأت و دلیری سے فکشن کی شکل میں قارئین کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے اپنے سیکولر اور وطن پرستی کی راہ کو اپنا کر اپنے مشاہدات کو بڑے خوبصورت اور دلپذیر انداز و اسلوب میں قارئین تک پہنچایا اور اپنی تحریروں سے بیدار اور جاگروک کرنے کی کوشش کی۔

ان کے زیرِ نظر ناول ''لے سانس بھی آہستہ'' کی کہانی نور محمد اور وسیع الرحمٰن کاردار نامی دو کرداروں کے اردگرد گھومتی ہے جن کی پیدائش برصغیر ہند کی برطانوی تسلط سے آزادی کے بعد ہوتی ہے جب کہ برصغیر بٹوارے کے زخموں سے چور چور ہو چکا ہوتا ہے اور یہاں ہندوستان میں رہ گئے مسلمانوں کو کئی طرح کے مصائب اور اذیتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور پھر کئی برسوں کی کاوشوں کے بعد ملک سے جاگیردارانہ نظام کا خاتمہ ہو جاتا ہے اور نوجوان نسل امیدوں اور آرزوؤں کے نئے محل تعمیر کرنے اور سنہری سپنے بننے شروع کر دیتی ہے۔

ذوقی ایک سلجھے ہوئے فکشن نگار ہیں اور وہ اپنی فکشن میں حب الوطنی اور سیکولرازم کے ساتھ ہی مسلمانوں کو درپیش مسائل کو بھی بڑی خوش اسلوبی سے پیش کرتے ہیں۔ اس ناول میں بھی گزشتہ پچاس سال سے درپیش مسائل اور حادثات و واقعات کو انہوں نے اس انداز سے پیش کیا ہے کہ کہ وہ صرف ادب کا ہی نہیں ہمارے ملک کی تاریخ کا بھی ایک حصہ بن جاتے ہیں جو آنے والی نسل کو ہمارے ملک کی تاریخ و سیاست کے نشیب و فراز سے بھی آگاہ کرتے ہیں۔

ذوقی کا داستانوی انداز و اسلوب انہیں دیگر فکشن نگاروں سے ممتاز و منفرد بنانے میں ایک اہم رول ادا کرتا ہے۔ وہ اس میدان میں اتنے مشاق اور بے مثال فکشن نگار ہیں کہ اگر اُن کے بارے میں یہ کہا جائے تو مبالغہ نہ ہوگا کہ اگر وہ آج سے ڈیڑھ صدی پیشتر اس جہان رنگ و بو میں آئے ہوتے تو اُن کا شمار ملک کے نامور داستان گویوں میں ہوتا۔ آج بھی جب وہ اپنی کوئی داستان یا مقالہ کسی محفل یا جلسے میں پڑھتے ہیں تو ایک سماں باندھ دیتے ہیں اور سامعین ان کے مسحور کن آواز اور زوردار مکالموں کے انداز ادائیگی میں ایسے کھو جاتے ہیں کہ محفل میں سناٹا چھا جاتا ہے۔ اُن کے مکالموں کی ادائیگی میں جا بجا ایسے مواقع آتے ہیں جب وہ قاری کو اپنے بیانیہ سحر میں جکڑ لیتے ہیں۔

لیکن ایک چیز جو عام قاری کو اس ناول میں کھٹکتی ہے وہ ہے اس ناول میں طویل انگریزی مکالمے۔ کیونکہ اُردو کی اکثریت کے لئے اسے سمجھنا مشکل ہوگا۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ ان مکالمات کا اُردو میں ترجمہ کر دیا جاتا تا کہ اس کی روانی میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ اور عام قاری بھی اسے آسانی سے سمجھ لیتا۔

ناول نویس کے مطابق ہمارے تہذیب و تمدن کو گلوبلائزیشن اور مغربی تہذیب کے حملے نے بُری طرح متاثر کیا ہے۔ موجودہ تہذیب نے ہر شئے کو بکاؤ بنا کر رکھ دیا ہے۔ رشتوں کے بندھن کی ڈور انتہائی کمزور پڑ گئی ہے اور رشتوں کی شناخت کا انسانی دائرہ محدود سے محدود تر ہوتا جا رہا ہے اور سمٹ کر میاں بیوی اور بچوں

تک محدود ہوگیا ہے۔ناول میں ذوقی نے نئی اور پرانی اقدار کے تصادم اور بابری مسجد ایسے سانحہ کے بعد ہونے والی شکست و ریخت اور قتل و غارت گری ایسے واقعات کے ساتھ ساتھ اس ناول میں family incest پر جنسی رشتوں کے ایسے گھناؤنے اور بھیانک واقعات پیش کئے ہیں جنہیں اس سے پیشتر شاید ہی کسی فکشن نگار نے اتنی جرأت و دلیری سے پیش کیا ہو۔لیکن اندیشہ ہے کہ شاید عام قاری اسے پسند نہ کرے۔بھلا ہمارے سماج میں......باپ بیٹی......،ماں بیٹے......، بھائی بہن،......کسی مرد کا بیوی اور بیٹی دونوں کے ساتھ جنسی رشتہ کون برداشت کرے گا کیونکہ ہمارے سماجی اور مذہبی اعتقادات میں یہ گھناؤنا اور قابلِ نفرت فعل سمجھا جاتا ہے۔اور ایسے موضوع پہ لکھنا بہت ہی جرأت مندی کا کام ہے۔بھلے ہی اسے عام قاری پسند نہ کریں۔لیکن اس سچائی کو جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا۔ اس ناول کا کردار نور محمد بھی اسی مرض کا شکار ہے اور گناہ کا مرتکب بھی۔

جیسا کہ ایک جگہ نور محمد آنکھوں میں آنسو بھر کر کاردار کو ان حالات سے آگاہ کرتا ہے جن میں وہ اس خوفناک گناہ کا مرتکب ہوا............''مَیں کس کے پاس جاتا۔کہ یہ میری نادرہ (بیوی) کی معصوم جان ہے......یہ آوازیں مجھے پاگل کر دیتی ہیں......سارے بدن میں زہر اُتر جاتا ہے۔مگر آہستہ آستہ جیسے مَیں ان خبروں کا عادی ہوگیا۔مَیں مُلا جی تھا۔اور کب مذہب کے دروازے کھُل گئے پتہ بھی نہیں چلا۔اکثر رات گئے نگار (بیٹی) کی طلب بڑھ جاتی۔مَیں غصے میں دھکا دیتا تو تو وہ پاگلوں کی طرح مجھ پر جھپٹ پڑتی......میں روتا......ہاتھ جوڑتا تو وہ جنون کی حالت میں کپڑے پھینک کر مجھے وہ سب کرنے پر مجبور کرتی جسے احساسِ گناہ اور احساسِ جُرم کے ساتھ مَیں نے صرف اس کی زندگی کے لئے قبول کیا......مَیں مذہب اخلاقیات اور نفسیات کی کتابوں سے واقف نہیں لیکن مَیں اس اخلاقیات سے ضرور واقف تھا جو رشتوں اور رشتوں کی اہمیت کو لے کر بچپن سے،سلیقے سے ہمارے جسم میں رکھ دئے جاتے ہیں۔بھائی، بہن،ماں، بیوی، محبوبہ ہر رشتے کی اپنی اہمیت......مگر یہاں رات گئے جیسے سانپ کے پھنکارنے کی آواز ہوتی ہے اور نگار کی خطرناک طلب۔اور ایسے میں......شاید اُس لمحے میرے لئے یہ بھول جانا ہوتا تھا کہ یہ جسم نگار کا ہے۔مَیں آنکھیں بند کر لیتا اور نادرہ کو محسوس کرتا اور نادرہ کے احساس کے ساتھ ہی میرے جسم میں انگارے جمع ہوجانا شروع ہوجاتے اور یقیناً سرد ہوتے ہوئے،سانپ سے خرگوش بنتے ہی وہی احساس گناہ مجھ پر حاوی ہو جاتا......مَیں پاگلوں کی طرح کمرے میں ٹہلتا......دعائیں مانگتا......گڑگڑاتا...... یہاں سے کچھ دُور پر ایک مسجد ہے۔زیادہ پریشان ہوتا تو کئی کئی بار رات میں اُٹھ کر مسجد چلا جاتا۔

ذوقی ایک بہت ہی سلجھے ہوئے ترقی پسند خیالات ونظریات کے حامل ادیب ہیں اور ان کی تحریروں میں بھی اس کی جھلکیاں جگہ جگہ دکھائی دیتی ہیں۔اُن کے دیگر ناولوں کی طرح یہ ناول بھی ہمیں غور وفکر کے عمیق سمندر میں غرقاب کر دیتا ہے اور اپنی مسحور کن بیانیہ اور مکالمات سے وہ قاری کو اپنی گرفت میں ایسے جکڑ لیتے ہیں کہ ان پر ایک سحر سا طاری ہوجاتا ہے۔مگر کبھی کبھی وہ لکھتے ہوئے جوش وخروش میں اپنے راستے سے متزلزل ہوتے بھی نظر آتے ہیں۔اور صبر وتحمل کی سرحدیں پھلانگ کر کہیں کے کہیں پہنچ جاتے ہیں۔اگر وہ ذرا مزید سنجیدگی سے کام لیں تو اس میں کوئی شبہ نہیں کہ فکشن میں وہ موجودہ عہد کے فکشن نگاروں سے اس مقابلے میں بہت آگے نکل جائیں گے اور صرف تعداد کے لحاظ سے ہی نہیں بلکہ معیار واسلوب کے میدان میں بھی بازی مار لیں گے۔

ذوقی کا یہ ناول اُردو میں ایک منفرد تجربہ ہے اور ان سے پیشتر اس موضوع کو اس انداز سے کسی نے چھونے کی کوشش نہیں کی۔اسے عام قاری شاید پسند نہ کرے مگر یہ ناول سنجیدہ اور موڈرن جنریشن کو ضرور پسند آئے گیا اور ذوقی کے غیر معمولی اور منفرد موضوع،اندازِ بیاں،ڈرامائی مکالمے،تاریخی واقعات کی موثر بیانی، نیز مشاہدے کی گہرائی و گیرائی اسے ایسا ناول بنا دیتی ہے جس کا ذکر موجودہ دور کے اہم ناولوں میں کیا جائے گا۔

☆

## گہوارۂ ادب

جانتا ہوں کہ دلّی ہر طرح کی سیاست کا گہوارہ بھی ہے۔میں اب بارہا اظہار کرتا آرہا ہوں کہ خواہ مخواہ اہلِ سیاست بدنام ہیں؟ ادیبوں سے بڑا تو کوئی سیاستداں ہو ہی نہیں سکتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بڑا ادیب تو مل رہا ہے بڑا ادب کہیں کھو گیا ہے۔ایسے میں ''پوکے مان کی دنیا''......!مشرف عالم ذوقی،دلّی اور یہاں کا گہوارۂ ادب؟ عجیب امتزاج معلوم ہوتا ہے۔مشرف عالم بہتوں کی طرح مجھے بھی قسطوں میں متاثر کرتے رہے ہیں۔میں نے اس کا اظہار کچھ بھی کیا ہے مگر مکمل فنکار مان لینے کے لئے، کچھ پھانس باقی تھی اور وہ ''پوکے مان کی دنیا'' میں شامل ہونے کے بعد کہیں ضم ہوگئی۔میں نے اکثر ان کرداروں کو اپنے اندر سے بھی ابھرتے ہوئے دیکھا ہے۔آڑی ترچھی لکیروں سے بھی ابھرتے ہیں یہ کردار۔اس دنیا میں جینے والے ہم لوگ دراصل خود سے کہیں نہ کہیں فرار بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں۔آرزو کیا ہے؟ جستجو کیا ہے؟ دشت وصحرا میں جوبجو کیا ہے؟ آج اپنے اندر کی یا اپنی تلاش میں،سرگرداں کرداروں کو ایک نیا آسمان دینے کی کوشش ہے ''پوکے مان کی دنیا''۔یہاں کوئی اپنی زبان بھلے ہی نہ بول پائے لیکن وہ خود کو روک بھی تو نہیں پایا ہے۔پہلی بار اردو کے کسی ناول میں کرداروں کی BodyLanguage سے بھی کام لینے کی کوشش کی گئی ہے۔کردار گڑھنے والے نے روایتی/ قانون دان جج تک کی زبان بدل ڈالی ہے۔قانون کی کتابوں میں وہ زبان نہیں ملے گی لیکن فرسودہ تاریخ کو بدلنے کے لئے بعض اہم ترین فیصلے صادر کرنے کے لئے کسی خاص Directive کا ضرور استعمال کیا گیا ہے۔

ڈاکٹر قاسم خورشید

# باذوق افسانہ نگار

ڈاکٹر شہزاد انجم
(دلّی، بھارت)

ترقی پسندیت، جدیدیت، مابعد جدیدیت سے نئے افسانے کے سفر تک متعدد شاہ کار افسانوں نے اپنے موضوع، مواد، اسلوب، تکنیک، تہہ داری کے حوالے سے مجھے چونکایا اور متاثر کیا۔ پریم چند، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، سعادت حسن منٹو، عصمت چغتائی، احمد ندیم قاسمی، بلونت سنگھ نے بلاشبہ اردو افسانے کے دامن کو مالا مال کیا۔ کفن، شطرنج کے کھلاڑی، کالو بھنگی، مہالکشمی کا پُل، آدھے گھنٹے کا خدا، لاجونتی، اپنے دُکھ مجھے دے دو، گرم کوٹ، ٹوبہ ٹیک سنگھ، نیا قانون، کالی شلوار، ننھی کی نانی، چوتھی کا جوڑا، لحاف، الحمدللہ، گنڈاسا، جگّا جیسے افسانوں نے اُردو افسانے کو نت نئے تجربات واحساسات سے بھر دیا۔ اِن کے علاوہ اُردو افسانے کے قارئین کے سامنے چند ایسے بھی افسانے آئے جن سے ان کے دماغ روشن ہوگئے۔ ان کہانیوں کو فرانسیسی، روسی اور دیگر ہندوستانی زبانوں کی کہانیوں کے سامنے ہم بلاشبہ رکھ سکتے ہیں۔ اِن کہانیوں میں آنندی (غلام عباس) آخری کوشش (حیات اللہ انصاری) میلہ گھومنی (علی عباس حسینی) گلاب دین چِٹھی رساں (آغا بابر) آپا (ممتاز مفتی) گڈریا (اشفاق حسین) گوری ہو گوری (سید رفیق حسین) فوٹو گرافر (قرۃ العین حیدر) پرندہ پکڑنے والی گاڑی (غیاث احمد گدّی) آخری آدمی (انتظار حسین) کا شمار تو کیا ہی جا سکتا ہے۔ ہمارے معاصر افسانہ نگاروں کے یہاں بھی زبردست تکنیک کا تنوع، گہری بصیرت اور عمیق مشاہدہ موجود ہے۔ معاصر افسانہ نگار سماجی تغیر وتبدل اور داخلی ارتعاشات کو جس خوبصورت انداز میں ہمارے سامنے پیش کر رہے ہیں اسے یکسر فراموش اور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نیّر مسعود سے ذوقی تک معاصر افسانہ نگاروں کی متعدد شاہ کار کہانیاں ہمارے حافظے میں ابھی تازہ ہیں۔ شیشہ گھاٹ، پرندہ پکڑنے والی گاڑی، بجوکا، پیتل کا گھنٹہ، کوؤں سے ڈھکا آسمان، انجام کار، ڈار سے بچھڑے، گنبد کے کبوتر، سنگھار دان، ڈونگر والی کے گدھ، زہرا، نیند کے خلاف ایک بیانیہ وغیرہ کے علاوہ مشرف عالم ذوقی کی متعدد کہانیاں مثلاً اصل واقعے کی زیراکس کاپی، فزکس کیمسٹری الجبرا، بوڑھے جاگ سکتے ہیں، شاہی گلدان، دادا پوتا، واپس لوٹتے ہوئے وغیرہ ہمیشہ شدید طور سے متاثر کرتے ہیں۔

ذوقی کے یہاں خاص بات یہ ہے کہ ان کی کہانیوں میں تاریخ و فلسفے کا خوبصورت امتزاج نظر آتا ہے۔ ایک طرف ان کے افسانے جہاں تہذیبوں کی کشمکش، ثقافت وتمدن کے عروج وزوال کو اپنا موضوع بناتے ہیں، وہیں ان کا سیدھا رشتہ مستقبل کے اندیشوں سے بھی رہتا ہے۔ میڈیکل سائنس، تہذیبی ارتقا، نئی تکنالوجی اور تیزی سے کروٹ لیتی ہوئی سیاست مشرف عالم ذوقی کے پسندیدہ موضوعات ہیں۔ اس لئے ذوقی کی ہر کہانی، دوسری کہانی سے مختلف نظر آتی ہے۔ مشرف عالم ذوقی اپنی ہر کہانی میں پہلے سے زیادہ نئے تجربے کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اپنی کہانیوں کے حوالے سے مشرف عالم ذوقی لکھتے ہیں۔

''میری کہانیوں کے کئی چہرے رہے۔ ایک چہرہ جس میں میرا شہر زندہ رہا، ایک چہرہ جہاں جدید تر ہونے کی بھول بھلیوں میں، میں نے آڑی ترچھی تجریدی کہانیاں بھی لکھیں...... پھر ایک نیا چہرہ میری کہانیوں میں پیدا ہوا— یعنی میں ترقی پسندی کی کھردری، دھوپ کی تمازت سے جلتی شاہراہ پر چلتا گیا—

—(میں اور میری کہاناں: ذوقی)

کہانیوں کے پہلے اور تیسرے چہرے کے بیچ دوسرا چہرہ گم ہوگیا۔ میں اس چہرے کو تلاش کرنا بھی نہیں چاہتا— میں نے جان بوجھ کر اس چہرے کو ignore کیا ہے۔ یہ چہرہ جدیدیت کی کوکھ سے جنما تھا۔ اس چہرے کی تاریخ پیدائش بھی وہی تھی، جو میری ناسٹلجیائی کہانیوں کی تھی— ۸۰ء کے آس پاس کا یہ عہد مجھے الجھنوں میں مبتلا کرنے کے لیے کافی تھا۔ کیونکہ میں جو لکھنا چاہتا تھا، وہ اس عہد کے لیے موزوں نہیں تھا۔ جو نہیں لکھنا چاہتا تھا، رسائل میں چھپنے کے لیے وہ لکھنے پر مجبور تھا۔ جدیدیت کی آندھی میں، سچ پوچھئے تو میں بھی بہتا چلا گیا تھا۔

دابۃ الارض، فاختائیں، عرّف نفسک بنفسک، پیر تسمہ پا اب قید ہے، اشغلا کی بند مٹّھیاں، پتھر یگ، فاصلے کے درمیان جلتی ہوئی ایک لالٹین، فاختاؤں کا شہر وغیرہ— افسانوی مجموعہ منڈی میں، میں نے ان میں کچھ کہانیاں شامل تو کیں، لیکن اس بات کا بھی اظہار کیا۔

''یہ وہ کہانیاں ہیں، جنہیں میں نے ردّ کیا۔''

—(اردو کہانی: ایک نیا مکالمہ، ذوقی)

اپنے جدیدیت زدہ چہرے کو نوچ پھینکنے کے بعد مشرف عالم ذوقی نے زندگی کی کڑوی سچائیوں اور ان حقیقتوں سے پردہ اُٹھانا شروع کیا جن سے آج کا انسان نبرد آزما ہے:

''گودھرا سے گجرات، امریکہ سے عراق تک۔ تاریخ صرف اپنی بربادی کے قصے ہی رقم کرتی رہی ہے...... تاریخ جیسے گونگی ہے۔ جسے اپنے آپ کو ڈھنگ سے دہرانا بھی نہیں آتا۔ جو ہر برس، ہر لمحہ گزرنے کے ساتھ زیادہ بے رحم اور زیادہ سفّاک ہوتی جا رہی ہے۔ میں تاریخ کے ایسے بے رحم صفحوں پر اپنے لئے جائے پناہ تلاش نہیں کرتا۔ میں تو ایک معصوم سا ادیب ہوں۔ مظلوم، حساس اور جذباتی...... میں تاریخ کے ایسے ہر حملے میں، ہر بار لہولہو ہوا ہوں۔ ہر بار مرا ہوں...... ہر بار زندہ ہوا ہوں۔ اور اب تاریخ کے ان بے رحم تھپیڑوں کو برداشت کرنے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے...... میں ایک حقیقت نگار ہوں۔ دوستوفسکی، میخائل شلا خوف کی طرح ایک حقیقت نگار۔ شاید اسی لئے میں اپنے عہد سے آنکھیں چرا کر کچھ بھی تحریر نہیں کر سکتا......''

—(لینڈ اسکیپ کے گھوڑے۔)

ذوقی نے اپنے سبھی معاصر افسانہ نگاروں سے اپنی ایک الگ راہ بنائی۔مسئلہ موضوع کا ہو،اسلوب کا ہو،تکنیک کا ہو یا پھر تحریکات ورجحانات سے وابستگی یا عدم وابستگی کا،کہیں بھی کسی مرحلے پر سمجھوتہ نہیں کیا۔جی میں آیا تو ترقی پسندی سے وابستہ ہوگئے۔ارادہ ہوا تو چند علامتی، تجریدی کہانیاں بھی لکھ ڈالیں اور جب یہ احساس ہوا کہ یہ راستہ گمراہی کی طرف جاتا ہے تو حقیقت نگار بن کر ہمارے سامنے آگئے۔حقیقت نگار تو سبھی فنکار ہوتے ہیں پیشکش اور اسلوب جُدا جُدا ہوتا ہے۔ذوقی نے زندگی کی تلخ سچائیوں کو بغیر کسی مصلحت اور جھجک کے، اپنے افسانوں میں برملا پیش کیا۔ذوقی لکھتے ہیں:

''میں افسانے اور ناول کا آدمی ہوں۔ادب میرے جسم کے قطرہ قطرہ میں رواں ہے۔میں وہ ہوں، جس نے شاید اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ انکار یا انحراف یا اختلاف کیا ہے۔انکار یا انحراف کے راستے چلتے ہوئے بھی، مجھے ہمیشہ اس بات کا احساس رہا کہ میں ادب کے بحرِ ذخار سے دو چار کارآمد موتی حاصل کرنے کی جستجو کررہا ہوں:''

—(اردو کہانی ایک نیا مکالمہ: ذوقی)

ان اقتباسات سے جو باتیں ابھر کر سامنے آتی ہیں وہ یہ کہ مشرف عالم ذوقی کا ادب سے کمٹمنٹ بے حد گہرا ہے۔وہ کہیں کسی بھی سطح پر سمجھوتہ نہیں کرتے۔ناقدین اور مبصرین کی اُنھیں ذرا بھی پروا نہیں۔اپنے افسانوں میں وہ اپنے عہد کی تاریخ اور اُس کے چہرے کو اپنے مخصوص اسلوب میں پیش کرتے ہیں۔بقول کملیشور:

'تاریخ کو ادھیڑنا ضروری نہیں ہے۔تاریخ کا تحفظ ضروری ہے اور تاریخ ان دستاویزات میں بھی محفوظ رہ سکتی ہے جسے ہم آج کی کہانی کہتے ہیں اور ذوقی بلاشک شبہ آج کی کہانی لکھ رہے ہیں۔''

کیا واقعی مشرف عالم ذوقی آج کی کہانی لکھ رہے ہیں؟ کیا واقعی اُن کا افسانوی تیور سب سے مختلف اور جُدا ہے؟ کیا واقعی ان کے یہاں بغاوت اور سرکشی کی آنچ سب سے تیز ہے؟ کیا واقعی وہ سماج کی بے رحم سچائیوں کی پردہ کشائی کررہے ہیں؟ ان سبھی سوالات کے جواب کے لئے ہمیں مشرف عالم ذوقی کے افسانوں کے سطور اور بین السطور میں اُترنا ہوگا:

''باہر پٹاخے چھوٹنے شروع ہوگئے ہیں...... شاید سال نو کی آمد قریب ہے...... وہ جانتا ہے باہر کڑاکے کی سردی کے باوجود ہمیشہ کی طرح بچے، جوان مسرت اور گرم جوشی کے ساتھ سڑکوں پر نکل آئے ہوں گے— یا اپنے اپنے گھروں میں گھڑی کی سوئیوں کے جڑنے کا انتظار کررہے ہوں گے— رما چپ ہے...... وہ ایک عجیب سی سرگوشی سن رہے ہیں۔ابھی اور بھی انقلاب باقی ہیں۔آنے والے کچھ برسوں میں بایونکنالوجی اور جینٹک انجینئرنگ کی سمت میں ہونے والے انقلاب...... شاید اگلے پڑاؤ کے طور پر، ہم نینوٹکنالوجی کے عہد میں داخل ہو جائیں۔جراسک پارک کے ڈائناسور سے بھی زیادہ بھیانک ایک نئے عہد کی شروعات...... ہر قدرتی اور فطری چیز کی آپ ایک نقل بنا کر رکھ سکتے ہیں— جیسے پیڑوں کی بایونک نقل...... ایک مائیکرو درخت یا ماحولیاتی اثرات آپ اپنے کمرے میں لاسکتے ہیں۔

''وہ ایک ٹھنڈی سانس بھرتا ہے...... لگاتار ہونے والے انقلاب نے ہمیں 'بونسائی' بنادیا ہے.....''

—(صدی کو الوداع کہتے ہوئے)

مشرف عالم ذوقی جدید ایجادات کی تباہ کاریوں سے نہ صرف ہمیں آگاہ کرتے ہیں بلکہ ترقی کے زینے چڑھتا ہوا انسان کس قدر بے حس اور بے مروت ہو جاتا ہے، قدروں کا زوال کس تیزی کے ساتھ ہورہا ہے۔ایک طرف انسان بایونکنالوجی، جینٹک انجینئرنگ، نینوٹکنالوجی کی دنیا میں گم ہوتا جارہا ہے تو دوسری طرف اس ترقی کے تیزی سے بڑھتے ہوئے منفی اثرات نے سماج کو کھلا کر رکھ دیا ہے، ظاہری چمک دمک اور اُڑان کے درمیان اُن کی داخلی دُنیا سیاہ پڑ چکی ہے اور ایک عجیب سا بکھراؤ، زوال، انتشار کے دائرے میں وہ قید ہوگیا ہے۔ایک طرف نئے سال کے استقبال کی تیاری میں پٹاخے چھوٹ رہے ہیں تو دوسری طرف ایک معصوم چودہ سالہ بچّی ماں بننے جارہی ہے، ان تمام امور اور مسائل سے ذوقی ہمیں باخبر کرتے ہیں۔

اپنے افسانوں میں موضوعات کے انتخاب کے سلسلے میں ذوقی بے حد حساس ہیں۔وہ صرف سیاست اور سماج کے اُن خارجی معاملات و مسائل کو نہیں اُٹھاتے ہیں جو آنکھوں کے سامنے کے ہیں بلکہ اُن کی آنکھیں بہت دور تک مستقبل کے ان مناظر کو دیکھتی ہیں جو عام فنکاروں کی آنکھوں سے اوجھل ہیں۔ نئے موضوعات کی تلاش میں باقاعدہ ریسرچ کرتے ہیں۔اُن کی گہرائی و گیرائی میں جاتے ہیں۔تاریخ کے اوراق پلٹتے ہیں اور مستقبل کے تانے بانے بنتے ہیں۔اِس درمیان ان کے ذہن و دماغ میں وہ سارے معاملات و واقعات اس طرح آہستہ آہستہ رواں دواں رہتا ہے اور افسانہ قاری کو محصور کر لیتا ہے۔البتہ جب ذوقی سماج و سیاست کے ننگے سچ، ظلم و بربریت، نسل کشی اور کریہہ چہرے کو سامنے لاتے ہیں تو ہم حیران رہ جاتے ہیں۔اُن کے افسانے 'لیبارٹری' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''وہ مہذب لوگ تھے۔وہ اتنے مہذب تھے کہ اپنے مہذب ہونے کی دلیلیں دے سکتے تھے۔اور اُن کی دلیلیں اتنی باوزن ہوا کرتی تھیں کہ اُن دلیلوں پر چپ چاپ لوگ سر جھکالیا کرتے تھے۔

محترم قارئین، یہاں اُن بہت ساری سیاہ راتوں کا ذکر ضروری نہیں ہے، جو تجربے، کے لئے اُن کی لیبارٹری میں رکھی ہوئی تھیں۔ لیبارٹری۔ وہ تہذیب سے جڑی ہوئی ہر شئے کو اپنی تجربہ گاہ میں لے جاتے تھے۔انہیں سائنس میں مکمل یقین تھا۔ردرفورڈ، سے آئن اسٹائن اور گراہم بیل سے نیوٹنس لاء کے بارے میں اُن کی معلومات خاصی وسیع تھیں۔جیسے وہ جانتے تھے کہ ہر ایک عمل کا اُس کے مساوی اور مخالف ایک ردِّ عمل ہوتا ہے۔اور وہ اس بات پر فخر کرتے تھے

کہ ہم آج تک کی، اس سب سے زیادہ مہذب دنیا کے، سب سے زیادہ مہذب باشندے ہیں۔ اور یہ بات اُنہوں نے اپنی گرہ میں باندھ لی تھی کہ اس مہذب دنیا کا اصول ہے، جو طاقتور ہیں، وہی زندہ رہیں گے۔ یعنی جو اقلیت میں ہیں، کیڑے مکوڑے یا کیکڑے وہ ویسے بھی مُردہ ہیں اور اُنہیں جینے کا کوئی حق نہیں۔ تو یہ مہذب لوگوں کی لیبارٹری تھی، جہاں یہ جاننے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی کہ تہذیب اور جنگوں کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ یعنی جنگیں ہی وہ پیش قیمت زیور ہیں، جن سے ہمیشہ سے تہذیبوں کو آراستہ کرنے کا کام لیا جاتا رہا ہے۔''

—(لیبارٹری)

مشرف عالم ذوقی نے سماجی کرب، ظلم اور استحصال کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے۔ انسان کس قدر بظاہر مہذب ہو گیا ہے لیکن اس کے اندر کتنا بڑا شیطان چھپا بیٹھا ہے ذوقی نے اپنے افسانوں میں ان حقائق کا بیان کیا ہے۔ انسان ترقی کے زینے طے کر رہا ہے۔ بظاہر شائستہ اور مہذب ہونے کا لبادہ اوڑھ چکا ہے۔ لیکن اس کا اصلی چہرہ کچھ اور ہے۔

مشرف عالم ذوقی آج کے زمانے کی ترقی اور سائنسی ارتقا کے حوالے سے خوشی کا اظہار کرتے ہیں لیکن اس ترقی کی کوکھ سے جو برائیاں جنم لے رہی ہیں اس کا بھی اظہار کرنا نہیں بھولتے۔ اپنے ایک افسانے میں لکھتے ہیں:

''نیلامبر کی نو دولتیہ لوگوں سے دوستی تھی۔ وہ ان سے مل کر آتا تو کافی نئی نئی معلومات فراہم کرتا۔ جیسے.....مصر کی سیر کرنا چاہئے، دریائے نیل میں کشتی بانی، جبل سینا پر چڑھائی۔ اسی سے معلوم ہوا کہ 'ہوانا' سگار پینے کا ایک الگ ہی مزا ہے۔ 'کوہبا' رومیو جولیٹ، بولیوا اینڈ پنچ جیسے برانڈ پیتے ہوئے کوئی بھی رئیس آپ کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے— جیسے نیویارک میں 'بالتھ زار' میں لنچ یا ڈنر کرنا— یا پھر مین ہٹن کے مراقشتی ریستوراں 'چہ زادہ' میں اپنی من پسند چیزیں کھانا— مثلاً آپ کے پاس پرانی شراب 'اسپرنگ بیک' ہو جو کسی بھی شوقین رئیس کو پسند ہو سکتی ہے اور پہناوے کے لئے ڈیزائنر ٹوم فورڈ کے ڈیزائن کئے گئے بیگ، جوتے، پوشاک یا بیلٹ آپ کے پاس ہوں۔ یعنی نیلامبر کے پاس آئیڈیل کے روپ میں ایک ایسی زندگی تھی جسے دولت کی گھن گرج سے ہی خوبصورت بنایا جا سکتا تھا۔ مثلاً برادری میں رعب جمانا ہو تو بچوں کو لیزلس کے ذریعے سوئزرلینڈ کے 'بروئے' میں چلائے جانے والے شیوروں میں چھٹیاں منانے بھیج دیجئے— ہو سکے تو اپنی بیوی کو بھی— اور یہاں اپنی من پسند چاہنے والی کے ساتھ کسی بی ایم ڈبلیو یا LUXES بہت تیز رفتار ٹارگا کیریئر پورش یا ایکس ایس فور ایکس اسٹن میں زندگی کے مزے لیجئے۔''

—(صدی کو الوداع کہتے ہوئے)

افسانے کے اس اقتباس میں معلومات کا ایک ذخیرہ ہے۔ مصر کی سیر، دریائے نیل میں کشتی بانی، جبل سینا پر چڑھائی، ہوانا سگریٹ، کوہبا، رومیو جولیٹ، بولیوا اینڈ، پنچ جیسے برانڈ کی مشروب، نیویارک کا بالتھ زار ریستوراں، اسپرنگ بیک پرانی شراب، ٹوم فورڈ کے ڈیزائنر بیگ، جوتے، پوشاک، بیلٹ اور LUXES، ٹارگا کیریئر پورش یا ایکس ایس فور ایکس اسٹن جیسی تیز رفتار جدید ترین کاروں کا ذکر ہمیں تھوڑی دیر کے لئے حیرت میں ڈال دیتا ہے۔ دنیا کس تیز رفتاری سے ترقی کر رہی ہے۔ کس طرح اپنی دولت کا رعب جمایا جا سکتا ہے۔ اس مقام پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے کہ ذوقی اپنی معلومات اور جانکاری سے ہمیں مرعوب کرنا چاہتے ہیں جب کہ حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں انٹرنیٹ کی سہولیات نے گھر گھر تک معلومات کا ذخیرہ جمع کر دیا ہے۔ بس ذوقی کا کمال یہ ہے کہ وہ ان ترقیوں کے درمیان اُس تنزل پر بھی سخت نگاہ رکھتے ہیں جو ہمارے سماج میں تیزی سے آ چکا ہے۔ دولت کی حرص و ہوس شادی سے قبل اور شادی کے بعد کی زندگی میں نئے مردوں اور نئی عورتوں کا آنا، ترقی کے نام پر بے لباسی، اقدار کو دقیانوسی اور روایت پسندی کہہ کر سرے سے جھٹک دینا۔ کامیابی کے لئے اُن راستوں پر چل نکلنا جہاں خود اپنے گھر کی عورتیں، بچیاں، بچے محفوظ نہیں ہیں۔ بزرگوں کو بیکار شئے سمجھ کر گھر کے کسی تاریک اور علیٰحدہ حصے میں ڈال دینا اب عام رویہ ہو چکا ہے۔ ذوقی سوچتے بہت زیادہ ہیں۔ مختلف زندگیوں اور ان کے داخلی احساسات وجذبات کے حوالے سے۔ اور پھر اُن کا قلم اپنے سفر پر چل نکلتا ہے۔ بوڑھوں کی زندگی کے حوالے سے ان کے مشہور افسانے 'بوڑھے جاگ سکتے ہیں' کا یہ حصہ ملاحظہ ہو:

''کھانے میں کریلا انہیں کبھی پسند نہیں آیا۔ بڑھاپے کا احساس ان کے پورے وجود کو کریلے جیسا کڑوا بنا دیتا ہے۔ سب سے گھناؤنی چیز بڑھاپا ہے.....نہیں...... یہ جو عمر ہے.....عمر، جو دھیرے دھیرے بڑھتی ہے اور ہمارے معاشرے میں 40 پار کرتے ہی اس شخص کو طرح طرح سے دیکھنا شروع کر دیا جاتا ہے— دیکھا، بڈھا کیسے گھور رہا تھا۔ فلاں کی عورت سے کیسے مزے مزے کی باتیں کر رہا تھا۔''

غیر ممالک میں تو اس عمر میں آکر تجربے سانس لیتے ہیں۔ معنویت گہری اور پختہ ہوتی ہے۔ عورتوں کا رجحان بھی ایسے تجربہ کار بوڑھوں کی طرف مخصوص ہوتا ہے۔ مگر ان کے یہاں، اس ملک میں......اب یہ اڑوس پڑوس کی گندی ذہنیت والے، ذرا باہر نکل کر فلم انڈسٹری کی طرف نظر ڈالیں۔ دھرمیندر ہے، دلیپ کمار ہیں، جتیندر ہیں۔ اس عمر میں کیا کیا لٹکے جھٹکے ہیں۔ ہیروئنوں کے ساتھ باغوں میں مٹک مٹک کر گانا ہو رہا ہے......اور وہ......و پن لال اس عمر میں سٹھیا گئے ہیں۔ گانا چھوڑ تفریح کے لئے دو بول نہیں بول سکتے۔ آخر کیوں بھئی۔ کیوں کہ وہ ساٹھ برس کے ہو گئے ہیں۔ اس لئے......ساٹھ برس، مطلب ایک مقدس ہستی......اور بچوں کو حق حاصل ہے کہ وہ اس مقدس ہستی کی پرتیما بنا کر، گھر کے کونے کھدرے میں ڈال کر ان کی توہین کر سکیں۔ اپنے دل کی بھڑاس نکال سکیں۔'

(بوڑھے جاگ سکتے ہیں)

ماضی کی یادوں میں انسانوں کا اکثر کھو جانا ایک فطری عمل ہے— اور پھر جوانی کے دن بھلا کوئی کیسے بھول سکتا ہے— وہ بھی ایسے وقت میں جب

کوئی بوڑھا ہوجائے۔ بوڑھا شخص خاموشی سے ماحول کا جائزہ لیتا رہتا ہے۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھ سکتا ہے کہ اب اُس کا حکم نہیں چل سکتا۔ نئی پیڑھی کی حکمرانی قائم ہوچکی ہے۔ مگر بوڑھے کی بھی اپنی کچھ خواہش ہوتی ہیں، تمنائیں، آرزوئیں ہوتی ہیں، پسند و ناپسند ہوتی ہے۔ بچپن سے لے کر جوانی تک اور جوانی سے بوڑھا ہونے تک اُس کی ہر بات مانی جاتی ہے۔ اُس کی خواہشوں کی تکمیل ہوتی ہے مگر بوڑھا ہوتے ہی اُسے بے مصرف سمجھ لیا جاتا ہے۔ بوڑھا بے بس اور لاچار ہوکر خاموشی سے حالات سے سمجھوتہ کرلیتا ہے۔ مگر تنہائی میں ماضی کی ساری یادیں اُس سے لپٹ جاتی ہیں۔ بیوی کا اُٹھ جانا بھی اُس کا ایک بڑا المیہ ہے۔ ذوقی اپنے افسانے میں ایک بوڑھے کو علامت بنا کر سماج کے لاکھوں خاندانوں کے جوانوں کو سوچنے پر مجبور کرتے ہیں کہ کیا واقعی بوڑھوں کے ساتھ اس طرح کا سلوک غیر انسانی عمل نہیں ہے؟ کیا یہی ہماری قدریں ہیں؟ کیا بوڑھوں کو اُن کی اپنی بھرپور زندگی گزارنے کا حق حاصل نہیں ہے؟ کیا یہ والدین کی تضحیک اور ان کے نفس کو کچلنے کا عمل نہیں ہے؟ ذوقی اپنے ہر افسانے میں بے شمار سوالات کھڑے کرتے ہیں۔ کوئی شخص ماضی کی یادوں میں کیوں پناہ لیتا ہے؟ کیا حال کے حالات سے ناآسودگی اور بیزاری اُسے ماضی میں پناہ لینے پر مجبور کرتی ہے؟ ذوقی کے مشہور افسانے 'شاہی گلدان' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو جس میں دوسری طرح کی یادیں ہیں:

"محل چھوڑتے ہوئے بس یہ شاہی نشانی کپڑوں کی ایک پوٹلی میں عقیدت کے ساتھ باندھی۔ منّی بیگم کا ہاتھ تھاما اور باہر نکل گئے...... تب تک خبر آچکی تھی کہ بادشاہ قیدی بنا کر دہلی لائے گئے۔ شہزادوں کو خونی دروازے کے نزدیک گولی ماردی گئی...... اور تینوں شہزادوں کے سرنڈھال بادشاہ کے سامنے 'خوان پوش' سے ڈھک کر بھجوائے گئے...... اُف یہ ظلم کی انتہا'

(شاہی گلدان)

شاندار ماضی اور خوشگوار یادوں کی جھلک 'شاہی گلدان' میں دیکھ کر اور محسوس کر کے اندر سے ایک عجیب طمانیت کا احساس ابا کو ہوتا ہے اور پھر وہ ماضی کی گپھاؤں میں کھو جاتے ہیں اور بیٹا دہلی جانے کی تیاری کرنے لگتا ہے جہاں اُسے اپنی ملازمت تلاش کرنا ہے۔ پیٹ یادوں سے نہیں روٹی سے بھرتا ہے۔ بیٹا اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہے۔ خاندان کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ معاشی تنگی نے چاروں طرف سے گھیر لیا ہے۔ ایسے وقت میں خاندان کی عظمت و سطوت کی نشانی شاہی گلدان کو سینے سے لگائے رکھنے سے معاشی بدحالی دور نہیں ہوسکتی — بیٹا نئی زندگی کے نئے مسائل سے نبرد آزما ہے — وہ طے کرتا ہے کہ اُسے نوکری کرنی ہے۔ وہ دہلی جانے کی تیاری کرتا ہے۔ مگر ابا اکثر تنہائی میں اُس شاہی گلدان کو تکتے رہتے ہیں جسے وہ اپنے خاندان کی بربادی کے وقت سے محل سے اُٹھا کر اپنے ساتھ آخری نشانی کے طور پر لے آئے تھے۔ ذوقی نے تہذیبوں اور اقدار کی کشمکش اور ناسٹلجیائی کیفیت کو اس افسانے میں پیش کیا ہے۔ ذوقی کے افسانوں میں مختلف SHADES ملتے ہیں۔ ماضی اور حال کے ٹکراؤ، مستقبل کی ایجادات، ترقیوں، بدلتی قدروں پر اُن کی نگاہ رہتی ہے۔ مگر ایسے وقت میں بھی وہ انسان کی زندگی کی بیش قیمت شئے محبت کو نہیں بھولتے ہیں۔ بھلے ہی اُس کا انداز سائنسی اور نئی تکنیک سے بھرا ہوا کیوں نہ ہو۔ ذوقی کے افسانے 'واپس لوٹتے ہوئے' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

لیکن جیسے کل تک ایک کہانی شروع ہوتی تھی — دادی اماں، نانی اماں کے منہ سے نکلی کہانیاں — چاندنی راتوں میں — آسمانی چادر کے نیچے بچھی ہوئی پلنگوں پر — بچوں کی حیران آنکھوں کی اپنی ایک طلسمی دنیا بن جاتی...... ایک تھا راجہ...... ایک تھی رانی...... ایک تھا راکشس...... ایک تھا جادوگر...... سولہ برس بعد جدید ترین دنیا کی یہ کہانی شاید ایسے شروع ہوگی۔ ایک تھا کمپیوٹر۔ نیٹ پر ایک اپسرا لہرائی۔ مگر کوئی جادو نہیں۔ اپسرا نے پانی میں تیرتے ہوئے پوچھا ڈو یو لائک رومانٹک چیٹ؟ کی بورڈ پر تیرتے ہاتھوں نے چپکے سے ٹائپ کیا اوہ بس۔
اور اس اکیسویں صدی کی آغوش میں محبت کی ایک نئی کہانی کی شروعات ہوگئی تھی —

(واپس لوٹتے ہوئے)

انٹرنیٹ کے ذریعے محبت کا آغاز، جذبات کا اظہار، نئی زندگی کی شروعات کے فیصلے اب ہمارے سماج اور شہروں کی زندگی کے عام رویے ہوگئے ہیں۔ بظاہر یہ عجیب سے لگتے ہیں۔ تمام طرح کے بھید بھاؤ کو تج کر قدیم روایت کی دیواروں کو نظر انداز کر کے نئی نسل اپنی راہ خود طے کر رہی ہے۔ کسی اَن دیکھے چہرے پر مرمٹنا، مذہب، ذات، خاندان کے حقائق کو سمجھے اور جانے بغیر صرف انٹرنیٹ پر چیٹنگ کے ذریعے اس قدر قریب آجانا کہ نئی زندگی کی شروعات ہوجائے۔ بغیر شادی اور نکاح تاعمر ساتھ رہنے کا فیصلہ کر لینے کی خبریں بھی اکثر پڑھنے اور سننے کو مل جاتی ہیں۔ اکثر لوگ چیٹنگ کے مریض بھی ہو چکے ہیں مگر اس درمیان کبھی کوئی ایسی محبت بھی جاگ اُٹھتی ہے جو ناقابل فراموش ہوتی ہے۔ ہندوستان اور پاکستان کے نوجوانوں کے دلوں میں بھی دھڑکتا ہوا دِل ہے۔ پاکستان کی نوجوان طالبہ مہک احمد ہندوستان کے ادیب پر مرمٹتی ہے۔
ہندوستانی ادیب کی عمر زیادہ ہے، وہ شادی شدہ ہے، مہک احمد اس کی پرواہ نہیں کرتی۔ وہ تو بس شادی کی خواہاں ہے۔ محبت جب شادی کی حدوں میں داخل ہونا چاہتی ہے تو ادیب اپنی نجی زندگی میں کسی کا دخل نہیں چاہتا ہے وہ صرف محبت کرنا چاہتا ہے اور مہک احمد کی محبت سے فرار اختیار کرلیتا ہے۔ مگر اس محبت کی جھلک ذوقی کے مخصوص اسلوب میں ملاحظہ فرمائیں:

محبت ایک عجیب سا سچ ہے کہ اس سچ کو جانے والے راستے بھی نہ سمجھ میں آنے والے اور خوشبو سے مہکے ہوتے ہیں — اور محبت کی طرح، محبت سے آنے والی زمینی اور جغرافیائی تبدیلیاں بھی اسی سچ کا ایک حصہ ہیں — ارتقاء کی اس لمبی ریس میں ہماری اس عالمی برادری کے ساتھ چمتکار اور معجزے کی ایک نہ ختم ہونے والی قطار بھی شامل ہے۔ معجزے سے ایجاد تک، برین کو ڈاؤن کوڈ کئے

جانے سے لے کر انسان کے کلون بنائے جانے تک — جادو کی اس نگری میں عرصہ پہلے وینس کا دل دھڑکنا بند ہوگیا — آسمان پر چمکتا ایک ننھا سا روشن تارا، جس کا نام محبت تھا، ٹوٹا اور اس کی کرچیاں دور تک آسمانی چادر میں پھیلتی چلی گئیں۔اور یہ وہی وقت تھا، جب محبت کی یہ نئی کہانی لکھی جارہی تھی۔اور یہ وہی وقت تھا، جب کہکشاں میں پھیلی ہوئی نہ ختم ہونے والی اداسی ہماری اور آپ کی اس دنیا سے پوچھ رہی تھی...... کہ محبت گم کہاں ہوگئی — اور برسوں بعد ایجادو اختراع، معجزہ اور جراسک پارک کے اس عہد میں۔ایک نئی کہانی خود بہ خود شروع ہوتی چلی گئی — سیلان کے روپ میں — ترانہ کے روپ میں — یا پھر مہک احمد کے روپ میں — لیکن اس بار یہ کہانی مختلف تھی۔

جیسے اس دن — خاموشی کے جلتے ریگستان میں پانی کی ایک بوند ٹپ سے گری اور بھاپ بن کر اڑ گئی۔

(واپس لوٹتے ہوئے)

آج صارفی ماحول اور نئے کلچر میں محبت گم ہوگئی ہے۔دیوانگی اور جنون پر عقل وخرد کی حکمرانی ہے۔سارا معاملہ مشینی دور کی نذر ہوگیا ہے۔اب محبت بھی مصنوعی شئے ہوکر رہ گئی ہے۔اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ چالیس برس سے تجاوز کر چکے افراد اپنی نجی زندگی کی ناآسودگیوں کو مٹانے کے لئے محبت کی پینگیں بڑھاتے ہیں لیکن پھر ذاتی زندگی کے نشیب وفراز کو دیکھتے ہوئے اُس محبت سے چھٹکارا پانے کی کوشش کرتے ہیں اور نہایت سمجھدار بن جاتے ہیں — جب کہ اُن کے دِلوں میں محبت کے جذبے کی کبھی موت نہیں ہوتی۔ہاں، یہ ضرور ہے کہ نئے معاشرے میں اب سب کچھ تیزی سے تبدیل ہورہا ہے اُس کی ایک مثال ذوقی کے افسانے 'فزکس کیمسٹری الجبرا' میں ملاحظہ فرمائیں:

عام طور پر 40 کے بعد کے مرد ہوجاتے ہیں...... انہیں کہیں بھی دیکھ لیجئے۔بس اسٹاپ سے کلب اور اپنے خوبصورت دفتر کے 'رعب دار' کمرے میں اپنی حسین سکریٹری کو ڈکٹیشن دیتے ہوئے...... وہ اس بات پر دل کھول کر ہنستے ہیں کہ بغیر کرسیوں والے باس کے کمرے میں، باس کے 'بیٹھ جاؤ' کہنے پر نئی نئی آئی ہوئی سکریٹری نے اِدھر اُدھر کرسیاں تلاش کرنے کے بعد پوچھا تھا —— کہاں بیٹھوں سر، یہاں تو کرسیاں ہی نہیں ہیں......'

وہ بہت کچھ گھر سے اپنے ساتھ لے کر آتے ہیں...... پرانی بیوی کا اداس بستر...... اس کے ڈھلتے جسم کی 'سدا بہار' جوانی —— اور پہلے جن پتھ Kiss کے نان وبج لطیفے...... جانتا تھا، یہ سب اندر کا فرسٹریشن ہے اور کچھ نہیں...... ان ڈھلتی ہوئی عمر کی پائیدان پر کھڑے مردوں کے لئے جوانی کا اشتہار، بن جانے کی روایت کوئی نئی نہیں ہے......جسم سونے لگتا ہے تو ہونٹ بولنے لگتے ہیں اور آنکھیں زہریلی ہونے لگتی ہیں......

(فزکس کیمسٹری الجبرا)

ذوقی کے اس افسانے 'فزکس کیمسٹری الجبرا' نے بے حد مقبولیت حاصل کی۔انسان کے داخلی احساسات کی پرتوں کو ذوقی جس طرح آہستہ آہستہ کھولتے ہیں، داخلی ہیجان اور کشمکش کو جس خوبصورتی سے پیش کرتے ہیں، یہ اُن کا خاص ملکہ ہے۔اُن کی کہانیوں کی رفتار واقعات وکردار کی مناسبت سے کبھی سست رہتی ہے کبھی تیز گام ہوجاتی ہے۔مگر اُن کا فکری عمل جاری رہتا ہے۔ان کے افسانے 'غلام بخش' کا یہ حصہ ملاحظہ ہو:

''وہ غلام ملک میں پیدا ہوا۔اس لئے باپ نے اس کا نام ہی غلام بخش رکھ دیا۔مجھے یقین ہے، مرنے سے پہلے وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا تھا۔کچھ بتانا چاہتا تھا۔لیکن اس سے پہلے ہی وہ مرگیا —— وہ بوڑھا تھا —— قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا تھا —— اسے مرنا تھا اور وہ مرگیا —— ممکن ہے اس کے مرنے کا یہی اندازہ لگایا جائے اور ایک بے حد معمولی سا آدمی، جس کے آگے پیچھے کوئی نہیں، اس کے بارے میں زیادہ سوچنے یا غور کرنے کی فکر ہی کس کو ہے...... وہ جیے یا مرے، کیا فرق پڑتا ہے۔وہ جیا بھی تو بیکار اور مرگیا تو مرگیا —— حد تو یہ ہے کہ جہاں وہ کام کرتا تھا وہاں بھی اس کے بارے میں یہی رائے تھی —— ''

(غلام بخش)

دراصل یہ افسانہ سعادت حسن منٹو کے افسانے ٹوبہ ٹیک سنگھ کی توسیع کہا جاسکتا ہے۔منٹو کا افسانہ تقسیم ہند کے واقعات پر مبنی ہے جب کہ ذوقی کا یہ افسانہ آزادی کے بعد کے ہندوستانی تناظر میں لکھا گیا ہے۔غلام بخش قبر میں پیر لٹکائے ہوئے ہے اور زندگی کی آخری سانس بھی اپنے وطن ہندوستان کی راجدھانی دلّی کی تاریخی گلیوں میں آباد اپنے مکان کی چوکھٹ پر ہی لیتا ہے۔غلام بخش کو ہمیشہ شک کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے مگر اس کے سینے میں مچی ہوئی ہلچل، کوئی سمجھ نہیں پاتا — اُسے دیوانہ، پاگل اور مجذوب قرار دیا جاتا ہے لیکن وطن سے اُس کے حقیقی عشق کو کوئی نہیں سمجھ پاتا۔بظاہر وہ بیکار سا آدمی تھا۔اُس کے مرنے اور جینے سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن ذوقی غلام بخش کو علامت بنا کر پورے ہندوستانی مسلمانوں کے درد کو پیش کرتے ہیں جو وطن کی مٹی سے بے پناہ محبت کرتے ہیں اور یہیں مرمٹنا چاہتے ہیں، مگر آزادی کے بعد اب تک انہیں شک کی نگاہ سے ہی دیکھا جارہا ہے۔

ہندوستانی مسلمان کے ساتھ ساتھ ذوقی نے عورتوں کے مسائل کو بھی اپنے افسانوں کا خاص موضوع بنایا ہے۔عورتوں کو آج بھی اس مہذب سماج میں اکثر افراد محض دل بہلاوے اور جنسی خواہشات کی تسکین کا ذریعہ ہی سمجھتے ہیں۔افسانہ 'حیران نہ ہونگی مترا' کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''اس پر ہذیان طاری تھا —

''بولو جسد یو سچ تو یہ ہے کہ ساری ترقی پسندی ایک طرف۔مردوں کے لئے ہم صرف گوشت کی بوٹیاں ہیں — مجھ بوٹیاں نہیں بننا جسد یوں۔میں مردوں میں تمیز نہیں کرپارہی......اصول اور آدرش کی ساری کتابیں مجھے جھوٹی لگ رہی ہیں اور ان کے لکھنے والے بھی۔''

وہ اب تک اس کا گریبان پکڑے ہانپ رہی تھی......

''میری تسلی کرا دو جسدیو ـــ سچ میں برا نہیں مانوں گی جسدیو...... میں برا نہیں مانوں گی۔''

سنگی مترا حیران و پریشان ہے جس آدرش کے سائے میں وہ زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرتی ہے اُسے سخت مایوسی ہوتی ہے۔ایسا لگتا ہے کہ وہ کسی فریب میں گرفتار تھی اور حقیقت کچھ اور ہے۔وہ اپنے خوابوں کے ہیرو جسدیو سے شدّت سے سوال کرتی ہے کہ عورت کیا مرد کے لئے محض گوشت کی بوٹی ہے؟

مشرف عالم ذوقی مرد عورت کے اس نازک رشتے اور ادنیٰ و اعلیٰ، پست و بلند کی جنگ میں یہ پیغام دینا چاہتے ہیں کہ عورت کو کبھی بھی کمتر اور پست نہیں سمجھنا چاہئے۔سماج کا خواہ کیسا ہی رویہ ہو مگر حقیقت یہ ہے کہ عورتیں آج مردوں کے شانہ بشانہ چل رہی ہیں۔ذوقی کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

''عورت آج برانڈ بن چکی ہے۔ایک ایسا برانڈ جس کے نام پر ملٹی نیشنل کمپنیاں اپنے اپنے پروڈکٹ کو دنیا بھر میں پھیلانے کے لئے عورتوں کی مدد لیتی ہیں۔چاہے وہ جنیفر لوپیز ہوں، ایشوریہ رائے یا سشمتا سین۔سوئی سے صابن اور ہوائی جہاز تک، بازار میں عورت کی مارکیٹ ویلیو، مردوں سے زیادہ ہے۔سچ پوچھئے تو تیزی سے پھیلتی اس مہذب دنیا، گلوبل گاؤں یا اس بڑے بازار میں آج عورتوں نے ہر سطح پر مردوں کو کافی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔یہاں تک کہ ڈبلیو ڈبلیو ایف میں بھی عورتوں کے حسن اور جسمانی مضبوطی نے صنف نازک کے الزام کو بہت حد تک رد کر دیا ہے۔یعنی وہ صنف نازک تو ہیں لیکن مردوں سے کسی بھی معنی میں کم یا پیچھے نہیں۔صدہا برسوں کے مسلسل جبر و ظلم کے بعد آج اگر عورت کا نیا چہرہ آپ کے سامنے آیا ہے تو یقیناً آپ کو کسی غلط فہمی میں رہنے کی ضرورت نہیں ہے۔عورت آپ اور آپ کی حکومت کی بیڑیاں توڑ کر آزاد ہونا چاہتی ہے۔ اور اب آپ اُسے روک نہیں سکتے۔'

(مشرف عالم ذوقی)

دراصل مشرف عالم ذوقی سماج اور سیاست کے ہر حساس معاملے پر گہری نظر رکھتے ہیں۔آج کا انسان کن مسائل و مشکلات سے دوچار ہے، وہ اُن موضوعات و مسائل سے اس طرح کہانی بنتے ہیں کہ کہانی قارئین کے دلوں میں گھر کر جائے اور کہانی کی ادبی اہمیت بھی کہیں سے مجروح نہ ہو۔

مشرف عالم ذوقی کا مطالعہ وسیع اور ہمہ گیر ہے۔وہ دُنیا کی مختلف تہذیبوں، نئی ایجادات، جدید ہندوستان کے بنتے بگڑتے چہرے، سماج کے بدنما کریہہ اور سفاک حادثات کو دل و دماغ میں جذب کر کے اُسے اپنے افسانوں کا اس سلیقے سے موضوع بناتے ہیں کہ فن مجروح نہ ہو اور افسانہ تکنیک کے اعتبار سے بھی دلکش اور بھرپور ہو۔مواد کو کسی بھی خاص تکنیک میں ڈھالنے میں سب سے زیادہ مدد اسلوب سے ملتی ہے۔مشرف عالم ذوقی کا ہر افسانہ موضوعاتی سطح پر اور ہیئت کے اعتبار سے بھی ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔جو قاری کو اپنی جانب کھینچتا ہے۔آج اکیسویں صدی میں اردو میں افسانہ نگاروں کی کوئی کمی نہیں ہے۔ کل بیسویں صدی میں بھی کوئی کمی نہیں تھی مگر اُن افسانہ نگاروں کے درمیان ہمیں چند ہی نام کیوں یاد ہیں؟ اور آج سینکڑوں افسانہ نگاروں کے درمیان میرے قلم کی نوک پر مشرف عالم ذوقی کا ہی نام کیوں آیا؟ دراصل مشرف عالم ذوقی کے اِن افسانوں نے اپنے موضوع مواد، اسلوب، تکنیک اور تہہ داری سے مجھے چونکایا۔ یہ افسانے نِت نئے تجربات و احساسات سے لبریز ہیں اور یہ افسانے جب باقاعدہ میرے مطالعے میں آئے تو انہوں نے دماغ بھی روشن کر دیا۔ افسانوں سے ہم اور کیا توقع رکھتے ہیں؟ ذوقی کے ہم عصر افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست میں نے درج کی ہے۔ایسا نہیں ہے کہ ان تمام افسانہ نگاروں میں سب سے اہم صرف مشرف عالم ذوقی ہیں۔ ہاں، اتنا ضرور ہے کہ ذوقی کے تیروں نے میرے احساس کو کئی بار گھائل کیا ہے اور میں پلٹ کر دیکھنے لگا کہ ذوقی کے تیر اس قدر زہریلے کیوں ہیں؟ دیکھا تو مجھے روتا ہوا سالک رام یاد آیا۔ ۳۱ دسمبر کی رات میں وہ چودہ سال کی بچی یاد آئی جس کا ماں بننا ایک مجبوری تھی؟ مجھے زیروکس کا پی کی یاد آئی۔خوش ہونے کا حق مانگتے ہوئے بوڑھا یاد آیا۔ حیران و پریشان سنگی مترا پر نظر پڑی۔فزکس کیمسٹری الجبرا کے رشتوں کے نئے زاویے یاد آئے۔اور۔اور۔یاد آتے رہے تو میں سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ مشرف عالم ذوقی کے افسانوں میں بلاشبہ ایسی باتیں ہیں جو ان کے مطالعہ کے لئے مجبور کرتی ہیں:

ذوقی جملے نہیں تراشتے وہ صرف لکیریں کھینچتے ہیں:

''تمہارے ہاتھوں پر ناچتی رہی ہے۔ یہ دنیا' ایک لکیر ہے، مفہوم آپ واضح کیجئے۔

''پہلی بار یہ دنیا میرے ہاتھوں پر کب ناچی تھی، یاد نہیں ـــ'' ایک اور لکیر۔

''یادوں کے پتھریلے راستوں سے گزرتا ہوں تو ایک چھوٹا سا، حسین سا شہر نظر آتا ہے۔آرہ ـــ'' ایک اور بڑی لکیر وطن کا اظہار۔

''آنکھیں کھولیں تو ابّا حضور جناب مشکور عالم بصیری ـــ''

شیکسپیئر، ملٹن، غالب و اقبال، یہ سب لکیریں ہیں جو ایک دائرہ بناتی ہیں تو مشرف عالم ذوقی کا شہر، اُن کے والد، تعلیم سب بن جاتے ہیں تو آخر یہ لکیریں ہی کیوں پھیلتی چلی جاتی ہیں۔مگر مفہوم تو کہیں کٹا پھٹا، مڑا تڑا نہیں، تو کیا ذوقی کے اندر لکیریں ہی اُبھرتی ہیں۔دوسروں کے یہاں تو نقطے اُبھرتے ہیں، پھیلتے ہیں۔تب الفاظ، تب جملے اور ذوقی وقت برباد کیے بغیر پوری طرح طلوع ہو جاتے ہیں۔کیا یہ انفرادیت انہیں اپنے معاصرین سے الگ نہیں کرتی ہے؟ وہ کہتے ہیں:

''ادب میں گروہ بندی اور سیاست بازاری کی جو فضا ان آنکھوں سے، میں نے بہت قریب سے دیکھی اور محسوس کی ہے۔''

''مجھے اندر بیٹھے آدمی کی تسلی کرنی تھی۔''

''خوشامد اور چاپلوسی کے خیمے نصب کرنے والوں سے بلند رہا۔''

''میں نے ادب میں خیرات نہیں چاہی— میں نے انعامات و اعزازات سے مدام خودکو بلند پایا۔''

'کیسے کیسے انوکھے واقعات پیش آئے۔''

''مجھے اس کا غم نہیں ہے کہ کون مجھے تسلیم کرتا ہےاور کون نہیں۔''

مشرف عالم ذوقی بظاہر لکیریں وضع کرتے ہیں اور لکیریں دائرے بناتی ہیں اور دائرے خوبصورت افسانوں میں ڈھل جاتے ہیں۔

یہ لکیریں ایک نیا اسلوب ہیں۔ اُن میں سلاست اور روانی روایتی نہیں، اُن میں بھی نیا پن ہے۔ واقعات تیزی سے آگے بڑھتے ہیں۔ ایک ترتیب سے، ایک شان سے۔ نقوش غیر واضح ہوں یا واضح تر، مفاہیم کا ایک جہانِ نو لے کر آتے ہیں۔ ایک اچانک پن ہے۔ ایک ڈرامائیت ہے اور یہ سب اس قدر آسانی سے بہ وقتِ ضرورت سامنے آتے ہیں اور احساسات کی تہہ در تہہ جماتے ہیں کہ قاری دم بخود رہ جاتا ہے اور ایک سکون اس کے دل و دماغ میں ہوتا ہے کہ سوائے ذوقی کی لکیروں کے اور کسی شئے کی ضرورت محسوس نہیں ہوگی۔ پھر ذہن و دل کے دریچے کھلنے لگتے ہیں کہ جیسے قاری نے دوبارہ آنندی کا مطالعہ کرلیا ہو، آخری کوشش کے بین السطور سے گزرا ہو، اچانک اُس کے سامنے گلاب دین چٹھی رساں آگیا ہو کسی یا فوٹو گرافر سے مڈبھیڑ ہوگئی ہو۔

مشرف عالم ذوقی بہ یک وقت ماضی، حال اور مستقبل سب جمع کر لیتے ہیں اوران سے تخلیق کی نئی راہوں کی لکیریں وضع کرتے ہیں تو وہ تخلیق کی اُن بلندیوں پر ہوتے ہیں جن سے آگے سوچنے کا عمل ابھی راہ میں ہے۔ کیا عجب ذوقی کی لکیریں وہاں بھی پھیلتی جائیں اور فطری موڑ لے کر دائروں میں تبدیل ہو جائیں اور اُن دائروں کے درمیان افسانوں کے وہ نقوش اُبھریں جو تمام تاریکیوں کو نگل جائیں اور نئی صبح کی بشارت دیں۔

**My dear Zauqui,**

**Last night I completed your bookd 'Byan". First, let me tell you that 'Bayan" is one of the finest books of the decade. After years I have read an Urdu book that runs like juicy fiction. It is a rare achievement for work of literature in any language. The characters of Bal Mukund and Munna are unforgetatable. In fact they are so true to life that one can easily identify them. For example, in my friend Mr. Jagmohan Mattu here in Bombay, I can see your Bal Mukund alive and kicking (From tomorrow he is going to begin leading your book). Your style of writing reminds me of Henry Miller, the controversial authour of 'Tropic of Cancer' and 'Tropic of Capricom'. Your short, terse sentences sprinkled with a satirical humor penetrate deep into the reader's heart. Here are a few lines which felt inllustrated this point admirably.**

**1- og tho fdlh canwd dh xksyh dh rjg iSnk gksrs gh ftLe esa nkx nh tkrh FkhA**

**2- vka[kksa esa 'kk;n chrs bfrgkl ds dkaVs pqHk x;s gSA**

**3- rUgk dejk--- [kkeks'k dejk] dHkh&dHkh dejk cksyrk gS---**

**This entire paragraph was touching.**

**There is so much to say Iwish I was in Delhi and in front of you. By chance if you happen to visit Bombay do inform me. I wish you all the success, all the way.**

**Abid Surti**

# نئے ناول کا بیانیہ

شموئل احمد

(پٹنہ، بھارت)

۸۰ کی دہائی میں اردو ناولوں کی پیش رفت تیز ہوئی ہے۔اس دوران اچھے ناول تو لکھے گئے لیکن بڑا ناول نہیں لکھا گیا۔بعض ناول نگاروں کے نزدیک ابھی بھی ناول کا روایتی ڈھانچہ مقدّم ہے۔وہ پریم چندی گھیرے کو توڑ نہیں سکے۔اسی طرح روایتی انداز میں ناول کی کہانی مکالمے کے سہارے آگے بڑھتی ہے۔کردار نگاری اور واقعات نگاری میں کوئی جدّت نظر نہیں آتی۔ناول کی تنقید اس معنی میں غیر معتبر رہی کہ ناول کو کبھی فنّی سطح پر پرکھا نہیں گیا۔ناول کے کنٹینٹ پر ہی ہمیشہ گفتگو ہوئی،اس کے فن پر نہیں۔

دو باتیں ہیں۔کنٹینٹ اور پیش کش۔کنٹینٹ لاکھ بھاری بھرکم ہو پیش کش کمزور ہے تو ناول بڑا نہیں ہوسکتا۔اور کنٹینٹ بھی نیا کیا ہوگا؟ سب کچھ تو لکھا جا چکا۔ہم ہزار بار لکھی ہوئی چیزوں کو ہی دہراتے ہیں۔مہا بھارت، الف لیلیٰ، کتھا سرت ساگر داستان اور شیکسپیر کے ڈراموں کے بعد آپ نیا کیا لکھیں گے؟ صرف پیش کش نئی ہوسکتی ہے۔

پہلے شہنشاہوں کا جبر تھا آج حکمرانوں کا جبر ہے۔پہلے شہنشاہ دربار عام لگاتے تھے آج مکھ منتری دربار عام لگاتا ہے۔پہلے منگولیوں اور تاتاریوں کا خوف تھا۔آج امریکہ کا خوف ہے۔چنگیز خاں اور ہلاکو خاں نے گھوڑے کی ٹاپوں سے زمین کو روند ڈالا تھا۔آج امریکہ بموں کے کارپیٹ بچھاتا ہے اور عراق اور افغانستان کو جلا کر خاک کر دیتا ہے۔چوری ڈاکہ زنی لوٹ مار زنا کاری ریپ اور عام آدمی کا استحصال.....منظر نامہ وہی ہے۔کچھ نہیں بدلا۔آدمی وہی ہے۔اس کا غصّہ اس کی نفرت، محبّت اس کا انتقام اس کی رقابت اس کی دوستی سب وہی ہے۔جب کچھ نہیں بدلا تو آپ نیا کیا لکھ رہے ہیں؟

ناول کو جو چیز بڑا بناتی ہے وہ ہے موضوع کا تخلیقی اظہار، بیانیہ کی جدّت،اور یہ کہ کس طرح ناول کی کہانی بنی گئی۔پیش کش اگر روائیتی اور فرسودہ ہے تو ناول کچرا ہو گا فن پارہ نہیں۔دیکھنا یہ ہے کہ ناول نگار نے کتنے کنونسنگ ڈھنگ سے موضوع کو پیش کیا ہے.ہمارے ناول نگار سمجھتے ہیں کہ ناولوں کا انبار لگا دینے سے وہ بڑے ناول نگار ہو گئے۔لابی کے تحت وہ دوستوں سے خود پر مضامین لکھوانے میں بھی کامیاب ہو جاتے ہیں لیکن ایسی شہرت دائمی نہیں ہوتی۔قاری سمجھتا ہے کہ کون سی تخلیق کس پائے کی ہے۔ایسے ناول آنے والے وقتوں میں بھلا دیئے جائینگے۔کیا وجہ ہے کہ جب اردو کے بڑے ناولوں کا زکر ہوتا ہے تو خدا کی بستی، آگ کا دریا، گریز،ٹیڑھی لکیر اور آنگن سے بات آگے نہیں بڑھتی؟

ہمارے ناول نگار تشبیہات۔استعارے۔منظر کشی۔نفسیات دروں بینی اور تصویر کشی سے بہت کم کام لیتے ہیں۔مکالمے کا سہارا لیتے ہیں اور حقائق کو قاری پر تھوپنا چاہتے ہیں۔جب کردار نگاری کرتے ہیں تو بتاتے ہیں کہ کردار کیسا ہے ''دکھاتے'' نہیں ہیں۔میں ناول کہانی کی مثال پیش کرنا چاہوں گا۔کہانی میں نسوانی کردار کا شوہر مفلوج ہو جاتا ہے۔بیوی شوہر کی خدمت کرتی ہے۔غضنفر لکھتے ہیں کہ '' اس نے شوہر کی ایسی خدمت کی کہ مدر تھریسا کو بھی مات دے دی۔'' پھر کہانی آگے بڑھ جاتی ہے اور منظر نامہ بدل جاتا ہے۔یہ کیسا بیانیہ ہے۔؟؟ غضنفر ''بتاتے'' ہیں کہ اس نے خدمت کی ''دکھاتے'' نہیں ہیں۔تخلیقیت بتانے میں نہیں ہے۔تخلیقیت دکھانے میں ہے۔بتانا تو رپورٹنگ ہے۔انہیں کوئی منظر دکھانا چاہیے تھا۔مثلاً شوہر کھانس رہا ہے اور کھانستے کھانستے بے دم ہو جاتا ہے۔بیوی دوڑ کر جاتی ہے۔اس کا سینہ سہلاتی ہے۔شوہر بلغم اگلتا ہے تو ہتھیلی پر روکتی ہے اور بلغم باہر پھینک کر ہتھیلی صاف کرتی ہے اور اس کا سر سہلاتی ہے۔ہاتھ پاؤں دباتی ہے۔فضلہ صاف کرتی ہے۔پیشاب کی تھیلی پھینکتی ہے۔بدن کو بھیگے کپڑے سے اسفنج کرتی ہے۔اس کے کپڑے بدلتی ہے۔رات بھر سرہانے بیٹھی اونگھتی رہتی ہے۔لیکن غضنفر کچھ بھی نہیں دکھا پاتے ہیں اور یہ کہہ کر شارٹ کٹ سے نکل جاتے ہیں کہ اس نے ایسی خدمت کی کہ مدر تھریسا کو بھی مات دے دی۔یہ جملہ ان کی تخلیقیت پر حرف لاتا ہے۔

حسین الحق کا بھی یہی حال ہے۔ناول فرات میں نوجوان تبریز اپنی گرل فرینڈ سے انگریزی میں کہتا ہے۔

"I want to foke you "

حسین لفظ fuck کو foke لکھتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔بات ختم ہو جاتی ہے۔شائد حسین کہنا چاہتے ہیں کہ تبریز نئی نسل کا نوجوان ہے اور گرل فرینڈ سے جسمانی رشتہ رکھنا چاہتا ہے۔حسین کو یہاں منظر نگاری سے کام لینا چاہیئے تھا۔وہ زرا دکھاتے کہ تبریز گرل فرینڈ کو اپنی بانہوں میں کھینچتا ہے۔وہ کسمساتی ہے اور تڑپ کر اس کی بانہوں سے نکل جاتی ہے۔لڑکا پھر کوشش کرتا ہے اور اس کا ہاتھ کس کر پکڑتا ہے اور اسے چومنے کی کوشش کرتا ہے۔لڑکے کے ناخن لڑکی کے ہاتھ میں گڑ جاتے ہیں۔وہ بے حد غصّے میں لڑکے کا چہرہ پرے کر دیتی ہے۔تب لڑکا چیختے ہوئے کہتا ہے..آئی وانٹ ٹو فک یو۔'' تو بات سمجھ میں آتی کہ لڑکا کس مزاج کا ہے لیکن حسین ایک جملہ انگریزی میں لکھ کر آگے بڑھ جاتے ہیں وہ بھی غلط اسپیلنگ کے ساتھ۔بات اگر انگریزی میں ہو رہی ہے تو اسے رومن رسم الخط میں کیوں درج کرینگے۔اسے اردو رسم الخط میں ہونا چاہیے۔حسین نے بیس سال بعد فرات کا نیا ایڈیشن شائع کرایا ہے۔ہوسکتا ہے اس میں ترمیم کر لیا ہو لیکن فرات ناول نہیں طویل افسانہ ہے۔اس میں ہر کردار کی اپنی الگ کہانی ہے وہ بھی ادھوری۔کردار خود بہ خود اندھیرے میں گم ہو جاتے ہیں۔ پتہ نہیں چلتا ان کا کیا حشر ہوا۔واقعات آپس میں مربوط نہیں ہیں۔صرف ایک نسوانی کردار کو زندہ جاوید کرنے کی کوشش کی ہے۔وہ فسادیوں سے لڑتی ہوئی ماری جاتی ہے۔حسین اسے شہادت کا درجہ دیتے ہیں اور کربلا سے جوڑتے ہیں اور جھوم جھوم کر مرثیہ پڑھتے ہیں۔یہ سب قاری پر تھوپنے جیسا ہے۔

عبدالصمد اپنے سپاٹ بیانیہ کے لیئے جانے جاتے ہیں۔ان کے تقریباً

ایک درجن ناول منظر عام پر آ چکے ہیں لیکن اسلوب میں ابھی تک کوئی ندرت پیدا نہیں ہوئی۔ ابھی ان کا ایک ناول ''اجالے کی سیاہی'' شائع ہوا ہے۔ ناول میں وہی سب باتیں ہیں جنہیں ہم اخباروں میں روز پڑھتے ہیں۔ اخبار کی کترن سے بھی ناول کی کہانی بنی جا سکتی ہے لیکن صمد کا بیانیہ اتنا سپاٹ اور غیر دلچسپ ہے کہ صفحات چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں تو ناول کی قرات میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ''اجالے کی سیاہی'' کا موضوع مسلمانوں کے مسائل ہیں۔ لیکن ناول نگار کا کوئی ویژن سامنے نہیں آتا۔ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ آخر ناول نگار کہنا کیا چاہتا ہے۔ کہانی ایک سادہ لوح انسان مولوی فضل امام کے گرد گھومتی ہے جو مسجد میں امام ہیں لیکن زیادہ پڑھے لکھے نہیں ہیں۔ دینی معلومات بہت کم ہے۔ ان کے دو بیٹے ہیں فہیم اور قسیم۔ فہیم غم جاناں میں الجھ کر لو جہاد کا شکار ہو جاتا ہے اپنے معاشرے اور مسائل کو لے کر قسیم کے ذہن میں چند سوالات کچوکے لگاتے رہتے ہیں۔ ایک دن وہ کاغذ کا ایک ٹکڑہ مولوی فضل امام کے سامنے رکھتا ہے جس پر کچھ سوالات درج ہیں۔ فضل امام کے پاس ان کا کوئی جواب نہیں ہے۔ صمد بھی نہیں بتاتے کہ سوالات کیا ہیں۔ بس کاغذ کا ایک ٹکڑہ ہے جس پر کچھ لکھا ہوا ہے۔ آخر آخر تک یہ عقدہ نہیں کھلتا ہے کہ وہ سوالات کیا ہیں جو نوجوانوں کے دل و دماغ پر ضرب لگاتے ہیں۔ قسیم غم دوراں سے گذرتے ہوئے دہشت گردوں کی صحبت اختیار کر لیتا ہے۔ اور اپنی شدبد کھو بیٹھتا ہے۔ پولیس قسیم کو دہشت گرد سمجھ کر گرفتار کرتی ہے۔ مولوی صاحب کے گھر پر چھاپہ پڑتا ہے۔ قسیم کے پاس سے ایک لیپ ٹاپ برآمد ہوتا ہے جس میں بقول ناول نگار عجیب وغریب باتیں بھری ہیں۔ یہ راز بھی نہیں کھلتا کہ یہ عجیب وغریب باتیں کیا ہیں۔ اصل میں ناول نگار کو خود پتہ نہیں ہے کہ وہ مسائل کیا ہیں جو نئے اذہان کو پریشان کرتے ہیں اور تخریب کاری کی طرف مائل کرتے ہیں۔ ناول نگار نے دہشت گردی کا ذکر بہت سرسری طور پر کیا ہے۔ کردار کی سائکی میں بھی اترنے کی کوئی کوشش نہیں کی ہے۔ واقعات اخبار کی رپورٹ کی طرح بیان ہوتے ہیں جو قاری کو بے چین نہیں کرتے اور نہ کچھ سوچنے پر مجبور کرتے ہیں۔ صمد نے لو جہاد کے بیان میں جدّت پیدہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ محبت موبائل پر گفتگو تک محدود ہے۔ لڑکا فون پر محبت کا اظہار کرتا ہے۔ لڑکی شبہات میں مبتلا رہتی ہے آخر کار چوری پکڑی جاتی ہے۔ لڑکے کی بے رحمی سے پٹائی ہوتی ہے۔ اس کا جسم مفلوج ہو جاتا ہے۔ لڑکی بھی خودکشی کر لیتی ہے۔

ناول نگار کو اپنے کردار سے پوری ہمدردی ہے۔ وہ مولوی فضل امام کو ٹوٹنے نہیں دیتے۔ وہ ان کی سوچ بدل دیتے ہیں۔ فضل امام کو اچانک احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک چھوٹی سی مسجد کے امام صحیح لیکن اپنی بات کہنے کے لیے یہ ممبر بھی کہاں سب کو نصیب ہوتا ہے۔ صمد لکھتے ہیں ''مولوی فضل امام کو لگا کہ وہ اچانک اپنی سطح سے کچھ اوپر اٹھ گئے ہیں...'' مولی فضل خود کو ایک بدلا ہوا انسان محسوس کرتے ہیں اور تمام شکست خوردگی کے باوجود بھی وہ زندگی کو جینے کے لائق سمجھنے لگتے ہیں۔ یہ سب قاری پر تھوپنے جیسا ہے۔ یہ احساس بیانیہ کے بطن سے نہیں ابھرتا۔

مشرف عالم ذوقی کے ناول نالہ شب گیر کا موضوع ہے ''آزاد عورت'' ۔ ذوقی سائمن ڈی بوار سے بہت متاثر نظر آتے ہیں اور اپنے ناول کا خمیر بوار کے اس قول سے تیار کیا ہے کہ ''عورت پیدا نہیں ہوتی، عورت بنائی جاتی ہے۔''

یہ مفروضہ گمراہ کن ہے۔ عورت میں اصل چیز ہے 'نسائیت'۔ سائمن ڈی بوا نے اپنی تصنیف دی نیچر آف سکنڈ سیکس میں اسی نسائیت کی بازیافت کی ہے۔ وہ اگر کہتی ہے کہ عورت پیدہ نہیں ہوتی بنائی جاتی ہے تو ایک طرح سے مرد اساسی سماج میں مرد کی جارحیت کے خلاف پروٹسٹ درج کرتی ہے۔ لیکن سماج عورت میں نسائیت پیدا نہیں کر سکتا۔ ہر عورت اپنا یہ وصف خود لے کر پیدا ہوتی ہے۔ کسی میں اس کی شدّت تیز ہوتی ہے کسی میں مدھم کسی میں خاموش۔ سائمن ڈی بوار کی یہ نسائیت ہی تھی کہ وہ سارتر کو چھوڑ کر میکسکو چلی جاتی ہے اور ایک گھٹیا ادیب کے ساتھ اس کے سیلن زدہ کمرے میں تین ماہ گذار کر آتی ہے۔ ذوقی طنز کرتے ہیں کہ مرد ہمیشہ اپنی مردانگی کے ساتھ جیتا ہے۔ مرد کو مردانگی کے ساتھ جینا بھی چاہیے اور عورت کو اپنی نسائیت کے ساتھ۔ نسائیت سے مراد دبّو ہونا یا کمتر ہونا نہیں ہے۔ مردانگی کے معنی جنسی تشدّد نہیں ہے۔

ناول کے شروع میں ناول نگار نے ایک وضاحتی نوٹ لکھا ہے۔ عنوان ہے'' کچھ نالہ شب گیر کے بارے میں'' مقصد ہے ناول تک قاری کی رہنمائی ہو سکے ۔ لیکن ذوقی کوئی نئی بات نہیں کہتے۔ وہی مرد کی جارحیت اور عورت کے آہ وفغاں کا رونا روتے ہیں۔ وہ عورت کے امپاورمنٹ کے قائل نظر آتے ہیں اور معاشرے میں اسے باوقار اور بے باک دیکھنا چاہتے ہیں۔ میں ان سے کہنا چاہتا ہوں کہ ہر ادیب عورت کے تئیں مخلص ہے اور اسے باوقار دیکھنا چاہتا ہے۔ اردو ادیبوں نے تو مرد کی ذات کو ہی کوسا ہے۔ بیدی کی نظر میں ہر مرد دشاشن ہے۔ کرشن چندر نے عورت کو بے وفائی کا حق دیا ہے اور منٹو ایک طوائف میں بھی باوقار عورت کی بازیافت کرتا ہے۔ مارکیز عورت کو عقلمند اور مرد کو احمق تصّور کرتا ہے۔ ذوقی نے ناہید ناز جیسا نسوانی کردار خلق کیا ہے جو پیدا ہوئی لیکن عورت بنائی نہیں جا سکی۔ یہ آزاد ہے۔ اسے مرد کی بالادستی قبول نہیں ہے۔ بیوی ہونا پسند نہیں ہے۔ یہ عورت سماجی قواعد بدلنا چاہتی ہے۔۔ وہ سمجھتی ہے کہ صدیوں سے عورتوں پر روا مرد کے ظلم وستم کا بدلہ وہ اسی طرح لے سکتی ہے کہ قدم قدم پر مرد کی تذلیل کرے۔ ناہید ناز مصنّف کی آئیڈیل عورت ہے جو اپنے رویّے میں آزاد ہے اور جس طرح چاہے مرد سے انتقام لینے میں حق بہ جانب ہے۔ لیکن ذوقی اپنے اس کردار سے صرف دشنام طرازی کا کام لیتے ہیں۔ وہ منہ پھٹ اور بدتمیز ہے وہ اپنے غصّے کا اظہار بھونڈے پن سے کرتی ہے اور وہی گھسی پٹی باتیں سناتی ہے۔ شائد آزاد عورت کا یہی تصور ذوقی کے ذہن میں ہو۔ ناہید ناز کے چند مکالمے ملاحظہ کیجیے۔

''مرد سو غلطیاں کرے تو پاک صاف، عورت غلطیاں کرے تو آپ چرتر ہین کلٹا، فاحشہ رنڈی اور پتہ نہیں کن ناموں سے پکارنے لگتے ہیں۔ میرے مطابق یہ تمام نام آپ کے ہونے چاہیے مردوں کے نام .... رنڈی مرد۔ بھڑوا مرد... کلٹا مرد... فاحشہ مرد.... آپ نے کائنات کے سب سے حسین تصّور پر اپنی گندگیاں، بدصورتی اور خامیاں چھپانے کے لیے میل ڈال دی... مجرم تو آپ ہوئے۔''

''مذہب آپ کے گندے انڈر ویئر میں ہوتا ہے اور مرد جب تک

عورتوں کے استحصال کے لیے مذہب کو اسی انڈر رویئر سے نکال لیتے ہیں اور مجھے مذہب معاشرہ اور آزادی کا خوف نہ دکھایئے۔

آپ جیسے جونا گڑھ کے ہجڑوں نے مذہب کو عورت کو سماج کو صرف اپنی ملکیت سمجھ رکھا ہے۔ یہ وراثت ایک دن آپ سے چھین لی جائیگی۔''

''ماں باپ ہیں تو ایک حد میں رہنا چاہیئے انہیں کیوں کہ جب ہم بڑے ہوتے ہیں تو ہماری اپنی زندگی کی شروعات ہو جاتی ہے جو ہمیں اپنے طریقے سے جینی ہوتی ہے۔''

''دنیا کے زیادہ تر ماں باپ اپنے بچّوں کے لیے ایک دقیانوسی ماں باپ ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کے وجود کو مشکل سے تسلیم کیا جا سکتا ہے۔''

ذوقی وضاحتی نوٹ میں لکھتے ہیں کہ ''نا فرمانی کی پہلی کہانی دنیا کے پہلے انسان یا پہلے پیغمبر حضرت آدم کی بیوی حضرت حوّا سے شروع ہو جاتی ہے۔'' ذوقی غلط بیانی سے کام لے رہے ہیں۔ پہلی نافرمانی ابلیس کی ہے جب اس نے آدم کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ یہ انسان کے خلاف پہلی سازش تھی جو آسمان میں رچی گئی۔

ذوقی نے اسلوب میں جدّت پیدا کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ لیکن جگہ جگہ ان کی مداخلت فن پر ضرب لگاتی ہے۔ تخلیق کو تخلیق کار سے زیادہ ذہین ہونا چاہیئے۔ ذوقی کے ساتھ مشکل یہ ہے کہ وہ اپنی تخلیق سے زیادہ ذہین نظر آتے ہیں اور اپنے قاری کی آئی۔ کیو پر شک کرتے ہیں۔ اس لیئے بیانیہ میں جگہ جگہ تشریحی نوٹس بھی لگاتے ہیں۔ اس طرح وہ آگے آگے چلتے ہیں اور کہانی پیچھے پیچھے چلتی ہے۔

بیانیہ کے شروع میں تخلیقیت کا رنگ جھلکتا ہے لیکن ذوقی اسلوب کا آہنگ برقرار نہیں رکھ سکے۔ لہجہ اچانک خطیبانہ ہو جاتا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اپنی دانشوری قاری پر تھوپنا چاہتے ہیں۔ یہ دانشوری بیانیہ کے درون سے نہیں ابھرتی بلکہ کسی ڈاکومنٹری کا حصّہ معلوم ہوتی ہے۔ جگہ جگہ مغربی ادب کے غیر ضروری حوالے ملتے ہیں۔ چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے۔

''ایک کالج کی لڑکی جو صبح سویرے اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ایک خالی بس میں بیٹھی اور بس میں سوار پانچ لوگوں نے بے رحمی کے ساتھ بوائے فرینڈ کی موجودگی میں اسے اپنی ہوس کا شکار بنالیا اور چلتی بس سے دونوں کو باہر پھینک دیا۔ یقینی طور پر ایسے واقعات پہلے بھی سامنے آئے تھے۔ لیکن بے رحمی اور درندگی کی نہ بھولنے والی اس مثال نے دلّی کو احتجاج اور انقلاب کا شہر بنا دیا تھا۔ جنتر منتر سے لے کر دلی گیٹ اور انڈیا گیٹ تک ہزاروں لاکھوں ہاتھ تھے جو انقلاب کے سرخ پرچم کے ساتھ ہوا میں اٹھ کھڑے ہوئے۔ بطور مصنّف کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ اکیسویں صدی کی نئی دنیا میں قدم رکھنے کے باوجود آج تک زندگی اور جہلّت کے واقعات میں کوئی کمی کیوں نہیں آئی تو علم نفسیات کی کوئی موٹی کتابیں بھی ہانپ جاتی ہیں۔'' [صفحہ۷۵]

''میں پھر اس خیال کے رتھ پر سوار تھا کہ کتنی عجیب بات ایک مہذّب دنیا میں آج بھی معصوم لڑکیاں بچّیاں عورتیں اپنی آزادی اور حق کا مطالبہ کر رہی ہیں اور ساری دنیا سوئی ہوئی ہے۔ اپنے ہی گھر میں خوف کا پیچھا کرتے ہوئے بڑے ہونے کا خوف، جوان ہونے کا خوف.....'' [صفحہ۸۱]

''عام طور پر مرد اس معاشرے نے مردانگی کے ساتھ سختیاں غیض و غضب، ظلم و ستم اور عیش و نشاط کی ساری کہانیاں خود تک محدود رکھی ہیں اور صدیوں کے فسانے میں مردوں نے ان خوبیوں سے خود کو جوڑ رکھا ہے۔ اس لیئے عورت کی ذرا سی بغاوت یا 'مردانگی کے مظاہرے کو برداشت کرنا اس کے لیے مشکل ہوتا ہے.....''

یہ اقتباسات کسی نئے نکتے کا احساس نہیں دلاتے۔ ذوقی ایک ہی بات کو بار بار دہراتے ہیں جس سے اکتاہٹ پیدا ہوتی ہے۔ لہجہ خطیبانہ ہے جو اسلوب میں نقص پیدا کرتا ہے۔ وہ قدم قدم پر مغربی ادب اور مشاہیر کا حوالہ دیتے ہیں۔ شائد وہ احساس دلانا چاہتے ہیں کہ ان کا مطالعہ وسیع ہے۔ لیکن یہ حوالے اکثر غلط ہوتے ہیں۔ دوستووسکی کے ناول ایڈیٹ سے متعلّق لکھتے ہیں۔

''آپ سامنے والے شخص کے اندر باہر آرام سے جھانک سکتے ہیں اسی طرح جیسے دوستوفسکی کا ایڈیٹ شرمایا ہوا شہزادی کے دل میں پہنچنے کا راستہ تلاش کر لیتا ہے۔''

میں حیران ہوں۔ ایڈیٹ شہزادی کے دل تک کہاں پہنچتا ہے؟ وہ شہزادی کا اغوا کرتا ہے۔ اسے سیلن زدہ کمرے میں قید رکھتا ہے۔ اس کے ساتھ برہنہ سوتا ہے پھر اس کا قتل کر دیتا ہے۔ کافکا کے میٹا مارفوسس کے بارے میں لکھتے ہیں۔''

میٹا مارفوسس....آپ نے یقیناً یہ کہانی پڑھی ہوگی۔ نہیں۔ میں کیڑے میں یا کیڑہ مجھ میں تبدیل ہو گیا، ایسی کوئی بات نہیں۔ مگر وہ تھا یہیں کمرے میں....''

میں کہنا چاہتا ہوں کہ کافکا کا کیڑہ نظام کے جبر اور انسان کی بے بسی کی علامت ہے جب کہ اس ناول میں کیڑا آدمی کی وحشت نا کیوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ دونوں میں کوئی مماثلت نہیں ہے۔ یہاں میٹا مارفوسس کا زکر ہی بے محل ہے لیکن ایسی مثالیں ذوقی کے یہاں بھری پڑی ہیں۔ ہندی ادیب سدرشن نارنگ سے ایک گفتگو میں خود کی پہچان اڈگر ایلن پو سے کرتے ہیں۔ ''میں بہت ہی دل آزار میں ڈوبی کہانیاں نہیں لکھ سکتا۔ اس معاملے میں اڈگر ایلن پو کے قریب ہوں جو زندگی بھر بیمار رہا لیکن آپ اس کی کہانیوں میں بیماری یا دکھ تلاش نہیں کر سکتے۔''

اڈگر ایلن پو بیمار نہیں رہا۔ بیمار کا فکار رہا۔ اس کو ٹی بی تھی۔ اس بیماری کی وجہ سے وہ اپنی محبوبہ کو بھی کھو بیٹھا۔ ایڈگر ایلین پو نشہ ضرور کرتا تھا۔ اس کی موت پر اسرار ڈھنگ سے ہوئی۔ پو کو جاسوسی اور ہارر ادب کا موجد کہا جاتا ہے جس نے پورے مغربی ادب پر اثر ڈالا۔ ذوقی ہارر اور جاسوسی ادب نہیں لکھتے۔ پھر بھی خود کو پو کے قریب محسوس کرتے ہیں یہ بات گلے سے نہیں اترتی۔ حد تو یہ ہے کہ ناگ کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں وہ ندا فاضلی کے اس شعر کو عادل منصوری کا شعر بتاتے ہیں۔

سورج کو چونچ میں لیے مرغا کھڑا رہا<br>
کھڑکی کے پردے کھینچ دیئے رات ہو گئی

# گلیشیئر ٹوٹ رہے تھے

مشرف عالم ذوقی

ڈسکلیمر

زندہ سچائی، زندہ واقعات اور زندہ لوگوں سے اس کہانی کا کوئی تعلق نہیں ہے۔مزے کی بات یہ کہ اس کہانی کا مردہ لوگوں سے بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہم جاگتے ہوئے بھی نیند میں ہوتے ہیں۔ جیسے نیند میں ہوتے ہیں تو ہم زیادہ جاگتے ہیں۔ جیسے آنکھوں کے آگے دور تک پھیلی ہوئی نہ ختم ہونے والی دھند ہوتی ہے۔ یہ دھند ہمیں گلیشیئر پر تیرتے خواب سے برآمد کرتی ہے... یا گلیشیئر میں تیرتے خواب، دھند سے ہمیں دریافت کر لیتے ہیں۔

دھند میں سارے ملک ایک جیسے ہوتے ہیں۔ اور ان کی حقیقت فرضی ہوتی ہے۔ اور یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ یہ کہانی اتنی ہی فرضی ہے جتنا کوئی ملک یا حکمراں....

فرض کیجئے، اس دن گلیشیئر ٹوٹ رہے تھے اور میں خواب کی زمین پر چل رہا تھا۔ مگر اصل واقعہ یوں ہے کہ سورج کی شعاؤں کے کمرے میں داخل ہوتے ہی جب میں بستر سے اٹھا اور پاؤں زمین پر رکھے تو دھم سے آواز ہوئی اور میں اوندھے منہ زمین پر گر پڑا۔ مسلسل دو تین بار گرنے کے اس عمل کے بعد میرا حیران ہونا واجب تھا کہ اچانک ایک رات میں، سات آٹھ گھنٹے کی مختصر بیداری یا نیند کے دوران میرے پاؤں میں کچھ گڑبڑی آ گئی تھی۔ اور یہ گڑبڑی کافکا کے میٹامارفوسس کہیں الگ تھی۔ یہ یقین کرنا مشکل تھا، مگر آئینہ میں خود کے سراپا کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کا شدت سے احساس ہو گیا کہ رات ہی رات میرا ایک پیر، دوسرے سے بڑا، یا دوسرا پیر پہلے سے کہیں چھوٹا ہو گیا ہے۔ اور اسی لئے جسم کا توازن بگڑ چکا ہے۔ جسم کے توازن کو قائم رکھنے کے لئے کسی لاٹھی، ڈنڈے، اسٹیک، ہاکی یا دیوار کا سہارا لینا ضروری تھا۔ اپنی صبح کی تمام ضروریات سے فارغ ہونے کے لئے مجھے مسلسل سہارے کی ضرورت تھی۔ دوبارہ گرنے کا خوف ایسا تھا کہ میں نے خاموشی سے جسم کو سمیٹا۔ ہاتھوں کو دیوار پر رکھا اور اچک کر بستر پر بیٹھ گیا۔ دراصل میں اس بات کا یقین کرنا چاہتا تھا کہ اب بھی میں کسی خواب میں قید ہوں۔ گلیشیئر پر چل رہا ہوں... یا گلیشیئر میرے پاؤں کے وزن سے ٹوٹ رہے ہیں۔ اور یہ سارا عمل خواب میں وقوع پزیر ہو رہا ہے۔ یہ یقین کرنے میں مجھے کافی وقت لگا کہ یہ خواب نہیں ہے، اور اچانک برسوں کی طویل مسافت کے بعد یہ حادثہ میرے ساتھ رونما ہو چکا ہے کہ میرا ایک پاؤں دوسرے سے چھوٹا یا دوسرا اچانک پہلے سے بڑا ہو گیا ہے۔

نیند میں کچھ لوگوں نے جادوگر کا قتل کر دیا

کیا میں بھی ان میں سے ایک تھا؟ ایسے سوال اور جواب دونوں دھند کی آغوش میں ہیں۔ جادوگر کا ایک پریشان کن ماضی تھا۔ بچپن میں وہ بوٹ پالش کرتا تھا۔ جادو کے نئے نئے تماشے دیکھ کر اسے بھی جادوگر بننے کا شوق پیدا ہوا۔ لیکن اس میں اور دوسرے جادوگروں میں فرق تھا۔ جب اسے جادو کے کئی چھوٹے موٹے تماشے دکھانے آ گئے تو اپنی محنت سے وہ اس مقام پر پہنچا جہاں اس نے جادوگری میں کمال کی مہارت حاصل کر لی۔ اس کے ایک اشارے پر گاؤں کے گاؤں جل جاتے تھے۔ اس کے ایک اشارے پر لوگوں کی جیب سے نوٹ اور سکّے غائب ہو جاتے تھے بلکہ کہتے ہیں کہ ایک دن ایک بینک کے قریب سے اس کا گزر ہوا تو بینک میں بھگدڑ مچ گئی۔ بینک کا سارا کیش غائب تھا۔ رجسٹر، فائلیں ہوا میں اڑ رہے تھے اور جل رہے تھے۔ جادوگر کے اس نئے تماشے سے لوگ اب بھی ناواقف تھے۔ بلکہ ایک دن تو اس کے تماشے پر سونے کے شوقین مرد اور زیورات پر جان دینے والی عورتیں حیران رہ گئیں۔ ایک بڑا سا ہال تھا۔ کھچا کھچ لوگ جمع تھے۔ ہال میں اندھیرا تھا۔ اسٹیج پر روشنی کے دائرے میں بڑا سا گول ہیٹ لگائے جادوگر مسکرا رہا تھا۔ روشنی کے دائرے میں اس کا ہاتھ چمکا.... تاریکی میں بیٹھے ہوئے لوگوں کے ہوش اڑ گئے۔ یہ اس کے دائیں ہاتھ کی ہتھیلی تھی۔ روشنی کے دائرے میں اس کی ہتھیلی سے سرخ خون نکل رہا تھا۔ جادوگر کا ایک اسسٹنٹ ایک پلاسٹک کی بالٹی لے آیا۔ شو کو کامیاب بنانے کے لئے جادوگر نے خوف زدہ، پراسرار آوازوں، چیخ اور سسکیوں کا سہارا لیا تھا۔ کرسیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ پھٹی پھٹی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ اس نے قہقہہ لگایا اور ہتھیلیوں سے نکلنے والی خون کی دھار سے بالٹی بھرنے لگی۔ پھر بالٹی لبالب بھر گئی.... اور پھر یوں ہوا کہ بالٹی سے اچھل اچھل کر خون اسٹیج پر بہنے لگا۔ اور خون کی دھار صرف اسٹیج تک نہیں رُکی بلکہ اس وقت لوگوں کی چیخ نکل گئی جب ہال میں جمع تمام لوگوں نے محسوس کیا کہ سرخ خون کی لہریں اسٹیج سے ہو کر اب آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہی ہیں۔ دیکھنے والوں کے ہوش ٹھکانے لگ گئے۔ افراتفری مچ گئی۔ جس کسی کو جہاں کوئی دروازہ نظر آیا، گرتے پڑتے اسی دروازے کی طرف دوڑ لگائی۔ جب وہ باہر آئے تو باہر کی کھلی فضا میں بھی جادوگر کے قہقہے ان کا پیچھا کر رہے تھے۔ پھر ایک آواز آئی۔ جاتے جاتے اپنی جیبوں کی تلاشی لے لیجئے۔ آپ گھڑیاں پہنتے ہیں تو وقت دیکھ لیجئے۔ عورتوں کے گلے میں زیور ہو تو وہ پہلے اطمینان کر لیں کہ یہ زیور اب بھی موجود ہیں یا نہیں۔ تلاشی لی گئی اور جیسا کہ جادوگر نے کہا تھا، کچھ بھی محفوظ نہیں تھا۔ سونے اور چاندی کے زیورات گم تھے۔ یہاں تک کہ ہاتھوں کی انگوٹھیاں بھی غائب تھیں۔ جیب میں پڑے ہوئے چھوٹے بڑے روپے اور سکے غائب تھے.... تماشہ یہ کہ ان سب کی نظروں کے سامنے جادوگر ہال سے باہر آیا۔ اس وقت اس کے بدن پر کافی مہنگا لباس تھا۔ وہ مہنگی گاڑی میں بیٹھا اور اُڑن چھو

ہو گیا۔

'یہ کیسا تماشہ ہے؟'

بہت تھوڑے لوگوں کی ناراضگی کے باوجود سڑک پر اس وقت ایک ہجوم ایسا بھی تھا جو جادوگر کی شان، محبت اور حمایت میں نعرے لگا رہا تھا۔

کسی نے کہا۔ ہماری جیب کٹ گئی۔

ایک خاتون کی آواز آئی۔ میرے زیورات بہت قیمتی تھے

ہجوم خاصہ ناراض تھا۔ سب قربان کر دیجئے جادوگر پر۔ اور بتائیے، کیا آپ میں سے کسی نے اس سے قبل جادو کا ایسا کوئی تماشہ دیکھا تھا؟'

یہ جادوگر کے بھکت تھے۔ اور کسی میں بھی لٹنے اور ٹھگے جانے کے باوجود یہ ہمت نہیں تھی کہ جادوگر کے خلاف ایک لفظ بھی زبان پر لا سکیں۔

دیکھنے والے دم بخود تھے۔ اچانک ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا۔ وہ کچھ جادوگر کے بارے میں کہنا چاہتا تھا مگر یہ دیکھ کر ہجوم میں خوف سرایت کر گیا کہ جادوگر کے ایک بھکت نے ایک جھٹکے سے اس کی زبان کھینچ لی تھی۔ کٹی ہوئی زبان زمین پر کسی مچھلی کی طرح تڑپ رہی تھی۔ کچھ عورتوں کی چیخ نکل گئی۔ ایک شخص آگے بڑھا۔ میں اسے پہچانتا تھا۔ وہ ایک اخبار میں صحافی کی حیثیت سے کام کرتا تھا۔ اس نے اس حادثہ کو محفوظ کرنے کے لئے موبائل نکالا تو ایک بھکت نے اس کا موبائل جھپٹ لیا۔ دوسرے ہی لمحے وہ اپنے ہاتھوں سے محروم تھا۔

دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے گئے تھے۔

'کیا یہاں پولس آئے گی؟'

میرے لئے یہ سوچنا مشکل تھا، کیونکہ اسی لمحہ جادوگر اپنی قیمتی گاڑی پر لوٹ آیا تھا۔ وہ شاہانہ شان سے گاڑی سے اترا۔ گاڑی سے اترتے ہی کچھ بھکتوں نے قومی ترانہ چھیڑ دیا۔ ہیبت اور خوف میں ڈوبے ہوئے لوگ اپنی جگہ منجمد ہو گئے۔ اب سب مل کر قومی ترانہ گا رہے تھے.....

میں نے یہ تمام مناظر اپنی آنکھوں سے دیکھے تھے بلکہ میں ان لوگوں میں شامل تھا جو تماشہ دیکھنے ہال میں جمع ہوئے تھے۔ خون کی بڑی بڑی تیز اور موٹی دھار کو اچھل اچھل کر اپنی طرف بڑھتے ہوئے میں نے بھی دیکھا تھا۔ اور یہ کوئی خواب یا وہم نہیں تھا، میرے کپڑے اس وقت بھی بھیگے ہوئے تھے اور سرخ تھے۔ میں ان کچھ لوگوں میں سے ایک تھا، جو اس وقت جادوگر سے شدید قسم کی نفرت محسوس کر رہے تھے۔ یہ لوگ خوفزدہ تھے اور اس بات سے ڈرے ہوئے بھی کہ جادوگر کہیں بھی ہو، ان کی آنکھوں میں اتری ہوئی نفرت کو محسوس کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اور اس میں کوئی شک نہیں کہ جادوگر کا تماشہ اور کھیل کے باوجود جو نقصان ہونا تھا، وہ ہو چکا تھا۔ اس لئے میں ان بہت تھوڑے لوگوں میں سے ایک تھا، جسے یہ خیال آیا تھا کہ جادوگر کا قتل ضروری ہے۔ ورنہ خون کی یہ دھار پھیلتے پھیلتے کہاں تک پھیل جائے گی، کہنا مشکل ہے۔ اور یہ سوچ بھی غلط نہیں تھی کہ جادوگر اپنے عزائم سے اپنے تمام باغیوں کو کنگال بنا سکتا ہے۔ مثال کے لئے، جیسے آج ہی عورتوں کے زیورات گم ہو گئے۔ مردوں کے چاندی کے سکے کھو گئے۔

میں تماشہ گاہ سے نکل کر گھر آیا تو گھر کا ماحول بدلا ہوا تھا۔ ڈرائنگ روم میں وقت بتانے والی گھڑی بند تھی۔ بلکہ یہ دیوار گھڑی پچھلے تین برس سے بند تھی۔ اور دن تاریخ کے یاد رکھنے کی وجہ یہ تھی کہ اسی دن اسی تاریخ میں جادوگر اپنے نئے تماشوں سے گفتگو کا موضوع بنا تھا۔ میں نے یہ بات گھر میں کئی بار دہرائی کہ بند گھڑی کو گھر میں رکھنا مناسب نہیں۔ اس سے نقصان یہ ہوتا ہے کہ انسان کا چلتا ہوا وقت رک جاتا ہے۔

میں نے پہلی بار باپ کو غصہ میں دیکھا تھا۔ وہ چیخ رہے تھے۔ 'سُنا تم نے۔ دیوار گھڑی کو باہر پھینک آؤ۔'

'مگر کیوں۔'

جواب ماں نے دیا۔' کیونکہ وقت ٹھہر گیا ہے۔ کلینڈر سے مہینے غائب ہو گئے۔ اب گھڑیال کے گھنٹوں اور گھڑیوں کی ضرورت نہیں۔'

میری بہن اداس تھی۔ اس نے وجہ بتائی۔ اس نے بڑی محنت سے گولڑ میں سکے اور روپے جمع کئے تھے۔

'پھر؟'

'غائب ہو گئے۔'

ماں نے بتایا۔ وہ آج بینک گئی تھی۔ پچھلے کئی برسوں سے وہ بینک کے لاکر میں زیورات جمع کر رہی تھی۔'

یہ بات سارے گھر کو پتہ تھی۔ ماں زیورات گھر میں نہیں رکھتی تھی۔ اس نے لاکر خرید رکھا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح بینک جاتی۔ اپنا لاکر کھولتی۔ اور زیورات جمع کرا دیتی۔

میں نے اداسی سے پوچھا۔ پھر کیا ہوا۔

'لاکر خالی تھا۔ وہاں بھیڑ جمع تھی۔ بینک کے سارے لاکر خالی تھے۔ سونے اور چاندی کے تمام زیورات غائب تھے۔'

باپ نے سیاہ چائے کا آخری گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔' اور سُنو۔ یہاں تجوری سے سارے کیش غائب ہیں۔ میں بینک بھی گیا تھا۔ لمبی قطار تھی۔ جب قطار یاد کرتا ہوا میں اپنا پیسہ نکالنے گیا تو معلوم ہوا، میرا نام بینک کے اکاؤنٹ، رجسٹر، کمپیوٹر، آن لائن ریکارڈ کہیں بھی شامل نہیں ہے۔۔۔'

باپ کی آواز دم توڑتی ہوئی اور کمزور تھی۔ سنا تم نے۔ ہم برباد ہو گئے۔

میں دھم سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ سارا گھر اس وقت مجھے گھومتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ یہ سب یقیناً جادوگر کا کیا دھرا تھا۔ مگر تعجب یہ کہ گھر میں بھی کوئی جادوگر کا نام لینے کے لئے تیار نہیں تھا۔

میں نے دیکھا، باپ خاصہ اداس تھے۔ ان کے چہرے پر اچانک جھرّیوں کا جال پھیل گیا تھا۔ وہ اٹک اٹک کر بول رہے تھے۔ ان کا لب ولہجہ

بھاری اور زندگی سے بے زار تھا۔

میں نے مسکرانے کی کوشش کی۔ آپ کیوں فکر کرتے ہیں۔ کیش اور گہنے غائب ہوگئے تو کیا ہوا، سنگاپور، نارتھ کوریا، گھانا، فجی، فیلپائن.... یہ دنیا گھومتے گھومتے کیش لیس تہذیب میں داخل ہوگئی ہے۔

میں نے باپ کو اتنے غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ دہاڑتے ہوئے اٹھے اور میز پر پڑا ہوا پیپر ویٹ میری طرف اچھال دیا۔ ’کیش لیس تہذیب کے لئے کیش تو ہونا چاہئے نا...‘

یہی وہ لمحہ تھا پیپر ویٹ اچھل کر میرے سر پر لگا۔ سر سے ٹکرانے کے بعد، زمین پر گرنے سے آواز ہوئی۔ اور اس آواز سے میں بیدار ہوا تھا۔ اور یہی وہ لمحہ تھا جب میں نے دیکھا کہ سورج کی شعائیں میرے کمرے میں داخل ہو چکی ہیں اور بستر سے اٹھنے کی کوشش میں، میں نے محسوس کیا تھا کہ میرا ایک پیر دوسرے پیر سے چھوٹا ہو گیا ہے۔ میں نے دوبارہ اٹھنے کا فیصلہ کیا۔ کیونکہ اس وقت تک ڈائننگ ٹیبل پر ناشتہ لگ چکا ہوتا ہے۔ اور باپ کو یہ بات بالکل بھی پسند نہیں کہ ناشتہ کے لئے بار بار آواز دی جائے۔۔ دوبارہ آواز آ چکی تھی۔ خود کو بحال کرتے ہوئے میں نے جواب دیا تھا۔ بس پانچ منٹ میں آ رہا ہوں....لیکن سوال تھا کہ اس طرح لڑکھڑاتے ہوئے میں گھر والوں کا سامنا کیسے کروں گا۔ میں نے پانچ منٹ فریش ہونے میں لگایا۔ اس درمیان ایسا کئی بار ہوا جب میں گرتے گرتے بچا۔ دیوار، دروازے کا سہارا لیتے ہوئے میں اپنا جوتا تلاش کر رہا تھا۔ جوتے میں کپڑے کی ایک موٹی تہہ چڑھانے کے بعد میں نے پیر ڈالے تو یہ سوچ کر خوش ہوا کہ جسم کا توازن قائم ہو چکا ہے۔ ہاں جوتے کے تلّے میں کپڑے کی موٹی تہہ ہونے کی وجہ سے مجھے چلنے میں تھوڑی پریشانی ہو رہی تھی۔ مگر اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں اس پریشانی کو اس وقت قبول کر لوں۔

میں ناشتہ کی میز پر آیا تو گھر والے ناشتہ شروع کر چکے تھے۔ میں نے باپ کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر گہری اداسی پسری ہوئی تھی۔ ایک لمحہ کے لئے انہوں نے میری طرف دیکھا۔ پھر پوچھا

’تم نے اخبار دیکھا؟‘

’نہیں۔‘

’کل کچھ لوگوں کو گرفتار کیا گیا ہے۔‘

’کس جرم میں۔‘

باپ نے ایک نوالہ روٹی کا توڑا۔ منہ میں رکھا۔ ’کچھ باغی نیند میں جادوگر کو قتل کرنا چاہتے تھے....‘

’نیند میں؟‘

باپ میری طرف دیکھ کر ہنسے....’کیا تم اسے چھوٹی بات سمجھتے ہو، ان کا لہجہ سنجیدہ تھا۔ ’قتل، قتل ہے۔ اصلیت میں کیا جائے یا نیند میں۔‘

میرے لئے یہ تمام مکالمے بوجھل تھے۔ یہ تمام تفصیلات تھکا دینے والی تھیں۔ اب میں ایک نئے سفر پر نکلنے والا تھا۔ مجھے ان خوفناک، خوفزدہ، سہمے ہوئے ماحول سے خود کو باہر نکالنا تھا لیکن کیا یہ ممکن تھا۔ ممکن نہیں تھا۔ لیکن مجھے ممکن بنانا تھا۔ چہرے سے سنجیدگی کی گرد ہٹانی تھی۔ اور اس کی جگہ رومانیت کے تصور کو دینا تھا۔ میرے سامنے للّی تھی۔ اسے ہمیشہ اس بات کی شکایت تھی کہ میں کبھی وقت پر نہیں آتا۔ وہ ہمیشہ میرے ہاتھوں کو تھام کر کہتی تھی۔ کیسے محبوب ہو کہ ہمیشہ تاخیر ہو جاتی ہے۔ مجھے ہی انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اس نے دھمکی بھی دی تھی کہ آئندہ تاخیر ہوئی تو وہ بریک اپ کر لے گی۔ محبت کے لمحوں میں محبت کے سوا کوئی بھی دوسری بات للّی کو گوارہ نہیں تھی۔ اور وہ اس بات پر خوش ہوتی تھی کہ میں محبت کرنا جانتا ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ محبوبہ پر رومانی باتوں سے کیسے جادو کیا جا سکتا ہے۔

للّی سے ملنے سے قبل پہلا مسئلہ یہ تھا کہ مجھے اپنے حلیہ کو درست کرنا تھا۔ للّی کو اچھے لباس پسند تھے۔ چھینک، کھانسی، زکام، لنگرانا اسے بالکل پسند نہیں۔ ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد میں نے اپنے کمرے تک آنے کے لئے سیڑھیوں کا سہارا لیا تو ایک بار پھر چونک گیا۔ بائیں پیر کے جوتے کے تلّے میں رکھا کپڑا نکل گیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ یہ کپڑا للّی کے سامنے بھی نکل سکتا تھا۔ اسلئے للّی کی ناراضگی کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنے پاؤں کے لئے کچھ بہتر انتظام کرنے تھے۔ اس بہتر انتظام کے لئے ضروری تھا کہ میں سڑک کے اس پار فٹ پاتھ پر جو موچی بیٹھتا ہے، اس سے مشورہ کروں۔

مجھے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ اس وقت موچی کے جوتا بنانے والی جگہ کے پاس ایک لمبی قطار تھی۔ میں نے ایسی کوئی قطار اس سے قبل موچی کے پاس کبھی نہیں دیکھی تھی۔ قطار میں کھڑے لوگوں کے پاس ایک ہی موضوع تھا، یہ لوگ ان باغیوں کو کوس رہے تھے جو نیند میں جادوگر کا قتل کرنا چاہتے تھے۔۔ دھول، گرد، بدبو کا سامنا کرتے ہوئے ایک گھنٹے کے بعد میرا نمبر آیا۔ اس سے قبل کہ میں چھوٹے بڑے پیر کے بارے میں بتاؤں، موچی نے ہاتھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

وہ زور سے ہنسا۔ ’آج امید سے کہیں زیادہ کسٹمر آئے ہیں۔ دیکھئے، آپ کے پیچھے بھی لمبی قطار ہے۔‘

’ہاں۔‘

’سب کا ایک ہی مسئلہ ہے۔ گھبرائیں نہیں۔‘

’پھر آپ کیا کریں گے۔‘

’میں جوتے کے تلّے میں چمڑے کی موٹی تہہ بیٹھا دوں گا۔ پھر آپ کو چلنے میں پریشانی نہیں ہوگی۔‘

کوفی ہاؤس جب میں للّی کے پاس پہنچا تو وہ جانے کی تیاری کر رہی تھی۔ میرے کافی منانے کے باوجود بھی وہ ایک منٹ ٹھہرنے کو راضی نہیں تھی۔ مگر یہ کرشمہ تھا کہ موسم کا حال سنانے پر وہ دوبارہ اپنی کرسی پر بیٹھ گئی۔

'ہاں بہت براموسم ہے۔'

'امید سے کہیں زیادہ بُرا۔'

للّی نے دو کافی کا آرڈر دیتے ہوئے غور سے میری طرف دیکھا۔'اچھا سُنو۔ جب تم میری طرف آرہے تھے، اگر میں غلط نہیں ہوں تو تم تھوڑا سا لنگڑا رہے تھے...'

'موسم بہت بُرا ہے۔'میں نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

'ہاں بُرا ہے۔مگر تم لنگڑا رہے تھے۔'

'خنکی بڑھ گئی ہے۔'

'ہاں بڑھ گئی ہے۔مگر تم لنگڑا رہے تھے۔'

'میری بات چھوڑو للّی۔ دیکھو کوفی آ گئی۔ کوفی پیئو۔ بتاؤ کوفی کیسی ہے....للّی نے کوفی کا پہلا گھونٹ لیا۔اس کے لہجے میں ناراضگی تھی۔کوفی اچھی ہے۔مگر تم...'

اس کی بات سے پتہ نہیں مجھے کیا ہوا کہ میں زور سے چیخا۔'گھٹنی عورت۔ ہاں میں لنگڑا رہا تھا۔ آج سبھی لنگرا رہے ہیں۔تم بھی بہت جلد لنگڑا کر چلو گی۔اور ذرا مجھ پر اعتراض کرنے سے قبل اپنے دانتوں کا جائزہ لو۔دانت پیلے پڑ چکے ہیں۔اور ہاں میرا خیال ہے کہ تمہیں انیمیا ہے۔تمہارے جسم میں خون کا قطرہ دکھائی نہیں دیتا۔تم جب بولتی ہو تو بدبو کا ریلا اٹھتا ہے۔'

میں کچھ اور بھی کہتا، لیکن اچانک دیکھا، للّی اپنی جگہ سے اٹھ گئی تھی۔وہ کافی غصے میں تھی۔ میں نے اسے تیز تیز پاؤں پٹکتے ہوئے کوفی ہاؤس کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔میں حیران تھا۔یہ اچانک مجھے کیا ہو گیا تھا۔محبت کے ان حسین لمحوں میں یہ کون تھا، جو میرے اندر آ گیا تھا۔میری روح کی چھال میں۔میرے جسم کی کینچلی میں۔میرے منہ کی بدبو میں۔کیا یہ الفاظ میرے تھے؟ للّی تو میرے محبت بھرے مکالموں کی دیوانی تھی...پھر میری جگہ یہ کون تھا..؟'

ہم جاگتے ہوئے بھی نیند میں ہوتے ہیں۔جیسے نیند میں ہوتے ہیں تو زیادہ جاگتے ہیں...جیسے آنکھوں کے آگے دور تک پھیلی ہوئی، نہ ختم ہونے والی دھند ہوتی ہے۔یہ دھند ہمیں گلیشیئرس میں تیرتے خوابوں سے برآمد کرتی ہے...

اچانک کچھ لوگوں کے چیخنے کی صدا آئی۔

'باہر بھاگو۔بھیانک طوفان ہے۔'

میں اس اچانک حملے کے لئے تیار نہیں تھا۔لیکن ابھی تو موسم میں ایسی کوئی بات نہیں تھی۔میں نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔آسمان اچانک زرد اور سیاہ ہو گیا تھا۔تیز ہوا گرج کے ساتھ موسم کے بدل جانے کی اطلاع دے رہی تھی۔کافی ہاؤس خالی ہو گیا۔میں لڑکھڑاتے ہوئے گرتا پڑتا کافی ہاؤس سے باہر آیا۔تیز طوفان کی وجہ سے اچانک سڑکوں پر گاڑیاں رُک گئی تھیں۔ہوا کی شدّت اتنی زیادہ تھی کہ کچھ لوگ سڑک پر گرے ہوئے نظر آئے۔میں نے غبار سے بچنے کے لئے دیوار کا سہارا لیا۔وہاں بابا سیمنٹ کا ایک بورڈ پڑا تھا۔میں نے بورڈ کو دونوں ہاتھوں سے تھام لیا۔سڑک پر شور اور ہنگامہ برپا تھا۔اس ہنگامے میں ٹھہر ٹھہر کر جادوگر کا نام بھی لیا جا رہا تھا۔ٹھیک اسی وقت دو پولیس والوں کو وردی میں، میں نے اپنی طرف آتے ہوئے دیکھا۔ان سے بچنے کے لئے ایک ہی راستہ تھا کہ میں خود کو بابا سیمنٹ کے بورڈ کے پیچھے چھپا لوں، میں نے ایسا ہی کیا اور طوفان کے رُکنے کا انتظار کیا...لیکن جلد ہی مجھے اس بات کا احساس ہو گیا کہ یہ طوفان جلد رُکنے والا نہیں ہے۔بھیانک طوفان ہے اور یہ کہنا مشکل ہے کہ طوفان کا اثر کب ختم ہوگا۔

سڑکوں پر افراتفری کا ماحول تھا۔جسے دیکھو بھاگا جا رہا ہے۔میں نے کچھ چھوٹی گاڑیوں کو ہوا میں تیرتے اور اڑتے ہوئے دیکھا۔یہاں سے چلنے اور آگے بڑھنے کی کوشش کی تو جوتا پاؤں سے نکل گیا۔میں نے ہوا میں اپنے جوتوں کو اُڑتے ہوئے دیکھا۔لنگڑاتے ہوئے میں جوتوں کو پکڑنے کے لئے دوڑا۔جوتے اُڑتے ہوئے سامنے والے پٹرول پمپ کی دیواروں سے ٹکرائے تھے۔مگر پٹرول پمپ کی دیوار تک پہنچنا آسان نہیں تھا۔گاڑیاں رموٹر سائیکل اب بھی تیز طوفانی ہوا میں اچھل اچھل کر ادھر اُدھر گر رہے تھے۔ان کے گرنے سے دھما کہ ہوتا۔کچھ گاڑیاں ایسی بھی تھیں، جو ایک دھماکہ کے ساتھ گرتیں اور پھر ان گاڑیوں سے شعلے اٹھتے ہوئے نظر آتے....گرتے پڑتے، توازن کو قائم رکھتے ہوئے، میں کسی طرح پٹرول پمپ تک آ چکا تھا۔مگر یہاں جوتے نہیں تھے۔جوتے غائب تھے۔پٹرول پمپ سے بینک تک جانے والی قطار بھی طوفانی ہوا کا شکار ہو گئی تھی۔اندھیرے کے باوجود پٹرول پمپ کے اندر بنے کمرے میں مجھے روشنی نظر آ رہی تھی۔دھند اور دھیرے دھیرے پھیلتے اندھیرے کے باوجود میں اندر بنے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کچھ لوگوں کو دیکھ سکتا تھا۔وہ سب ٹائی اور سوٹ میں تھے....انہیں طوفانی ہوا، جھکڑ، آسمانی آفت کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی۔میں اچانک چونک گیا۔ایک بار پھر وہ دونوں پولیس والے میری طرف بڑھ رہے تھے۔اب ان پولیس والوں سے بچنا ضروری ہو گیا تھا۔

لڑکھڑاتے ہوئے تیزی کے ساتھ میں نے وہاں سے بھی بھاگنا شروع کیا۔مجھے یقین نہیں تھا کہ اس بُرے موسم میں، مجھے گھر پہنچنے میں کامیابی ملے گی..سڑکوں کا برا حال تھا۔کمزور اور کچے گھر طوفان میں گر گئے تھے۔سڑکوں پر جابجا ٹوٹے ہوئے گھروں کا ملبہ پڑا تھا۔یقیناً ان میں انسان بھی دبے ہوں گے۔سڑک پر اب بھی چیخ پکار کا عالم تھا۔میں جب گھر میں داخل ہوا تو یقین کرنا مشکل تھا کہ میں اس خوفناک طوفان سے زندہ بچ نکلنے میں کامیاب ہوا ہوں.....گھر والوں کو میری آمد سے زیادہ فرق نہیں پڑا تھا۔

'طوفان تیز ہے۔دروازہ بند کر دو۔'

باپ کا لہجہ سرد تھا۔

میں نے دروازہ بند کیا۔طوفان کا شور اس قدر زیادہ تھا کہ کان کے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔

باقی صفحہ ۱۸ پر ملاحظہ کیجیے

# اردو

(غیر مطبوعہ ناول کا ایک باب)

مشرف عالم ذوقی

تاریخ کی گواہی

''تواریخ کے گلیاروں میں
مردار کے گوشت کی بوٹیاں ہیں/
اور آسمان پر
منڈلاتے ہوئے گدھ/
ان میں سے ایک گدھ چپکے سے آکر بیٹھ گیا تھا
بستی حضرت نظام الدین کے،
نور علی شاہ کے مکان کی چھپڑ پر/
ٹھیک یہی وقت تھا
جب فرنگی صاحب انہیں کھوجتے ہوئے آئے تھے......''

صبح سے کوّے کاؤں...... کاؤں کر رہے ہیں......

کوّوں کا کیا...... جگہ نہیں ملی، تو بس آگئے، نور علی شاہ کے گھر...... چھپڑ پر بیٹھ گئے...... اور لگے ایک ساتھ کاؤں کاؤں کرنے......

نور علی شاہ کے جی میں آتا، اٹھائیں پتھر اور بھاگ لیں کوّوں کے پیچھے...... لیکن باہر آتے ہی گلی کے پاگل، بدمعاش اور آوارہ بچوں کی ٹولیاں بھی اُن کے ہمراہ ہولیتیں۔ اور دل مسوس کر رہ جاتے نور علی شاہ......

یاد رکھنے کے لئے صرف ایک شاندار یا عظیم الشان ماضی رہ گیا تھا۔ یا پھر کنکریاں اور پتھر چننے کے لئے — وہ اپنے آج یا اپنے حال سے خوش نہیں تھے۔ بستی حضرت نظام الدین کی تنگ و پر پیچ گلیوں کے درمیان یہ حال ان کا منہ چڑھا رہا ہوتا۔ تھک جاتے یا پریشان ہوجاتے تو غالب کے مزار کے پاس آکر پھول والوں کی چیخ و پکار سنتے، تبلیغی جماعت والی مسجد سے نکلتے — باہر سے آنے والی جماعت کے چہرے میں اپنے لئے امید کی موہوم سی روشنی تلاش کرنے کی کوشش کرتے — یا پھر صدقہ یا غریبوں کو کھانا کھلانے کے نام پر ہوٹل والوں یا کوپن دینے والوں کی چیخ و پکار کا لطف لیتے — کچھ دیر تک اخبار بیچنے والے کی دکان پر بیٹھتے۔ وہاں سے ہو کر کریم ہوٹل کے باوردی دربان کے پاس آکر دو چار باتیں کر لیتے......

پھر اپنے اُسی ویران حجرے میں واپس آجاتے —

جو سچ تھا، وہ تاریخ کے صفحات میں چھپ گیا...... نہیں، چھپا دیا گیا — تاریخ کے گندے نالے میں...... اور نالے سے اٹھتی ہوئی بدبو سونگھنے والے، بھلا کیسے سوچ پائیں گے کہ کبھی 'سلطنت' اور 'شہنشاہیت' کے گزرے قصوں میں ان کی بھی ساجھے داری رہی ہوگی۔ نہیں نور علی شاہ، اس جھانسے سے کام نہیں چلے گا۔ جو کبھی تھا، وہ گزر چکا ہے، اور جو ہے وہ اس گندے نالے سے بھی بدتر ہے، جس کے اردگرد جانے سے بھی لوگ گریز کرتے ہیں۔ دور بھاگتے ہیں۔ بستی حضرت نظام الدین کے اندر چار کھمبے والی گلی۔ گلی کے اندر ایک چھوٹا سا ٹوٹا مکان — کبھی اپنا بھی مکان ہوتا۔ یہ آرزو دل کی دل میں ہی رہ گئی۔ زندگی کٹ گئی تو اسی کرائے کے اصطبل میں۔ باہر دروازے پر ٹاٹ کا جھولتا ہوا پردہ — بہت تھک جاتے تو آلتی پالتی مار کر دروازے پر ہی بیٹھ جاتے۔ دروازے کے سامنے زیادہ تر کنجڑے، قصابوں کے گھر تھے۔ جن کے آوارہ بچے دن بھر اودھم مچاتے ہوئے گلی سر پر اٹھائے رہتے۔ بچوں کے چیخنے، ہنگامے کی آواز انہیں پریشان کرتی، تو گلی سے کئی بار سنی گالیوں کی تھال لئے غصے میں بچوں کو مارنے دوڑ پڑتے — '' مادر...... ہرامیوں...... ماں باپ نے سکھایا نہیں کہ گلی میں کیسے کھیلتے ہیں؟ تعلیم اور تہذیب سے دور کا بھی واسطہ نہیں اور واسطہ رہے بھی کیسے، یہ سب چیزیں تو خاندانی ہوتی ہیں۔ خون میں تہذیب دوڑ رہی ہوتی تو جانتے کہ اچھے گھرانوں کے بچّے زندگی کس طرح گزارتے ہیں۔'

بہت زیادہ غصے میں آجاتے تو فرّاٹے دار گالیاں بکتے ہوئے ہاتھ میں اینٹ یا پتھر اٹھا لیتے اور گلی کے کسی مقام پر کھڑے ہو کر بچّوں کے ماں باپ کے ساتھ سات پشتوں کی فضیحت کر بیٹھتے۔ اس درمیان بچوں میں سے کسی کی جان پہچان والا آجاتا تو سمجھئے جھگڑا شروع ہوگیا۔ اگر کوئی نہیں آتا تو بچّے خود ہی ہلّے رے...... رے...... کرتے ہوئے نور علی شاہ کو دوڑا دیتے۔ بچّوں میں سے کوئی دبی آواز میں منہ بنا کر بولتا، بیٹا...... اور نور علی شاہ سرپٹ بھاگ رہے بچوں کو طرح طرح کی گالیاں بکتے ہوئے رگید دیتے — کمبخت، کمینے...... آگئے نا اپنی اوقات پر...... نور علی شاہ کو بیٹا کہنے کی ہمت کرتے ہو...... جس کا خاندان نواب امجد علی شاہ کے گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔ کم بختوں میرا مذاق اڑاتے ہو۔ افسوس! اب ہمارا زمانہ نہیں ہے — ورنہ مصاحبوں سے کہہ کر خانہ بدوشوں کی طرح یہاں سے اٹھوا نہ دیا ہوتا تو میرا نام بھی بدل دیتے...... نااہلو...... بدبختو......''

ایک بار جو گالیوں کی بارش شروع ہوئی تو پھر کہاں تھمنے والی تھی۔ اس درمیان اسلم کو اس کی خبر لگ جاتی تو وہ انہیں زبردستی کھینچتا ہوا اندر لے آتا۔ نور علی شاہ جھٹکے سے ہاتھ چھڑا کر پھر دروازے پر آجاتے اور باقی بچی گالیوں کی تھال پروسنے میں لگ جاتے۔ چھوٹا بھائی اسلم، یعنی اسلم علی شاہ......

تب بڑی مشکل سے سر پر آنچل ڈالے بڑی بی دروازے پر آتیں۔ بے پردگی کا سامنا ہی ان کی مخالفت کی آخری کڑی ثابت ہوتی۔

''لو بہت ہوگیا، اب اندر بھی آجاؤ۔ ذرا پرانے وقت کا لحاظ رکھو۔ احمد علی شاہ کے خاندان پر رحم کرو......! ذرا سوچو، ان کی روحیں قبروں میں اس منظر کو دیکھ کر کیسے تڑپتی ہوں گی۔''

بڑی بی، بھائی اسلم کے لئے بڑی بی تھیں۔ عمر تھی بتیس سال۔

بڑی بی کو دیکھتے ہی نور علی شاہ کے بدن میں بے چینی چھا جاتی۔ ''ارے تم کیوں آ گئی۔ چلو اندر جاؤ.....' ڈھول میں ڈوبی ہوئی تیز آندھی جیسے ایک جھٹکے میں تھم جاتی۔ بدن میں تہذیب اور اخلاقیات کے گرگٹ تھر کنا اور کانپنا شروع کر دیتے۔ وہ بغیر رکے جھٹ سے اندر چلے آتے اور گالیوں سے کوسنے کی طرف دن کا دوسرا حصہ بھی ڈھلنے لگتا____ وہ بڑبڑاتے رہتے......

''لو دیکھو...... دیکھو بھائیوں...... امجد علی شاہ کے خاندان پر کیا بدنصیب وقت آن پڑا ہے......اب وہ پالکیاں کہاں...... کہاں کے کہار۔ عورتیں غیر محرموں کو شکل دکھانے کے لئے باہر نکلنے لگی ہیں...... ہے ہے...... زمین پھٹ جائے پاک پروردگار......اب کون سا دن دیکھنے کو یہ آنکھیں باقی ہیں؟''

دن بھر کے قصوں میں یہ سارے منظر روز کا حصہ تھے۔ لیکن ابھی ایک اور منظر بچ رہا ہوتا۔ اسلم لاکھ ضبط کے بعد بے قراری کے عالم میں بڑے بھائی کے سامنے، ہوا کے زور سے ہلتی کمزور دیوار کی طرح بیٹھنے کی کوشش کرتا...... ہڈیوں کے ڈھانچے میں جیسے کرنٹ بہنا شروع ہو جاتا— اُٹنگا سا پائجامہ اور کرتا پہنے اسلم اپنی تیلی تیلی بینت جیسی ٹانگوں پر کھڑا ہو جاتا۔

''اچھا بہت مذاق بن چکا ہمارا! ایسا کیوں کرتے ہیں آپ؟''

وہ ایسے دیکھتا جیسے آئنسٹین کے بھگوان کو نہ پوجے جانے کے جرم میں سزائے موت کے طور پر زہر کا پیالہ پینے کی تجویز رکھنے والوں نے سقراط کو دیکھا تھا۔ اور سقراط آنکھیں جھکا کر اپنے بدصورت پیروں کو تاکنے لگا تھا اور خوش ہوا تھا کہ اُس کا انتہائی ٹنڈ منڈ پیر بے وقوفوں اور ناسمجھوں کے چہرے سے زیادہ چمک رہا تھا۔

نور علی شاہ ٹھیک ایسے ہی جھک کر اپنے پیروں کو دیکھتے، آہستہ سے مسکرا دیتے اور اٹھ کر اپنی بیٹھک میں آ جاتے۔

بیٹھک میں آنے تک وقت ٹھہر چکا ہوتا۔ حال سے اوقات کی تنگ گلیوں میں داخل ہونے تک وقت کا مارا' خبطی بوڑھا دوسروں کی نظر بچا کر کب کا ان میں پورا کا پورا اُتر چکا ہوتا۔

ایسے بھی دن ڈھلتا ہے کیا؟

راتیں آسمان پر ٹمٹماتے ستاروں کی طرح اتنی چھوٹی کیوں ہوتی ہیں؟

بچپن سے، اماں کے ہاتھ سے بیلن چوکی چھین کر بنائی گئی ٹیڑھی میڑھی چھوٹی چھوٹی روٹیوں کی طرح......

عمر کے پاؤں پاؤں چل کر تاریخ کے گلیارے میں احساس اور جذبات سے دھینگا مشتی کرتے ہوئے گزرا وقت چہرے پر گہری جھرّیاں چھوڑ گیا تھا......

ان جھرّیوں میں گزرے دنوں کی خلش موجود تھی......

اب کمزوری سما گئی تھی۔ سانسیں تھمنے اور ٹوٹنے لگی تھیں۔ زندگی میں حاصل کے نام پر بس صفر کے خالی خالی سفر تھے......اور سنہرے کل کے آبشار کے شور تھے کہ بس ابھی ابھی تو سلطنت، جاگیریں اور شہنشاہیت کے قصبوں سے نکل کر ٹرین' جمہوریت' کے بے حال اسٹیشن تک پہنچی ہے......

آنکھوں میں آنسو نہیں ہوتے، بس......سوکھی سی گرد ہوتی ہے۔ آنکھوں کو صاف کرتے۔ پائجامہ تھوڑا سا اوپر چڑھا کر، اُکڑوں بیٹھ کر دونوں پاؤں کے پنجوں کو برابر پھیلا دیتے......غور سے پنجوں کو دیکھتے۔

''ہاں، اسے کہتے ہیں خاندانی پاؤں......محراب نما انگوٹھا اور مسجد کے ستون کی طرح ایک دوسرے سے جڑی تنی تنی لمبی لمبی انگلیاں، خوبصورت عورت کے سینے جیسا ابھرا ہوا تلوا— تلوے سے انگوٹھے کی طرف جاتی ہوئی ٹیڑھی میڑھی سڑک— اسی پر تو وہ جان نثار کرتے تھے، اور ابا مرحوم لیاقت علی شاہ فخر سے بتایا کرتے تھے کہ نور علی شاہ دھیان سے سنو، خاندانی لوگ اپنے ہاتھ اور پاؤں سے بھی پہچانے جاتے ہیں۔ خوبصورت سانچے میں ڈھلے ہوئے ...... واللہ کیا کہنے......ہم تو نوابوں کے خاندان سے ہیں۔ ہماری برابری بھی کیا ہے؟''

نواب اور نوابوں کا خاندان...... بدلتے وقت کے سانچے میں نہیں ڈھلے تو بس اسی وجہ سے کہ قدم قدم پر نوابی ہونا ریڈ سگنل کی طرح انہیں روک دیتا تھا۔ زندگی میں کچھ بھی نہیں کیا تو بس اس لئے کہ نوابی خاندان پر انگلی نہ اٹھے۔ اللہ، نوابی خاندان کے بکھرنے کے بعد بھی، ان کی نسلوں نے اس نوابیت، کی عزت بچا تو رکھی تھی۔

ابا میاں لیاقت علی شاہ نے بھی کیا کیا، بس زندگی بھر اُسی کفن کو اٹھائے ڈھوتے رہے۔ نوابوں کی یادگار کے نام پر بس ایک صندوق تھا جو نسل در نسل ہوتا ہوا اب ان کے پاس تھا۔ خدا کی مار کہ اب اس شاہی صندوق کو بھی اسی کباڑ نما دو چھوٹی چھوٹی کوٹھریوں والے دربے میں کون سی جگہ ملی تھی۔ پاخانہ جانے والے راستے کے پاس اسٹور کے استعمال کے لئے تھوڑی سی جگہ تھی، جہاں گھر کی بیکار چیزیں پھینک دی جاتیں، وہیں کنارے۔ یہاں چار کھمبے والی گلی میں مکان ملنے کے بعد بس اس صندوق کو یہی جگہ نصیب ہوئے تھی۔

صندوق اتنا بڑا تھا کہ کوٹھری میں رکھنے کے بعد جگہ اور بھی تنگ ہو جاتی۔ آخر سوچ سمجھ لینے کے بعد بڑے صبر اور آہ کے ساتھ، گندی گلی جانے والے راستے پر صندوق کو رکھ دیا گیا۔ پاخانہ آتے جاتے نور علی شاہ اُس خاندانی صندوق کو درد بھری نظروں سے دیکھتے اور وقت کے کٹّر پن پر گیلی لکڑی کی طرح نم ہو جاتے۔ ماضی کی بھول بھلیّاں میں گم ہونے کی خواہش ہوتی تو صندوق کا تالا کھولتے۔ صندوق کی گرد صاف کرتے ہوئے کُرتا اور پائجامہ دھول سے بھر جاتا۔ کہتے ہیں صندوق قیمتی صندل کی لکڑیوں کا بنا تھا۔ کئی پشتوں تک صندل کی خوشبو نسل در نسل اپنی مہک کی خیرات بانٹتی ہوئی۔ آخر کار یہ خوشبو نسل در نسل اپنی مہک کی خیرات بانٹتی رہی۔ وقت کے حادثوں میں کھو گئی۔ اب اٹھتی لکڑی میں گھسا کر رگڑیئے، تو کم بخت خوشبو نہیں بلکہ ایک عجیب سی بدبو ناک میں منہ میں گھس جاتی ہے۔ لیاقت علی شاہ نے مرنے سے پہلے صندوق کی تالے' چابی نور علی شاہ کے ہاتھ میں سونپی تھی۔

''لے بیٹا، بس یہی تیرے خاندانی ہونے کی نشانی ہے۔ اسے سنبھال کر رکھیو۔'' انہوں نے تالہ اچھی طرح بند کر کے دیکھا، چابی جیب میں رکھی، پھر ابا کی طرف مڑے تو ابا زندگی سے منہ موڑ کر آرام کی نیند سو چکے تھے۔ جیسے بیٹے کو جاگیر

سونپتے ہی شانتی مل گئی ہو۔

لیاقت علی شاہ کے چہلم سے فارغ ہو کر پہلی بار نور علی شاہ نے بے چینی کی حالت میں صندوق کا تالہ کھولا تھا۔صندوق اور پرانی نشانیوں کے بار بار ذکر نے ان کے بدن میں کپکپی پیدا کر دی تھی۔لیکن علی بابا کے کھل جا سم سم کہتے ہی سارا جادو ٹوٹ گیا۔جستجو میں کھوئی آنکھیں پرانے ریشمی کپڑوں میں کم خواب اور نیلم کے ذکر کو ٹٹولتی رہی تھیں۔ایک زنگ لگی تلوار تھی۔دو چار سنہرے برتن تھے۔سرکاریں چھن جانے کے ڈر سے بچائی ہوئی امجد علی شاہ کی 'عبا' اور پگڑی تھی اور تاج نما کوئی چیز تھی جس میں نہ ہیرا تھا نہ یاقوت، نہ نیلم تھا نہ کوہ نور۔یہاں تک کہ سونا پیتل کا پانی تک نہ تھا۔نور علی شاہ نے 'پرکھوں' کی اُس آخری یادگار کو خوف سے دوبارہ اس کے مقام پر رکھ دیا۔ہاں، سوچا— سونے کے برتن پہلے بھی برے دنوں میں کام آئے ہوں گے، اب بھی برے دنوں میں ساتھ نبھائیں گے۔ہاں، اس شاہی لباس کو دوبارہ ان کے مقام پر رکھتے ہوئے ان کے ہاتھوں میں عقیدت کی وہ کپکپی نہیں تھی، جو صندوق کھولتے وقت ان کے ہاتھوں میں خود بخود پیدا ہو گئی تھی۔

دھڑام سے تالہ بند کرتے ہوئے انہوں نے سوچا، نور علی شاہ، کافی وقت گزر چکا ہے......اب بیوی ہے، اور گھر کی ذمہ داری ہے۔اس لئے سوچو کہ اب آگے کیا کرنا ہے۔پشتینی صندوق میں مستقبل کی جامہ تلاشی کے بعد پریشان حال ہونے کا احساس اچانک اُنہیں موجودہ پتھریلی سڑکوں پر کھینچ لایا تھا۔

پرانی بات ہے۔لیاقت علی شاہ کو ہندستانی حکومت کی طرف سے کل پانچ سو روپے شاہی بھتہ ملتا تھا۔بھتے کی رقم میں بدلتے وقت کے ساتھ نہ کمی آئی نہ اضافہ ہوا۔بس یہ بھتہ بندھا رہا۔یہ بھتہ ان کے خاندان کو مل رہا تھا۔زندگی ٹھکانے لگانے کے لئے اسی بھتے کا سہارا تھا۔

کبھی کبھی نئی سرکار بھی ان کے درمیان اس بھتے کے ملنے میں رکاوٹ بن جاتی۔کورٹ کچہری کے دس چکّر لگتے تو یہ بھتہ پھر جاری ہو جاتا— کبھی کبھی کوئی بڑا سرکاری افسر اچانک اُس پر ترس کھا جاتا۔

''اوہ اتنے بڑے خاندان سے ہیں آپ۔لگتا نہیں ہے، جیسے ان کی 'بے گور و کفن' لاش میں اس دور کی 'نوابیت' تلاش کر رہا ہو۔پھر ایک مذاق سے بھرپور ہنسی۔وہ اس ہنسی کو اچھی طرح پہچانتے تھے۔جی حضوری کے قائل تو نہیں تھے، مجبوری تھی اور نتیجے میں بھتہ اب ایک بار پھر بند ہو چکا تھا۔پانچ سو روپے تو مکان کا کرایہ ہی نکل جاتا۔خوشحالی کے نام پر صرف نواب گھرانے کے ہونے کا احساس تھا اور وہ اس احساس کو پوری شان سے نسل در نسل ڈھوئے جا رہے تھے۔

پڑوس میں ہی مختار بنئے کی دکان تھی۔جب تب اُسی دکان کا آسرا تھا— لیکن جہاں کمائی کا کوئی راستہ نہ ہو وہاں اکیلا بنیا بیچارا کہاں تک سودا سامان اُدھار دیتا رہتا۔ایک دن غصے میں آ کر نور علی شاہ کو ادھار دینا بند کر دیا— پڑوسی ہونے اور نوابی شان— سب کوششیں دھری کی دھری رہ گئیں۔مختار کی اکڑ اور ہٹ میں پیٹ کی دوزخ، پگھل پگھل گئی۔گھر میں دو روز سے فاقہ تھا۔جام شہادت قبول کرنے کا وقت آ چکا تھا۔وہ جیسے پہلی بار مختار کے آگے سرنگوں ہو گئے۔

''لو ننگا آیا ہوں، اب بولو! احمد علی کے خاندان کا کوئی آدمی خواب میں بھی کبھی اس طرح ننگا نہ ہوا ہوگا میاں، جیسے میں ہو رہا ہوں، تمہارے سامنے۔چاہو تو مجھے بندھک رکھ لو۔میرا تماشہ بنا لو۔مگر اُدھار بند مت کرو۔''

اور مختار نے جیسے قربانی کے جانور کو ذبح کرنے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی— ''ٹھونگا بنا سکتے ہو آپ۔میاں جی ٹھونگا بنائیے، ہم خریدیں گے۔آس پاس کی کئی دکانوں میں بھی بات کرا دیں گے۔ہر طرح کے چھوٹے بڑے، کلو دو کلو والے— دام مناسب ملیں گے۔''

تب سے وہ ٹھونگا ہی تو بنا رہے ہیں۔شروع شروع میں گھر میں رکھی پرانی کتابیں اور کاپیاں اس کام میں آ گئیں۔پھر سڑکوں سے بیکار پڑے کاغذ اٹھا اٹھا کر گھر لائے جانے لگے۔بیوی بچّے سارا دن کام کرنے پر مجبور تھے۔مہینے میں دو سو سے ڈھائی سو روپے کے ٹھونگے بن جاتے۔مختار نے دو چار جگہوں پر بات کرا دی تھی۔شروع شروع میں تو ٹھونگے پہنچانے وہی جایا کرتے تھے— پھر اسلم بھی جانے لگا۔ہاں، کبھی کبھی دل سے آہ اٹھتی تو زور زور سے چیخنا چلانا شروع کر دیتے۔

''ہے ہے......دیکھو لوگوں......کیا نازک زمانہ آ گیا ہے......امجد علی شاہ کے خاندان والے اب ردّی کے ٹھونگے بھی بنانے لگے ہیں۔''

سب کچھ حسب معمول چل رہا تھا کہ ایک چھوٹا سا واقعہ ہو گیا۔ممکن ہے دوسروں کی نظر میں اس کی بہت اہمیت نہ ہو' لیکن نور علی شاہ کے لئے اس کی اہمیت اتنی تھی' جتنی سمندر میں بھٹک رہے جہاز کے لئے قطب تارے کی۔آکسفورڈ یونی ورسٹی کے پروفیسر ہیکسلے اپنی کتاب کے سلسلے میں ہندستان آئے ہوئے تھے۔در اصل وہ ہندستان کے شاہی گھرانوں اور ان کے زوال پر ایک اہم کتاب ترتیب دے رہے تھے۔اس سلسلے میں پورے ملک میں گھوم گھوم کر انہوں نے کافی 'مواد' اکٹھا کر لیا تھا۔پروفیسر ہیکسلے کو جب نواب امجد علی شاہ کے گمنام خاندان کا پتہ لگا تو وہ خود کو ملنے سے روک نہیں پائے۔چار کھمبوں کی بند گلی میں کار جانے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔اس لئے کار باہر کھڑی کرنی پڑی۔

پروفیسر ہیکسلے کے ساتھ ان کا ایک انڈین فرینڈ بھی تھا جس سے ان کی پرانی خط و کتابت تھی۔کتاب سے متعلق 'مواد' اکٹھا کرنے میں اس نے کافی مدد کی تھی۔

تنگ گلی میں گورے چٹّے انگریز کو دیکھتے ہی کانا پھوسی کا بازار گرم ہو گیا۔بچوں کے علاوہ مختار کی دکان پر بھیڑ لگانے والوں نے بھی حیرت سے گوری چمڑی والے کو دیکھا۔سچ مچ اس وقت ان کی حیرت اپنی حد سے بڑھ کر تھی۔جب اس کے ساتھ والے آدمی نے کسی سے نور علی شاہ کے بارے میں پوچھا۔

مختار نے گردن اچکا اُچکا کر انگریز کو کسی آٹھویں 'عجوبے' کے طور پر دیکھا اور پاس کھڑے گاہک سے طنزیہ لہجے میں بولا ''یہ انگریز سالے تو ہندستان سے چلے گئے تھے، پھر واپس کیسے آ گئے؟''

''نور علی شاہ کو پوچھ رہا ہے۔''

''نور علی شاہ!''

مختار کی ہنسی چھوٹتے چھوٹتے رہ گئی۔ جیسے اچانک اس نے نور علی شاہ کے سراپا میں ان کے بنائے ٹھونگوں کا عکس دیکھ لیا ہو۔ اور حیرت یہ کہ اس وقت بھی اس کے ہاتھ میں وہی ٹھونگا تھا جو نور علی شاہ کے یہاں سے بن کر آیا تھا اور وہ اس میں کسی گاہک کا سودا باندھ رہا تھا۔

پروفیسر ہکسلے اور ساتھ والا حیدر آبادی حیدر آبادی چھوٹے چھوٹے گندے بچوں کی فوج پار کرتے ہوئے نالے پر بنے مکان پر چڑھ گئے — جہاں دروازے پر بھورے رنگ کا ٹاٹ کا پردہ گرا ہوا تھا۔ کسی محلے والے نے دروازے کی کنڈی ہلا کر بانگ لگائی۔

نور علی، بدیس سے کوئی ملنے کو آئے ہیں۔

نواڑ کے پلنگ سے، دھب سے کودے نور علی شاہ۔ پائجامہ کا ناڑا پکڑے ہوئے دروازے کی طرف تیزی سے دوڑ گئے۔ سچ مچ سامنے ایک خوبصورت سا ۴۵۔۴۰ برس کی عمر کا ایک گوری چمڑی والا انگریز کھڑا تھا۔

''ٹوم نور علی شاہ؟'' اس نے نرمی سے پوچھتے ہوئے ہاتھ بڑھایا۔

حیدر آبادی نے بتایا —

''یہ آکسفورڈ سے آئے ہوئے ہیں۔ آپ سے خاص طور پر ملنے کے خواہش مند تھے۔ دراصل آپ کے شاہی خاندان کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔''

اس نے محسوس کیا — ہکسلے بھی ٹوٹی پھوٹی زبان آسانی سے بول پا رہا تھا۔

نور علی شاہ کا چہرہ کھل اٹھا — '' آیئے...... باہر کیوں کھڑے ہیں' اندر آجایئے......''

مگر اندر کون سی جگہ تھی بیٹھنے بٹھانے کے لائق۔ دنیا بھر کے کپڑے پھیلے ہوئے تھے۔ چھوٹے سے برامدے میں الگنی میں پسرے کپڑوں سے پانی اب بھی ٹپک رہا تھا۔ وہیں ایک طرف اسلم اور فاطمہ بیٹھے ٹھونگے بنا رہے تھے۔ بڑی بی سر جھکائے گندے برتنوں کو تیزی سے دھونے میں لگی تھیں۔

غصہ جیسے چڑیے کی طرح اچانک نور علی شاہ کی ناک پر بیٹھ گیا۔

''یہ دیکھئے نوابوں کا خاندان ...... مگر ٹھہریئے ۔ میری عورتیں پردہ کرتی ہیں......''

انہوں نے غصے میں ڈانٹ کر بیوی کو باہر جانے کا اشارہ کیا۔ غصے میں ابلتے ہوئے چیخ پڑے۔

''اب ہماری قدر کہاں؟ قدر تو انگریز جانتے تھے۔ آپ جانتے تھے اور بھارت سرکار نے ہماری بولی لگائی۔ صرف ڈیڑھ ہزار روپے، جس میں ایک سرکاری افسر کے لئے ایک اچھی سی شراب تک نہیں آسکتی اور اب تو یہ تنخواہ بھی بند ہوگئی انگریز بہادر۔

پروفیسر ہکسلے نے ان کے کندھے پر پیار سے ہاتھ رکھا — ''ہم کو معلوم۔ یہی تو جاننے اور پوچھنے ہم آیا......''

اس نے پیار سے بیحد معصوم دیکھنے والی نیلی نیلی آنکھوں سے کسی بچے کی طرح ان کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے گردن ہلائی۔ تب تک مختار بننے کا بھیجا ہوا لڑکا دو بینت کی کرسی لے آیا تھا۔ نواڑی پلنگ پر نور علی شاہ پیروں کو لٹکائے سوچ میں گم ہوگئے۔ یہاں ان کے ملک سے تو کبھی ایک چڑیا بھی ان کی تلاش کرنے نہیں آئی اور کہاں باہر سے...... باہر والوں کی بات ہی نرالی ہے۔

''کوئی تکلف نہیں۔ ہم صرف کچھ پوچھنے آئے ہیں۔''

حیدر آبادی نے ٹائی کی ناٹ ٹھیک کی۔ ترچھی نظروں سے گھر کا جائزہ لیا۔ اڈگی کواڑ سے سہمی ہوئی نظریں ادھر ہی دیکھ رہی تھیں۔ اس درمیان ایک بچہ دو گلاس اسپیشل چائے لے کر آ گیا۔ حیدر آبادی کو گلاس تھامتے ہوئے تھوڑی ہچک بھی ہوئی، مگر گوری چمڑی والے نے آسانی سے شکریہ کہتے ہوئے گلاس تھام لیا اور آہستہ آہستہ چسکی لینے لگا۔

''ہاں امجد علی شاہ کے بارے میں ......ٹوم جو بولے گا، ہم لکھے گا''

اس کے لہجے میں نرمی تھی۔ پھر جیب سے نوٹ بک نکال کر، خالی گلاس نیچے رکھ کر وہ سننے کے لئے بے چین ہو گیا —

تاریخ کی سبز وادیوں کی یادگار پر دھول جم چکی تھی۔ نور علی شاہ آہستہ آہستہ اُس دھول کو صاف کر رہے تھے۔ سب کچھ تو وقت نے چھین لیا تھا۔ کیسی ریاستیں اور جاگیریں ...... پرانے قصوں کے پٹارے کھل گئے تھے۔ راجا مہاراجا کی شان و شوکت کی انوکھی البیلی کہانیاں، عیش و آرام کی عجیب داستانیں — وہ سناتے رہے۔ بتاتے رہے — سب کہانیاں ماضی کا ایک حصہ بن کر رہ گئیں۔

ہندستان تب تقسیم نہیں ہوا تھا۔ لیکن نواب امجد علی شاہ کے پر پوتوں کے نصیب کو گرہن لگ چکا تھا۔ ریاست ختم ہو چکی تھی ۔ جاگیریں حکومت نے چھین لیں۔ محل، شاہی اصطبل سب حکومت نے میوزیم کی شکل میں، اپنی نگرانی میں لے لئے — اب ٹورسٹ آتے ہیں — جاتے ہیں — لاکھوں کے وارے نیارے ہیں اور یہاں، یہ بندہ بیراگی جسے نواب امجد علی شاہ کا وارث بتاتے ہوئے بھی شرم آتی ہے، بھوک سے بے حال ہے — کپڑوں سے ننگا ہے — اور اس پھٹے حال میں صرف 'داستان گو' بن کر رہ گیا ہے...... اوہ...... امجد علی شاہ کا اصطبل دیکھئے، جہاں شاہی گھوڑے باندھے جاتے تھے' وہ آج کی عالیشان عمارتوں اور کوٹھیوں سے بھی اچھے ہیں......

وہ سناتے رہے ۔ انگریز بیچ بیچ میں روک روک کر کچھ سوال کرتا — حیدر آبادی دھیمے سر میں کچھ جواب دیتا۔ انگریز سر ہلاتا، پھر لکھنے میں مصروف ہو جاتا۔

دوپہر کا سورج منڈیروں سے کچھ دور چلا گیا تھا۔ آنگن میں کچھ بدلی سی چھا گئی تھی۔ نور علی شاہ پھر سے اُس زمانے میں پہنچ گئے تھے۔ جذبات کی شدت سے آواز کبھی لڑکھڑا جاتی تھی، رندھ جاتی۔ اچانک وہ چپ ہو گئے — آنکھوں میں گزرے وقت کی دھول پڑ گئی۔

''نشانی......آپ نشانی پوچھتے ہیں؟''

''ہاں یس'' انگریز نے متاثر کرنے والے انداز میں سر کو دوبارہ ہلایا اور بے قراری میں اٹھ کھڑا ہوا۔ گردن سے جھولتا ہوا کیمرہ نکالا اور معصومیت سے بولا۔

''نور شاہ علی ہم ایک پوز چاہتا''......

جھٹ سے فلیش چمکا......اور نور علی شاہ جھب سے کیمرے میں سما گئے۔

''لیجئے...... لیجئے......آواز جذبات کی شدت سے بھاری تھی......اس مرغی کے دربے کی بھی تصویر لیجئے۔ جہاں ہم رہتے ہیں۔ مگر نہیں معاف کیجئے گا یایوں کہہ لیجئے کہ عزت کی خاطر عورتوں کو آپ کے سامنے حاضر نہیں کرسکتا نہیں__

بیشک نہیں۔ کبھی نہیں۔ آپ اِدھر اُدھر کی جتنی مرضی تصویریں لے لیجئے۔''

انگریز کے کیمرے کی فلیش گھر کی بوسیدہ جگہوں پر کئی بار چمکی۔ اس کی آنکھوں میں احسان کا جذبہ چھپا تھا۔

حیدر آبادی نے پوچھا،''کوئی نشانی جو محفوظ رہ گئی ہو......؟''

''ہاں، ہے تو صحیح......''ان کے دل سے سرد آہ نکل گئی''آیئے۔ چلئے' آپ بھی دیکھئے۔''

وہ پاخانہ جانے والے راستے کی طرف بڑھے۔ پھر تھم سے گئے۔ بدبو کا ایک تیز ریلا کھلے سنڈاس سے نکل کر ہوا میں گھل مل گیا تھا۔

''یہ ہم ہیں......''وہ دانت پیس کر بولے__''گوہ اور موت میں نہائے ہوئے__دن رات اسی بدبو کو برداشت کرتے ہیں__اور جیتے ہیں بس۔''

انہوں نے اسلم کو آواز لگائی__ اسلم جو کواڑ کے پیچھے چھپا کھڑا تھا تیزی سے آیا۔ انگریز اور حیدر آبادی کو جھٹکے سے سلام کیا اور بھائی کی آنکھوں میں جھانکا۔

''یہ صندوق......اسے باہر نکالیے۔''

انہوں نے پچھلے کباڑ کی طرف اشارہ کیا۔ پھر انگریز کی طرف دھیان سے دیکھتے ہوئے بولے__

''اس کے اندر جو کچھ بھی ہے وہ دیکھنے کے قابل نہیں ہے، نہ آپ کے کسی کام کا......مگر نشانیاں تو ہیں' اور دیکھئے تو سہی، ان نشانیوں کو کیسی جگہ نصیب ہوئی ہے۔''

انگریز کے فلیش چمکتے رہے۔ تالا کھلنے پر بھی صندوق کے اندر سے دھول گرد کا ایک تیز جھونکا اٹھا۔ انگریز نے ہاتھوں سے ان نشانیوں کا 'لمس' محسوس کیا۔ بے آن، بے رنگ، بے رونق اور اپنی چمک کھوتی نشانیاں......

اس نے پھر ایک تصویر لی۔ اس کا چہرہ مسکرا رہا تھا__ دوسرے ہی لمحے اس کا ہاتھ اپنی جیب میں گیا اور کچھ کرنسی نوٹ اس نے مضبوطی سے نور علی شاہ کے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔ آہستہ آہستہ ان کے ہاتھوں کو تھپتھپایا اور حیدر آبادی کا ہاتھ پکڑ کر باہر نکل آیا۔

وہ کب گئے__ گاڑی کب روانہ ہوئی__ انہیں کچھ پتہ نہیں__ وہ بس بے خبری میں کھو رہے۔ ایک عجیب سی آگ تھی جو اچانک ان کے اندر بھٹی کی طرح دہک رہی تھی۔ بدن تپ رہا تھا۔ سر پھٹا جا رہا تھا۔ نشانیاں...... وہ صرف نشانیوں کے بارے میں غور کر رہے تھے...... نواب امجد علی شاہ کے خاندان کی آخری نشانی......اب اس نشانی کو دیکھنے کے لئے بھی لوگ آیا کریں گے۔ پھر جاتے جاتے دیکھنے کا ٹیکس بھی ادا کریں گے......

وہ بار بار بھڑک رہے تھے...... بار بار پروفیسر ہیکسلے کے کیمرے کا فلیش آن کی آنکھوں میں چمک رہا تھا۔

وہ دیکھ رہے تھے......وہ کھڑے ہیں......گندا سا، اٹھنگا سا پاجامہ اور اس میں جگہ جگہ شکن...... چہرے پر پڑی ہوئی 'جھائیاں' اور 'اجھڑائے' بال......ان کا دبلا پتلا جسم......اور فلیش چمک رہا ہے......

سنڈاس کے پاس، کباڑے کے ڈھیر میں پڑا تاریخی صندوق......صندوق میں پڑی دھول گرد میں ڈوبی صدیوں پرانی نشانیاں__اور فلیش چمک رہا ہے......

زمین پر پھیلے ہوئے برتن۔ الگنی پر سوکھتے ہوئے کپڑے......اور فلیش چمک رہا ہے۔

نور علی شاہ! وہ بہت آہستہ سے مردہ لہجے میں بڑبڑائے......تم صرف نشانی رہ گئے ہو......اپنے پرکھوں کی آخری یادگار۔

زمین پر دونوں پاؤں جوڑ کر وہ غور سے دیکھتے رہے...... ایک عجیب سی کراہیت' ان کی نس نس میں بس چکی تھی۔ وہ بہت غور سے، جھکے ہوئے، اپنے پاؤں کو دیکھ رہے تھے مگر اب سب کچھ انہیں ٹیڑھا میڑھا، لنج پنج نظر آ رہا تھا......

کون تھا؟ کمرے میں واپس آنے تک بڑی بی کے چہرے پر ناگواری کا تاثر چھا چکا تھا__''بڑا بے ادب تھا......''

'بے شرم کہو بھابھی۔' یہ اسلم تھا

''ہاں، بے ادب بھی، بے شرم بھی۔ تم نے دیکھا کیسے گردن اچکا اچکا کر ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا__''

''کیوں نہیں دیکھا۔ اور بھیا بھی ناں......، اسلم غصے سے بڑے بھائی کو دیکھ رہا تھا__ کیا ضرورت تھی، اگلی پچھلی تاریخ دہرانے کی__ کیا مل گیا__''

'یہ......؟'

نور علی شاہ نے ہاتھ آگے کر دیا__ خیرات کہو یا صدقہ......جو آیا وہ کچھ نہ کچھ دے کر گیا__

'بادشاہت کے ختم ہونے کا ڈھنڈھورا پیٹو گے تو صدقہ ہی ملے گا__ میں بولوں، کب تک پرانی تاریخ کے چیتھڑے بچھا کر سوتے رہو گے۔ کہاں کی بادشاہت میاں۔ سمجھو۔ جاگو۔ بادشاہت کو ختم ہوئے بھی سینکڑوں برس گزر گئے۔ اب بادشاہت نہیں ہے۔ بھک منگوں سے بھی بدتر ہیں ہم...... بڑی بی کی آنکھوں میں آنسو مچل رہے تھے__ بھک منگے تو کم بخت شرم و حیا بیچ کر کہیں بھی بیٹھ کر دو وقت کی روٹی تو کھا لیتے ہیں اور ایک ہم ہیں......

''نحوست نہیں پھیلاؤ__ نور علی شاہ کے لہجے میں ٹھہراؤ تھا__

'اللہ دے گا__ چھپّر پھاڑ کر دے گا__'

بے روغن دیوار پر کیل سے لگے، چھوٹے سے شیشے کے ٹکڑے میں اپنے

چہرے کے عکس کو دیکھا نورعلی شاہ نے — اور کسی گہری سوچ میں گم ہو گئے —

پروفیسر ہکسلے کا نورعلی شاہ کے گھر آنا مختار بنئے کے لیے یقیناً ایک بڑی بات تھی۔ یعنی ایک ایسا آدمی جس کا مذاق اڑانے میں اس نے کبھی کوئی کسر نہیں چھوڑی، مگر ایک ودیشی اسے پوچھتا ہوا اس کے گھر آیا تھا۔ دو پہر ۲ بجے کے آس پاس جب ادھار تیل مانگنے کی غرض سے نورعلی شاہ اُس کے پاس گئے تو مختار بنئے کے لہجے میں فرق آ چکا تھا — وہ نہ جھڑکا، نہ پیسے مانگے — بس تیل کی بوتل پکڑائی اور ایک لمحے کو فلاسفر بن گیا۔

''سب اللہ کی مرضی جی۔ فکر مت کرنا۔ اس کی لاٹھی میں آواز نہیں ہے۔'

گھر آ کر نیواڑ کی پلنگ پر لیٹتے ہی مختار بنئے کے چہرے نے ایک بار پھر نورعلی شاہ کو اُداس کر دیا تھا۔ آخر وہ ایسا کیوں بولا — اندر کمرے سے چھوٹے بھائی اسلم علی شاہ اور اس کی بیوی کے جھگڑے کی آواز آ رہی تھی — لڑائی کی وجہ وہی ٹھونگا تھا، جس کے زیادہ اور کم کے سوال پر اکثر ہی دونوں کے بیچ تو تو میں میں کی نوبت آ جاتی تھی۔ پھر تو مغلیہ گالیوں کے دروازے بھی شان سے کھل جاتے۔ کچھ دیر کے بعد یہ جھگڑے رک گئے۔ پلنگ سے اٹھ کر نورعلی شاہ کمرے کی طرف گئے۔ مقصد یہ دیکھنا تھا کہ کتنے ٹھونگے بنے۔ اور اندر کی خانہ جنگی' اب کہاں پہنچی ہے — مگر دیکھ کر ٹھٹک گئے نورعلی شاہ — اسلم بھابھی کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھا تھا۔ اور حسو اس کی جوئیں نکال رہی تھیں۔

'توبہ..... یہ کیا منحوسیت ہے.....'

''نہائے گا نہیں تو جوئیں نہیں پڑیں گی''

ایک طرف ٹھونگے کے ڈھیر پڑے تھے۔ وہاں سے اٹھ کر نورعلی شاہ باورچی خانے کی طرف نکل آئے۔ خالی دیگچی میں کچھ کھانے کی چیزیں تلاش کرتے رہے۔ ناکام رہے تو جیب میں ہاتھ ڈال کر دیکھا۔ پروفیسر ہکسلے کے دیئے گئے پیسوں میں سے پچاس روپے کا نوٹ اب بھی ان کی جیب میں چمک رہا تھا — وقت کا اندازہ لگایا — اور چرمرانے والے دروازے کو کھول کر باہر آ گئے —

گلیاں پار کرتے ہوئے ایک منٹ کو مختار بنئے کی دکان کے پاس رُکے۔ پھر نکڑ کی طرف نکل گئے۔ جہاں غالب اکادمی، غالب کا مزار اور بڑے کے گوشت کی دکانیں ایک قطار سے لگی ہوئی تھیں — کچھ دیر تک خریدنے اور نہیں خریدنے کے درمیان کشمکش چلتی رہی — پھر اندر کی بھوک اس کشمکش میں بازی مار گئی۔ دکان سے گوشت خریدا۔ پولوتھین میں لے کر آگے بڑھے تو تبلیغی جماعت کے جھنڈ کے ساتھ عرب ملکوں سے آئے ہوئے وفد کے آگے رک گئے۔ ایک نوجوان عرب — چہرہ چمکتا ہوا — ہاتھ میں تسبیح — ادھر اُدھر کا موازنہ کر رہا تھا۔ ہاتھ میں پولوتھین کو تھامے چہرے پر چمک لیے ہوئے آگے بڑھے نورعلی شاہ۔ لیکن بات کیسے کریں۔ اردو کے علاوہ تو کچھ جانتے نہیں — لیکن مطمئن ہیں — چلو، یہ کارنامہ بھی کر گزرتے ہیں۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی کافی ہوتی ہے — کئی عرب تو بہت اچھی انگریزی بول لیتے ہیں۔ نوجوان عرب کے ساتھ کئی لوگ تھے۔ نورعلی شاہ ایک دم سے اس کے سامنے چلے گئے — مسکرائیے۔ اشارہ کیا۔

''امپائر...... کنگ ڈم...... یونو...... ہم تھے...... لانگ لانگ ٹائم اگو...... یو نو......''

نوجوان عرب مسکرایا — کچھ عربی میں بولا۔ تسبیح پر ہاتھ کی انگلیاں چل رہی تھیں......

''یونو...... وی...... ہولڈ ان انڈین امپائر...... یونو......''

عرب نے ایک ہندستان نظر آنے والے چہرے کی طرف دیکھا — جو اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا — ہندستانی کے چہرے پر ایک ناگوار سا تاثر ابھرا — وہ کچھ کہنا ہی چاہتا تھا کہ نوجوان عرب نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا......

'یومین......'

''یس...... وی آر...... ونس اپن اے ٹائم...... یونو...... امپائر...... کنگ ڈم ......آئی ام نورعلی شاہ...... یونو......

ہندستانی نے آہستہ سے کچھ کہا۔

عرب نوجوان مسکرایا۔ ہاتھ جیب میں گیا۔ واپس آیا تو ہاتھ میں سو سو کے تین نوٹ دبے ہوئے تھے — نوٹ نورعلی شاہ کی ہتھیلیوں پر رکھا۔ اپنے سخت خوبصورت ہاتھوں سے اس کی ہتھیلیاں دبائیں۔ اور آگے بڑھ گیا —

نورعلی شاہ کے لئے یہی بہت تھا۔ دو تین دنوں کی چھٹی ہو گئی تھی۔

مگر اس کمال کے آئیڈیا' نے آنے والے دنوں کے لیے ان کی راہیں کھول دیں تھیں...... ارے، اپنے باپ دادا کے سنہرے ماضی کو بھی کیش کیا جا سکتا ہے...... اس میں بھلا کرنا ہی کیا ہے — بس ذرا سا ہاتھ پھیلا دینا ہے۔ پرانے بادشاہت کے دنوں کا واسطہ دینا ہے اور......

مسکرائے نورعلی شاہ۔

بھر دے جھولی مری یا محمد —

لوٹ کر در سے جاؤں نہ خالی —

وہ اکیلے کہاں ہیں — ہزاروں لوگ ہیں — جن کی پرورش ہی ولیوں کے ولی کی چوکھٹ سے ہوتی ہے — صبح سے شام تک بس آنے والے لوگوں کا چہرہ پڑھتے رہیے۔ چہرے پڑھتے پڑھتے آسانی سے معلوم ہو جاتا ہے۔ کون پردیسی ہے اور کون دلی کا رہنے والا — بس، پردیسی تو پردیسی ہوتا ہے — ولی کی چوکھٹ سے دن گزارنے والوں کی کمی نہیں اور پچھلی بار ہی تو وہ حسنہ کو لے کر خواجہ غریب نواز کے یہاں گئے تھے۔ خواجہ نے بلایا تھا حسنہ کتنی بار کہہ چکی تھی — خواجہ کے یہاں چلو۔ مرادیں پوری ہوتی ہیں۔

'مرادیں کیا یہاں پوری نہیں ہوتیں...... ہم تو آستانے کے قریب ہیں۔ محبوب اولیاء کے آستانہ کے قریب۔'

'تم سے کون الجھے۔ محبوب اولیاء بھی دعا کریں گے اور خواجہ پیر بھی۔ سب اجمیر جاتے ہیں۔ دلی رہتے ہوئے اجمیر آج تک نہیں گئے ہم —

نور علی شاہ کے دل میں آیا، حسنہ سے پوچھیں ---اجمیر کیا پیدل جاؤ گی۔ ٹرین کے پیسے نہیں لگتے ہیں کیا۔ اور اتنے پیسے کبھی آئے ہی نہیں کہ اجمیر جانا ہو ___ زندگی کی پٹری پر ہزاروں برس پہلے جو بادشاہت کی ریل گزری تھی، وہ اپنی کہانی سینہ بہ سینہ، خاندان در خاندان منتقل ہوتی رہی---بادشاہت کا بوجھ ڈھونے والے کندھے اتنے ناتواں اور کمزور ہو چکے تھے کہ زندگی کی خاردار راہوں سے گزرنا ہی بھول گئے تھے---امجد علی شاہ سے شروع ہوئی کہانی لیاقت علی شاہ اور چچا جان قاسم علی شاہ تک آتے آتے ایک بے رحم اور اذیت ناک داستان میں تبدیل ہو چکی تھی---ابا حضور لیاقت علی شاہ کے ورثے میں تھوڑی تعلیم آ گئی تھی---اس وقت تک نور علی شاہ نے دلّی کی شکل کہاں دیکھی تھی۔ ابا یعنی لیاقت علی شاہ کلکتہ کے اس علاقے میں تھے جو واجد علی شاہ کے نام سے آج بھی یاد کیا جاتا ہے---

## موجِ خوں

ذوقی:

کیسے لکھ پائے تم

اتنا دل دوز المیہ

بغیر خون کے آنسوؤں کے

سچ یہ ہے کہ ذوقی، تم نے ایک عظیم ناول لکھا ہے۔ بیان: اور خون جگر سے لکھا ہے ہر لفظ کثرت استعمال سے گونگا ہو جاتا ہے۔ میرے لفظوں کا بھی یہی حال ہے کہ وہ اس ڈھڑکتے ہوئے ناول کی کیفیات کو بیان کرنے کی قدرت نہیں رکھتے۔ صرف آنکھ میں تیرتے آنسو ہی اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔ اقبال نے داغ پر نظم لکھی تھی جس میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ جس طرح سعدی۔ بغداد کی تباہی پر اور ابن بدروں قرطبہ کی بربادی پر فریادی ہوئے تھے اسی طرح جہان آباد کی تہذیب کا ماتم داغ کے نصیب میں تھے۔ تقسیم ہند اور اس سے پیدا شدہ تباہی پر بہت کچھ لکھا گیا مگر ۶ر دسمبر کی تباہی اس سے مختلف بھی تھی اور اس سے کہیں زیادہ بھیانک بھی کہ اس نے ہمیشہ کے لیے بال مکند شرما جوش جیسے انسان نما فرشتوں شاعر۔ ''پایا تھا آسماں نے جسے خاک چھان کر'' کیسی عظیم تہذیب جس کی تعمیر میں صدیوں تک ہندو مسلمان سب شریک رہے اور اس کا کیسا عبرت ناک انجام......جس پر جان دینے کے لیے اکیلے بالمکند شرما جوش قتل ہونے کے لیے منا اور اس المیہ کو رقم کرنے والے تم......

اس زندہ المیہ کو ناول کی حیثیت سے دیکھنا یا اس پر کچھ لکھنا بھی ستم ہے...... یوں بھی ابھی ہم اس سے پوری طرح گزرے کہاں ہیں، گزر رہے ہیں۔ بقول فیض۔

اماں کیسی کہ موج خوں ابھی سر سے نہیں گزری گزر جائے تو شاید بازوے قاتل ٹھہر جائے

تمدن کی ہر ادا تہذیب کی ہر روش اس قتل عام کی زد میں ہے۔ محسوس سب کرتے ہیں لیکن لفظ سب کو نہیں ملتے کہ درد و داغ و جستجو آرزو کا یہ کارواں اور اس کا یہ سر بازار قتل برداشت ہو بھی جائے تو بیان نہیں ہوتا......(پھر کیا تعجب ہے کہ بال مکند شرما جوش کو بھی آخری بیان کے لیے لفظ نہ ملے ہوں) تم نے بڑی ہنر مندی سے اس آخری بیان کو سر بہ مہر ہی رکھا ہے......مگر اب اس کی امید بھی فضول ہے کہ کوئی آبلہ پا ہمارے بعد بھی ان منزلوں میں بھٹکنے کے لیے کبھی آئے گا۔

تمہارے اس ناول کو ناول کی طرح پڑھنے اور پرکھنے کے لیے ابھی کچھ اور وقت اور کچھ اور فاصلہ درکار ہے۔ ابھی تو ایک ایسا کاری زخم ہے جس سے رہ رہ کر خون ابلتا ہے، اسے میں احتجاج نہیں کہوں گا۔ اسے میں دور حاضر کی گواہی بھی نہیں کہوں گا۔ یہ ناول ان اصطلاحوں سے کہیں بڑا ہے اور ان دو متوازی واقعات کے سلسلے پر قایم ہے جو منا کے قتل اور بال مکند شرما جوش کی موت سے عبارت ہے...... بلکہ یوں کہوں ان دونوں کے ساتھ ایک عظیم تہذیب کے قتل سے عبارت ہے۔ تم نے اسے بڑے اہتمام اور احتیاط سے بیان کر دیا ہے۔ کیسے لکھ پائے تم ایسا دلدوز المیہ بغیر خون کے آنسوؤں کے......! تعجب ہے! یہی غیر حاضر بلکہ شاید غیر موجود 'بیان' ہی سب سے بڑی فرد جرم ہے، جو ایک عظیم تہذیب کے قاتلوں پر عائد ہوتی ہے......مگر سوال یہ ہے کہ سزا وہ دے جس کے ہاتھ خون سے پاک ہوں اور پہلا پتھر وہ مارے جس نے زندگی میں کبھی کوئی گناہ نہیں کیا ہو۔ بے گناہ اب بھی بہت ہی مگر وہ صرف قتل ہونے کے منتظر ہیں......ایک تمہارے ہاتھ میں قلم ہے اس کی عزت کرو جو ایسے دردمند لمحوں کی کہانی اس قدر دلدوزی اور دلدوز انداز میں لکھ سکے۔ یہ بال مکند شرما جوش ایک پوری تہذیب کا نام ہے جو غروب تو ہوتی ہے، مکمل طور پر کبھی مٹتی نہیں کہ انہیں سے تو انسانیت کی رمق زندہ رہتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے ظالموں کے تذکرے اور ۶ دسمبر کی یادیں۔ اس ناول کا محاکمہ دیر طلب ہے جب تک وقت ان زخموں کو بھر نہیں دیتا یہ کام شاید ممکن نہ ہوگا۔

ڈاکٹر محمد حسن

# ''شریکِ گردش''

## حمد

خیال تیرا ہے خوابِ رواں بھی تیرا ہے
شعور وفکر کا حاصل جہاں بھی تیرا ہے

جو راس آئے کسی کو کبھی خلوصِ وضو
نماز تیری ہے وقت اذاں بھی تیرا ہے

جو تیرے قُرب سے منصورِ عصر ہو جائے
میں سوچتا ہوں وہی راز داں بھی تیرا ہے

حیات تیری حقیقت ہے موت تیرا ثبوت
ازل ابد ہی نہیں درمیاں بھی تیرا ہے

یہ جسم و جاں کا تسلسل وجود مٹی!
یہاں بھی تیرا نشاں ہے وہاں بھی تیرا ہے

شریکِ گردش لیل و نہار ہم ہیں مگر
زمیں بھی تیری زمان و مکاں بھی تیرا ہے

مرے خدا ترا عرفاںؔ رکھنے والا بھی
ہے جس کی چھاؤں میں وہ سائباں بھی تیرا ہے

غالب عرفان
(کراچی)

## نعتِ رسول ﷺ

حاضری دوں سرِ دربارِ رسالت کیسے؟
چھُپ سکے گی مِرے چہرے کی خجالت کیسے

روبرو اُن ﷺ کے ہو گویائی کی ہمّت کیسے؟
دور ہو سکتی ہے لہجے کی یہ لکنت کیسے

راس آئی ہے مجھے نعت سے نسبت کیسے !
مجھ پہ ہوتا ہے کرم اِس کی بدولت کیسے

آپ ﷺ کی راہنُمائی میں اُٹھاتا ہوں قلم
ورنہ لکھ سکتا ہوں مَیں آپ ﷺ کی مِدحت کیسے

آج تک یہ نہ کھُلا میرے دلِ عاصی پر
مُجھ کو ہوتی ہے عطا نعت کی نعمت کیسے !

کوئی بتلائے کہ طیبہ کی طرف جاتے ہوئے
ناتواں پیروں میں آ جاتی ہے طاقت کیسے

اُن ﷺ کا ناعِت ہوں تو ہوگی یہ عنایت مجھ پر
مجھے رکھیں گے وہ محرومِ شفاعت کیسے !

آپ ﷺ کے خُلق نے دنیا کو سکھایا ہے نسیمؔ
دل پہ اور ذہن پہ کرتے ہیں حکومت کیسے

نسیم سحر
(راولپنڈی)

# پسِ اشک

انل ٹھکر

(ممبئی، بھارت)

صبح ہوتی ہے شام ہوتی ہے۔رات آ کر ڈھل جاتی ہے اورانسان زندگی کے گرداب میں چکراتا ہوا زندگی گزار دیتا ہے۔ جب کوئی ایسے جھمیلے میں الجھ جاتا ہے تو اسے اپنی سدھ رہتی ہے نہ اوروں کی خبر۔ وہ ایسی اندھی گلیوں میں بھٹکنے لگتا ہے جس کا کوئی سرا اُسے نظر نہیں آ تا۔

میمونہ بیٹھک میں حسبِ معمول وکیل صاحب کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔اختر ابھی تک لوٹا نہیں تھا۔آ ج کل اسے وقت بے وقت گھر لوٹنا شروع کر دیا ہے۔اس کے دیر سے لوٹنے کی فکر کو لے کر اسے خیال آیا ''راہ بھٹکے مرد کو راہ پر لانے کی ایک راہ اللہ نے بتائی ہے۔ وہ یہ کہ اگر اسے اولاد ہو جائے تو بچے کی کلکاریاں، معصوم کی مسکراہٹیں اور اولاد کی ذمہ داری کا احساس اسے راہ پر لا سکتا ہے۔'' ایک رات وہ بھی تھی جب نغمہ کے کمرے سے قے کی آواز آئی تھی تو اس نے جانے کیا کیا اوٹ پٹانگ سوچ کر پریشانی مول لی تھی۔ جب کہ آج وہ ہر گھڑی اس متلی کی آواز سننے کو بے قرار تھی۔ وہ جانتی تھی، یہ اُمید وقت سے پہلے کی ہے۔ پھر بھی ہر وقت متلی کی آواز سننے نغمہ پر نظریں لگائے رہتی۔ جب اُمید بر آتی نظر نہیں آتی تو خیالوں کے جالے بُننے لگتی۔لڑکا ہوا تو جشن منائے گی، رشتہ داروں اور دوست احباب میں مٹھائی بانٹے گی، خواجہ سرا کو بلا کر ڈھولکی کی تھاپ پر ٹھمکوں کی محفلیں رچائے گی، سید فتح شاہ کی درگاہ پر چادر چڑھائے گی۔۔۔لڑکی ہوئی تو؟؟۔۔۔تو کیا !! یہ تو اللہ کی نعمت ہے، جو مرضی چاہے دے دے۔۔۔ سر آنکھوں پر۔۔۔

وہ بن موسم کے بادلوں کی طرح نغمہ کی متلی کے انتظار میں تھی۔

دوسری جانب نغمہ پچھلے کچھ مہینوں سے اپنے ہی سوالوں کے بھنور میں پھنسی ہوئی، ان کے جواب ڈھونڈ رہی تھی۔ وہ سوچتی رہتی۔۔۔ میں تو ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے اپنی ازدواجی زندگی اور خاندان کی خیر وعافیت کی دعائیں مانگتی آئی ہوں۔ پھر یہ سب کیوں؟؟!! کیا کمی رہ گئی ہے میری دعاؤں میں!! نکاح سے پہلے کیسے حسین خواب دیکھے تھے۔۔۔ مستقبل کے لیے۔ زیست کے فلک پر کیسی کیسی اُڑانیں بھرتیں۔۔۔ساس نے ساڑی دلائی۔۔۔ میں نے سوچا۔۔۔ان کے ساتھ کار میں گھومنے جب جاؤں گی تب پہنوں گی۔۔۔۔ان کے ساتھ گھومنا تو درکنار مہینوں ہو گئے، کار میں بیٹھنا تک نصیب نہیں ہوا۔۔۔ کتنا فخر محسوس کیا تھا، جب ساس نے سُہیل سے کہا تھا یہ کار تو ترے بھائی نے تیری آپا کو گھمانے کے لیے خریدی ہے۔ گھر میں سب کتنے خوش ہوئے تھے۔۔۔ یہ سب پانی میں شکل دیکھ کر ناز کرنے جیسا تھا۔تقدیر نے کنکری ڈالی نہیں کہ پانی کا آئینہ گڑ بڑا گیا۔۔۔ میرے مالک، میری کیا خطا ہے؟؟۔۔۔زندگی کے سفر کے لیے ساحل سے روانہ ہوتے ہی کشتی میں سراخ پڑ گیا۔۔۔!!

نغمہ نے ایسے سوالوں سے کچھ دیر کے لیے فراغت پائی تو اپنے آپ سے بڑ بڑا کر اپنی مجبوری اور لاچاری کا نوحہ گنگنانے لگی۔۔۔ اختر میں تمہاری ضرورتوں کو سمجھ سکتی ہوں۔ کبھی یہ ہماری سانجھی ضرورتیں تھیں۔۔۔ تمہیں تلاش ہے، لہراتے جذبات، اُبلتے ولولے، بانہوں میں چٹختے عضو کی ہلکی کراہٹ، گھٹتے سانسوں کا لمس۔۔۔ اختر پیارے، میں اپنا جسم جب تم چاہو تمہیں سونپ سکتی ہوں۔۔۔مگر۔۔۔مگر وہ حرارت جسکی تمہیں تلاش ہے، وہ کہاں سے لاؤں؟؟ جسم کے ٹھنڈے الاؤ کی راکھ میں انگاروں کی آس کے ساتھ بھٹکتی ہوں تو۔۔۔صرف اور صرف راکھ ہی میرے منہ پر اُڑتی ہے۔۔۔ جذبات کی بلندی پر پہنچنے کے زینہ کی پائدانیں ہی ٹوٹ گئی ہیں۔۔۔

اختر نے اپنی ماں کے منہ سے اپنے لیے لفظ کُتا سنا تو وہ Psychical ہو گیا۔اس کا نفسی توازن گڑ بڑا گیا۔ماں کے الفاظ ''تو انسان ہے یا کُتا''اس کی رگوں میں اُتر کر رفتہ رفتہ کُتا اس کی ذہنی علامت بنتا چلا گیا۔ آج کل وہ کُتے کو دیکھتا ہے تو اسے عورت کا خیال آتا ہے۔اور عورت کو دیکھ کر غرّانے کو جی کرتا ہے۔ کبھی کبھی اپنی اس ذہنی تشویش سے نجات پانے کے لیے وہ کسی حکیم، ڈاکٹر کو دکھانے کا ارادہ کرتا، پھر یہ سوچ کر ٹال دیتا کہ کسی غیر شخص کے سامنے اپنے کو کیوں ننگا کیا جائے! ذہنی کیفیت تند ہو جاتی تو وہ سگریٹ جلا لیتا۔شام کا وقت ہوتا تو شراب پینے بیٹھ جاتا۔ کچھ اس طرح سگریٹ اور شراب اس کے رفیق بن گئے۔دل کو کھائے جا رہی خلش سے وہ تنہا جوجھتا رہا اور وہ خلش اسے اندر ہی اندر کھوکھلا کرتی رہی۔اطراف سب کے ہوتے ہوئے بھی اکیلے پن کے قرب نے اسے تنگ مزاج بنا دیا۔

اختر نے دیوار پر آویزاں گھڑی کی جانب دیکھا، راحت کی سانس لیتے ہوئے اپنے آپ کو ہلکا سا محسوس کیا۔ دفتر کا عملہ کام سے فارغ ہو کر گھر جانے کی تیاری میں نظر آیا۔اختر نے ہاتھ اوپر اٹھا کر انگڑائی توڑی، تازہ دم ہونے کے لیے سگریٹ جلایا۔ ابھی وہ دو، تین کش ہی لے پایا تھا کہ ایک شخص سلام کرتے ہوئے اس کے روبرو آ کر ٹھہرا۔اختر نے اسے دیکھا تو محسوس کیا کہ اس نے اُسے کہیں دیکھا ہے، مگر کہاں؟ اسے یاد نہیں آیا۔اس نے سوالیہ نظر سے اسے دیکھا۔ آنے والے نے سمجھ لیا، صاحب نے اسے پہچانا نہیں ہے۔ وہ بولا:

میں، انور سر۔۔۔

اختر کے چہرے پر تجسس برقرار رہا تو اس نے آدمی نے کہا:

سر، آپ نے مجھے مریم میڈم کے گھر کا پتا معلوم کرنے کے لیے کہا تھا۔

اختر کو یاد آیا، ریلوے انسٹیوٹ کے کینٹین کے آدمی کو اس نے یہ کام

سونپا تھا مگر اس بات کو کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ اس دوران اپنے جھمیلوں میں وہ ایسا الجھا کہ مریم ذہن سے اُتری ہوئی تھی۔ آج اس شخص کے آنے سے مریم کی نفرت تازہ ہوگئی۔ اس کا غرور جاگ اٹھا۔ اس کی اُنا پھُنکار اٹھی۔ وہ چست ہوکر بیٹھا۔ آنے والے سے مریم کا پتا لے کر اُسے بخشیش دے کر روانہ کیا۔ وہ اپنے پینے کے ٹھکانے پر پہنچا۔ شہر کے کنارے کی رسٹارنٹ کی کینٹین میں بیٹھ کر شراب پیتے ہوئے، مریم کو شکنجے میں پھنسانے کا منصوبہ بنانے لگا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ مریم کو جرمانہ یا جیل ہو، وہ اسے ایسے بے بس کرنا چاہتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ سونے پر مجبور ہوجائے۔ شراب کے گھونٹ کے ساتھ اس کے شاطر دماغ میں طرح طرح کے داؤ پیچوں کی آمدورفت جاری رہی۔ خیالوں کی اس آون، جاون میں غلطی سے بھی اسے مریم کے تھپڑ کا خیال آجاتا وہ فوراً اسے جھٹک کر الگ کر دیتا اور اپنی سوچ کو اپنے پسند کی تنگ گلی میں لے آتا۔

نفسانفسی کی سنکی گلی میں بھٹکتے ہوئے وہ کتنی پی گیا اُسے اس کا خیال نہ رہا۔ مریم کے تھپڑ پر وہ سوچ کے دردو پیچ بند کرنے میں کامیاب ہوگیا مگر اچانک اسے مریم کی وہ بات یاد آ گئی، جو اس نے تھپڑ مارنے سے پہلے کی تھی ''اپنی Wife کو بلاؤ اور حق جتاؤ تو جانوں'' مریم کے اس طنز آمیز جملے کو اس کی اُنا نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ زیرلب بڑبڑایا۔ ''یہ بات پتے کی کی۔۔۔ حرام زادی، تجھے تو میں نپٹ لوں گا پہلے اپنی Wife کو مے نوشی کی اے۔ بی۔ سی۔ ڈی تو سکھا دوں۔

اختر گھر پہنچا۔ اس نے بیٹھک میں اپنی امّی کو عورت ذات کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنے شوہر کے انتظار میں دیکھا۔ وہ امی کے مرتبہ اور مقام کو نظرانداز کرتے ہوئے آگے بڑھ گیا۔ نہ سلام نہ آداب، میمونہ بیٹے کی بے رُخی دیکھتے رہ گئی۔ اس نے دل میں ٹھان لی۔ آج وہ اختر کے ابو سے کہہ کر ہی رہے گی کہ عارضی طور پر ہی سہی وہ کلب جانا ترک کردیں اور بیٹے کے گھر لوٹنے کے وقت گھر پر ہی رہیں۔ ورنہ وقت گزر گیا تو ایک دن ان کا یہ نالائق بیٹا ان کی بھی نہیں سُنے گا۔

اختر نے خواب گاہ میں آ کر دروازہ دھکیل کر کواڑیں بھیڑ دیں۔

آواز سے چونک کر لیٹی ہوئی نغمہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس نے اختر کے جوتے اور جرابیں اتار کر ایک طرف رکھے۔ الماری سے تولیا اور شب خوابی کا لباس نکال کر پلنگ پر رکھا۔ اختر نے دفتر کا یونیفارم اتار کر تولیا لپیٹا اور غسل خانہ کی جانب بڑھا۔

نغمہ نے دھیمی آواز میں کہا:

میں کھانا لگاتی ہوں۔

اختر رک کر بولا۔

ٹھہرو ابھی نہیں۔

وہ غسل خانہ میں چلا گیا۔ نغمہ نے محسوس کیا کہ آج اختر کے منہ سے بدبو شدت سے آرہی ہے جیسے کسی مِل کی چمنی سے دھواں اُٹھ رہا ہو۔ نغمہ نے اسے لڑکھڑاتے ہوئے بھی دیکھا۔ اختر جلدی سے چھینٹے مار کر منہ پونچھتے ہوئے باہر آیا۔ شب خوابی کا لباس پہنا اور گویا ہوا۔

دو خالی گلاس اور پانی لے آؤ۔

نغمہ کو حیرت ہوئی مگر وہ سوال کرنے کا حوصلہ نہ کرسکی۔ وہ باورچی خانہ سے گلاس اور پانی لینے چلی گئی۔ لوٹ کر نغمہ نے کمرے کی کواڑیں بھیڑ دیں۔ وہ پانی اور گلاس رکھنے تپائی پر جھکی تو دیکھا وہاں ایک شیشی رکھی ہوئی تھی۔ جس میں سُرخ رنگ کا شربت نظر آیا۔ اختر نے شیشی اٹھائی۔ ڈھکن کھولا، کمرے میں بو کا بھبھوکا اٹھا۔ نغمہ نے ناک پر ہاتھ رکھ کر ڈرتے ڈرتے پوچھا:

یہ۔۔۔ یہ کیا ہے؟

شربت۔۔۔ جانِ من۔۔۔ یہ انگوری۔۔ شربت ہے۔

وہ ایسے بکھرتے لفظوں کو سمیٹتے ہوئے بولتا رہا۔

اسے پینے سے۔۔۔ سوئے ۔۔۔ جذبات۔۔۔ انگڑائی لیتے ہوئے جاگ جاتے ہیں۔۔۔ سالی ۔۔۔ تو کئی دنوں۔۔۔ سے برف۔۔۔ برف بنی پڑی ہے۔۔۔ اسے پی۔۔۔ پی سالی۔۔۔ پی شعلے بھڑک اٹھیں گے۔۔۔ تیرے بدن میں۔۔۔ بھڑک اٹھیں گے ہاں۔۔۔ اور تو ماہی بے آب

اختر نے دونوں گلاس میں کواٹر بوتل وسکی انڈیل دی۔ ایک گلاس میں تھوڑا پانی ملایا اور وہ گلاس نغمہ کی جانب بڑھایا۔

پیو۔۔۔ پیو۔۔۔ جیتے جی جنت۔۔۔ نصیب۔۔۔ ہوجائے گی۔

نغمہ نے نفی میں سر کو جنبش دیتے ہوئے کہا۔

میں یہ نہیں پیوں گی۔

تجھے۔۔۔ تجھے۔۔۔ تجھے آج یہ پینی ہی ہوگی۔

میں، میں نہیں پیوں گی۔۔۔ نغمہ کا سُر اونچا ہوگیا۔

اختر نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا۔

شی شی شی، آہستہ۔۔۔ بول۔۔۔ آہستہ۔۔۔

میں نے کہا نا، میں مرجاؤں گی مگر یہ نہیں پیوں گی۔۔۔ نغمہ نے بضد کہا۔

میدان میں اُترنے سے پہلے پہلوان اپنی ران پر تھاپ ٹھوکتا ہے ویسے اختر نے آگے بڑھنے سے پہلے خالص وسکی کا گلاس اٹھایا اور ایک گھونٹ میں پی گیا۔ تلخی سے اس کے منہ سے مانو دھکا نکلا۔ اس نے بانہہ سے منہ پونچھا اور گالی دیتے ہوئے گویا ہوا۔

آج۔۔۔ آج تو میں۔۔۔ پلا کر ہی۔۔۔ چھوڑوں گا۔۔۔ اختر نے آگے بڑھتے اپنے جسم کا توازن سنبھالنے کی کوشش کی۔

اگر آپ زبردستی کریں گے تو میں ممّی کو پکاروں گی۔۔۔ نغمہ نے تنبیہہ کرتے ہوئے کہا۔

تو۔۔۔تو بھڑوی۔۔۔ممّی۔۔۔ممّی کو پکارے گی؟ پکار۔۔۔پکار کر دیکھ۔۔۔حرام زادی۔۔۔میں۔۔۔تجھے۔۔۔تجھے طلاق دوں گا۔۔۔اختر لڑکھڑایا۔

نغمہ کے پیر تلے سے زمین کھسک گئی۔ وہ جیسے گونگی ہو گئی۔ نغمہ کو خاموش دیکھ کر اختر کا حوصلہ بڑھا۔ وہ آگے بڑھا۔ نغمہ کانپتی رہی، ہاتھ جوڑ کر التجا کرتی رہی، اس کی پلکوں پر اشک کے قطرے تھرتھرانے لگے۔ اختر نے قریب آ کر اس کی گردن کو بانہوں میں دبوچا اور گلاس اس کے ہونٹوں کے جانب بڑھایا۔

نغمہ چیخ اٹھی۔۔۔ممّی!

اختر نے زور آزمانے کی کوشش کی تو نغمہ نے اسے دھکیلا۔ وہ لڑکھڑایا۔ اس کے ہاتھ سے گلاس گر کر چور چور ہو گیا۔ شراب فرش پر پھیل گئی۔ تبھی کمرے کا دروازہ کھلا۔ دروازے میں پریشان حال، گھبرائی ہوئی آنکھیں پھاڑے میمونہ کھڑی تھی۔ وہ کچھ کہے اس سے پہلے اس نے اختر کو کہتے سُنا:

حرام زادی۔۔۔تو۔۔۔تو نے۔۔۔میری توہین کی ہے۔۔۔میں۔۔۔میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔۔۔نغمہ نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر گڑگڑاتے کہنے لگی۔

خدارا، ایسا مت کہیے۔ میری جان لے لیجیے مگر آگے کچھ مت کہیے۔

میمونہ چلا اٹھی۔۔۔

اختر دماغ خراب ہو گیا ہے تیرا؟ تجھے میری قسم آگے کچھ بولا تو۔

اس مادر۔۔۔نے میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔۔۔میں اس کا۔۔۔شوہر ہوں۔۔۔اس کے۔۔۔جسم کا۔۔۔بھکاری نہیں۔۔۔میمونہ نے آگے بڑھ کر اسے چانٹا رسید کرتے ہوئے کہا۔

زبان سنبھال کر بات کر نالائق۔

اختر نے اپنے ماں کے چانٹے کی پرواہ نہ کرتے ہوئے نغمہ کی آنکھوں میں حقارت سے دیکھتے ہوئے اپنی بات دوہرائی۔

میں۔۔۔میں تجھے طلاق دیتا ہوں۔

نغمہ نے عاجزی سے اس کے پاؤں پکڑ لئے۔۔۔

آپ کو اللہ کا واسطہ۔۔۔

میمونہ نے التماس کرتے ہوئے کہا۔

خدا کا خوف کھا۔ اپنی ماں کے دودھ کو شرمسار مت کر۔

اختر نے نغمہ کو لات سے دھکیل کر تیسری مرتبہ کہا۔

میں اپنی ماں کی۔۔۔گواہی میں۔۔۔تجھے طلاق دیتا ہوں۔

اللہ کے واسطے تو مجھے اپنے گناہ میں شامل مت کر۔۔۔میمونہ گڑگڑائی۔

اختر نے نکاح کے پاک رشتے کو تار تار کر دیا۔

کمرے میں سناٹا طاری ہو گیا۔

اختر لڑکھڑاتے ہوئے پلنگ پر جا بیٹھا۔ میمونہ نے نغمہ کو بے ہوشی کی حالت میں فرش پر پڑا دیکھا تو اس کے پاس جا کر اس کے گالوں کو تھپتھپا کر اسے ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ تپائی پر رکھے لوٹے سے پانی لے کر اس کے منہ پر چھینٹے دیئے۔ نغمہ نے آنکھیں کھولیں۔ میمونہ نے سہارا دے کر اسے اٹھایا۔ میمونہ کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے! کیا کہے!!! اس نے نغمہ کو دلاسا دیتے اس کا سر اپنے سینے پر لیا۔ نغمہ کی آنکھیں خشک ہو گئی تھیں۔ سسکیاں دم توڑ چکی تھیں۔ میمونہ نے شفقت سے اس کی پیٹھ سہلاتے ہوئے کہا۔

بیٹی، میں نے کہا بھی تھا۔ کچھ دن اور صبر کر لیتی۔

نغمہ نے ساس کے سینے سے سر اٹھایا۔ دو قدم پیچھے گئی۔ اپنے گریباں کو پکڑ کر ایک ضرب میں چاک کیا اور برہنہ سینہ میمونہ کو دکھاتے ہوئے کہا۔

اور کیا صبر کرتی۔

میمونہ نے دیکھا، نغمہ کا سینہ ناخنوں اور دانتوں کے نشانوں سے زخموں کا قبرستان بنا ہوا ہے۔ میمونہ سر سے پا لرز کر رہ گئی۔ لمحہ بھر میں اس کے بدن میں سر سے پا تک غصہ بھڑک اٹھا۔ اس نے نغمہ کی بانہہ تھام کر اسے اختر کے جانب پلٹایا اور غصّے سے گویا ہوئی۔

اس نالائق نے تجھے زخم دئے ہیں جواب میں ویسے ہی زخم تم بھی اسے دو، تاکہ عمر بھر اسے یاد رہے۔۔۔نغمہ بے نور آنکھوں سے سامنے کی دیوار کو تکتی رہی۔ میمونہ نے نیچے سے گلاس کا ٹکڑا اٹھا کر اپنی بات جاری رکھی۔۔۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے کہا ہے، تمہیں اگر کوئی چانٹا مارے تو تمہیں حق پہنچتا ہے تم بھی اتنے زور سے اسے چانٹا مارو۔ اتنی ہی اذیت اسے پہنچاؤ۔ یہ لے کر۔۔۔گلاس کا ٹکڑا اس کی جانب بڑھایا۔

نغمہ نے قطع کلام کرتے ہوئے کہا۔

اللہ تعالیٰ نے آگے فرمایا ہے۔ بہتر ہے، تم اسے معاف کر دو۔

تو کیا، تم اسے معاف کر رہی ہو؟؟

میں تو صرف اپنے مولیٰ کی ہدایت پر عمل کر رہی ہوں۔

میمونہ نے اسے گلے لگایا اور زار و قطار رونے لگی۔

نغمہ بے حس و بے جان کھڑی رہی۔ کچھ دیر بعد اس نے اپنے آپ کو میمونہ سے الگ کیا۔ آہستہ قدموں سے چل کر الماری سے گھر میں پہننے کے کپڑے نکال کر غسل خانہ میں گئی۔

میمونہ کو اپنے شوہر کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ابھی تک نہیں آئے!! وہ تیزی سے باہر جا کر جھانک آئی۔ اسے شوہر کے آنے کے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ وہ واپس لوٹی تو نغمہ کپڑے بدل چکی تھی۔ اس نے برقع ڈالا۔ سینڈل پہنے۔ یہ دیکھ کر میمونہ کا ماتھا ٹھنکا۔ ایک ساتھ خیالوں کا گرداب ذہن میں چکر کاٹ کر گزر گیا۔ نغمہ خراماں خراماں کمرے کے باہر آئی۔ اس کی چال میں بلا کی خود اعتمادی جھلک رہی تھی۔ میمونہ نے اس سے قبل اس کی ایسی چال دیکھی نہیں تھی۔ وہ آگے بڑھی اُسے ٹوکتے ہوئے کہا۔

کہاں جارہی ہو؟

اپنے گھر۔

نہیں بیٹی۔ اس وقت میں تمہیں جانے نہیں دوں گی۔ تمہارے ڈیڈی بھی گھر پرنہیں ہیں۔

نغمہ کچھ کہتی اس سے پہلے بنگلے میں کار کے آنے کی آہٹ ہوئی۔ میمونہ کی جان میں جان آئی۔ وہ بھاگتے ہوئے دروازے پر پہنچی۔ حسبِ معمول بیوی کو دروازے پر دیکھا تو عطاء اللہ مسکرائے۔ ان کے ڈیوڑھی میں داخل ہونے تک تو میمونہ آگے بڑھ کران سے لپٹ کر رونے لگی۔ عطاء اللہ یہ دیکھ کر گھبرا گئے۔ انہوں نے جھٹ سے پوچھا۔

کیا ہوا؟ کیا ہے؟ رو کیوں رہی ہو؟!!

اللہ کا قہر نازل ہوا ہے ہم پر۔

عطاء اللہ نے بیٹھک میں نغمہ کو باہر جانے کی تیاری میں دیکھا تو اور اُلجھن میں پڑ گئے، کچھ سنبھلے تو پوچھا۔

آخر ہوا کیا ہے؟ کچھ بتاؤ گی بھی؟؟

اختر نے نغمہ کو طلاق دے دیا۔

عطاء اللہ ایسے بُت بنے ٹھہرے رہے جیسے کسی نے ابھی ابھی انہیں پتھر سے تراشا ہو۔

کچھ ہی دیر میں ان کے اندر کا وکیل بیدار ہو گیا۔ واقع کی سنجیدگی کو سمجھتے ہی وہ چاک وچو بند ہو گئے انہوں نے میمونہ سے پوچھا۔

اختر کہاں ہے؟

اندر، اپنے کمرے میں۔

وہ اختر کے کمرے میں گئے۔ اختر کھُلی الماری کے قریب ٹھہرا نوٹ گننے میں مصروف تھا۔ عطاء اللہ کے آنے کا اسے خیال نہ رہا اور نا ہی عطاء اللہ نے بیٹے کے کام میں خلل ڈالنا چاہا۔ انہوں نے دیکھا، کمرے میں ٹوٹے گلاس کے ٹکڑے اور کرچیاں بکھری پڑی ہیں۔ فرش شرب سے بھیگا ہوا تھا۔ تپائی پر خالی گلاس میں چند قطرے شراب کے چمک رہے تھے۔ عطاء اللہ کے شاطر ذہن نے اندازہ لگا لیا کہ واقع کیا درپیش آیا ہے۔ وہ خاموشی سے پلٹے۔ بیٹھک میں ان کے داخل ہوتے ہی میمونہ نے سوال کیا۔

کیا کہتا ہے؟

عطاء اللہ نے اس کے سوال پر توجہ نہ دے کر نغمہ سے سوال کیا۔

اس نے تمہیں شراب پینے پر مجبور کیا تھا؟

نغمہ خاموش رہی۔

تم نے شراب پینے سے انکار کیا؟

نغمہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔

عطاء اللہ میمونہ کی جانب رجوع ہوئے۔

تمہارے بیٹے نے بہو کو شراب پینے پر مجبور کیا۔ بہو نے نہیں مانا۔ اس نے نشے میں اپنی بیوی کو طلاق دے دیا۔ یہ غیر قانونی ہے۔۔۔ میمونہ نے طیش میں آ کر کہا۔

یہ شریعت کا دائرہ ہے قانون کا نہیں۔ البتہ یہ حرکت غیر مہذبانہ ہے۔ ان کی بحث سے لاتعلق نغمہ نے کہا:

ماموں جان، میں اپنے والدین کے پاس جانا چاہتی ہوں۔

نغمہ نے عطاء اللہ کو ڈیڈی نہ کہہ کر ماموں جان کہہ کر مخاطب کیا، یہ بات میاں بیوی کے دلوں کو نشتر لگا گئی۔ ان دونوں کی زبان سِل گئی۔ لمحہ بھر انتظار کے بعد نغمہ گویا ہوئی۔

مُمانی، میں چلتی ہوں۔۔۔ نغمہ نے قدم بڑھایا۔

رشتے کے ایک اور دھاگے کو ٹوٹتا دیکھ کر میمونہ فوراً راستہ روکتے ہوئے بولی۔

بیٹی اس طرح جلدی مت کرو، ہمیں سوچنے کا وقت دو۔

سوچنے سے طلاق میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ طلاق ہی رہے گا یہ ایک شوہر کا فیصلہ ہے۔

یہ تو ہے بہو مگر اس وقت، دیر رات میں یہ خبر سُن کر تمہارے اور میرے والدین پر کیا گزرے گی؟ کل صبح بات کریں گے۔ عطاء اللہ کی آواز میں بے بسی تھی۔

خبر کا ضرب رات میں لگے یا دن میں، درد میں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ جتنی جلد یہ خبر ان کو مل جائے، یہ بہتر ہے۔

عطاء اللہ نے اپنی بیوی کی جانب دیکھا۔ دونوں پس وپیش میں مبتلا ہو گئے۔ تبھی اختر دونوں ہاتھوں میں نوٹ لے کر لڑکھڑاتے ہوئے داخل ہوا۔ اس نے اپنے والد کو دیکھا تو تھوڑا ہچکچایا مگر فوراً نوٹوں والا ہاتھ نغمہ کی طرف بڑھا کر بولا:

یہ لے، تیرے مہر کی رقم۔

مہر معاف کیا میں نے۔

اختر کی آنکھوں خون اُتر آیا۔ اس نے دوسرا ہاتھ آگے بڑھایا۔

یہ تیرے تین مہینے کی نان ونفقہ کی رقم۔

مجھے اس کی ضرورت نہیں۔ چاہو تو خیرات کر دینا۔

عطاء اللہ نے دیکھا، اختر پیا ہوا ہے۔ نغمہ اپنی خوداری پر اڑی ہوئی ہے۔ ٹکراؤ کے پورے امکانات ہیں۔ انہوں نے اختر کو ذرا سختی سے کہا۔

یہ سب بعد میں دیکھیں گے۔ تم اندر جاؤ، جا کر سو جاؤ۔

اختر اندر گیا تو میاں بیوی نے نغمہ کو رات بھر کے لیے رُک جانے کے لیے سمجھانے کی کوشش شروع کر دی۔ وہ نہیں مانی اور اکیلے جانے کی بات پر اڑی رہی تو عطاء اللہ نے میمونہ سے کہا:

ٹھیک ہے، ہم چھوڑ آتے ہیں۔ تم کپڑے بدل لو۔

# رخصتِ سحر گاہی

شہناز خانم عابدی
(کینیڈا)

وہ رات اس کے بیاہ سے ایک دن پہلے کی رات تھی۔

نینداس سے کوسوں دور تھی وہ اپنے نرم نرم بستر پر کروٹیں بدل رہی تھی۔ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے بستر میں کانٹے چبھے ہوئے ہوں۔اس کا دل ایک نا معلوم خوف سے دھڑک رہا تھا۔اس کی روح اپنے بوجھل بدن سے نکل کر کمرے کی ہر بڑی چھوٹی چیز سے لپٹ لپٹ کر روتی ہوئی،گھر کی دیواروں سے گلے ملتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

نصف سے زیادہ رات تک پورا گھر جاگتا رہا تھا دھوم دھام،چہل پہل،گہما گہمی،گانا بجانا ہوتا رہا تھا۔اس وقت رات کے دو بج رہے تھے۔رات کا سناٹا دبی دبی سرگوشیاں کر رہا تھا۔برابر ہی ایک چار پائی پر اس کی دادی موٹی سی رضائی میں سمٹی سمٹائی گٹھری سی بنی پڑی تھیں۔ان کے خرّاٹے کمرے اور دالان میں چھائے ہوئے خوابناک سکوت کو چونکا چونکا دیتے۔برابر والے کمرے میں اس کا باپ،ماں اور چھوٹا بھائی اور دالان میں مہمان عورتیں اور بچے سوئے ہوئے تھے۔لمبی بوجھل رات اس کے دل پر چٹان کی مانند چھا گئی تھی۔وہ بار بار پہلو بدلتی رہی،جلتی آنکھوں سے خلاء میں نجانے کیا تلاش کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔اس کے کمرے کے بڑے سے طاق میں ایک چھوٹی سی لالٹین روشن تھی،ہلکی ہلکی روشنی کی زرد کرنیں تاریکی کے پردے پر جال سا بن رہی تھیں۔دالان میں ایسی دو اور لالٹین اندھیرے سے کشمکش کر رہی تھیں۔ایک اس کے کمرے کے دروازے کے پاس اور دوسری کچھ فاصلے پر دالان سے صحن تک پہنچنے والی سیڑھیوں کے نزدیک رکھی تھی۔

وہ آہستہ سے اٹھی،پلنگ پر سے اتر کر دالان میں سوئی عورتوں اور الٹے سیدھے پڑے ہوئے بچوں سے بچتی بچاتی دالان کی سیڑھیوں تک پہنچ گئی۔اس نے سیڑھیوں کے ساتھ رکھی ہوئی گھڑونچیوں پر ہاتھ رکھا احساسات کی انگلیوں سے ان مٹکیوں کو چھوا پھر اس کی نگاہیں سیڑھیوں پر سے اتر کر آنگن میں پھیل گئیں۔وہ وہیں سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔چاروں اور رات کا پورا تسلط تھا۔تاریکی سائیں سائیں کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی،اس نے آنکھیں ملیں اور غور سے تاریکی میں جھانکا۔اسے نہ تو بیچ آنگن میں کھڑا امرود کا درخت نظر آیا اور نہ اسکی نگاہیں اس پیڑ تک پہنچ سکیں جس کے سائے میں اس کی پیاری لیلیٰ اس کی مانند جاگ رہی تھی یا شاید نیند کے آغوش میں پہنچ گئی تھی۔اس نے باہر کی جانب اپنے کان لگائے کہ شاید لیلیٰ کی گردن میں پڑے ہوئے گھنگھرو بج رہے ہوں۔لیکن اسے کچھ سنائی نہیں دیا۔اس نے ڈالیوں اور پتوں کی سرسراہٹ کی آہٹ لی لیکن وہاں سناٹے کے سوا کچھ نہ تھا البتہ جھینگروں کا شور اس کے اعصاب پر ابھرنے لگا۔

رات کے چار بج گئے صبح کاذب کی ہلکی سی روشنی سارے آنگن میں رینگنے لگی۔امرود کے پیڑ کی ڈالیاں،ٹہنیاں،پتوں کے جھنڈ کسی غیر مرئی مخلوق کی ما نند دکھائی دینے لگے۔آسماں پر دودھ کے چھینٹے پڑ گئے اور دور آنگن کے ایک کنج میں پیڑ کا سایہ کسی لاٹھی ٹیک کر چلنے والے بوڑھے کی مانند دکھائی دینے لگا۔اس کی نگاہیں نیچے اتریں لیلیٰ کا سفید بدن کسی معصوم فرشتے کا روپ دھارے پیپل تلے کھڑا تھا۔وہ یونہی سوچتی رہی۔اسے اچانک خوف ہوا اگر اسے کسی نے یہاں دیکھ لیا تو کیا سوچے گا؟

دوبارہ تاریکی اپنے کالے کالے پر پھلانے لگی تو اسے اطمینان ہوا۔وہ اٹھی اور آنگن کی ٹھنڈی ٹھنڈی مٹی پر چلنے لگی۔سردی کی ایک لہر پیروں سے دماغ تک پہنچ گئی اور آنکھوں میں سلگتے ہوئے اشکوں کے دیپ ٹمٹمائے مگر جلد ہی سرد ہوا کے جھونکوں نے انہیں بجھا دیا۔

وہ اپنے دل میں احساسات کو لہریں مارتا ہوا محسوس کر رہی تھی لیکن اس جذبے کی وہ کوئی تفسیر نہیں کر سکتی تھی جس نے اس مایوں بیٹھی دلہن کو اس کے پیروں پر اتنی رات گئے کھڑا کر دیا تھا۔

آج وہ اس گھر سے رخصت ہو رہی ہے۔وہ اس گھر کو،لیلیٰ کو،پیپل کے پیڑ کو،امرود کے درخت کو،اپنے بابا کو،ماں کو،بھائی بہنوں کو،سکھیوں کو،اپنے آرزوؤں اور ارمانوں کو سب کو چھوڑ کر جا رہی ہے۔

جھینگروں کا شور دب گیا۔امرود کی ڈالیاں،ٹہنیاں،پتے سب آہستہ آہستہ ہلنے لگے،مٹی کی ہلکی ہلکی خوشبو ماحول میں جذب ہونے لگی۔ہلکی ہلکی سرمئی روشنی تمام فضا میں پھیلنے لگی۔اس کے اپنے ننگے پاؤں کی دھیمی چاپ اس کے احساسات میں بلند ہو گئی وہ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی گھروندے کے چبوترے تک گئی جہاں وہ اپنی سکھیوں حنا،سارا،زینب اور گلابو کے ساتھ ہنڈ کلیا کھیلتی تھی،اپنی گڑیا کی شادی کرتی تھی اور جب وہ اپنی گڑیا کو رخصت کرتی تھی تو سچ مُچ بہت روتی تھی۔سب اس کا مذاق اڑاتیں،زینب اس کو لپٹا لیتی اور کہتی:

''تو نہ رو،جب کہے گی تیری دھی کو تیرے پاس بھجوا دونگی''۔اس کا جی چاہا دروازہ کھول کر باہر نکل جائے اور آزاد پنچھی کی طرح گاؤں کی اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر اپنی سہیلیوں کے ساتھ اڑتی پھرے۔

اچانک لیلیٰ کی گردن میں پڑی گھنٹی نغمہ بار ہو گئی۔ننھے گھنگرو گنگنا نے لگے اور سارا ماحول موسیقی کے تاروں پر رقص کرنے لگا۔مہرانساء سے مزید ضبط نہ ہو سکا۔اس نے احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا دوڑتی ہوئی آگے بڑھی،لیلیٰ سے لپٹ گئی اور اس کے کانوں میں سرگوشی کرنے لگی ''لیلیٰ! آج میں دلہن بنائی جاؤنگی،ہر طرف خوشیاں ہی خوشیاں ہونگی،باجے بج رہے ہونگے،بوڑھے

مسکرا رہے ہونگے، جوان قہقہے لگا رہے ہونگے، بچے تالیاں بجا بجا کر ناچ رہے ہونگے، مہاجن رام لعل جس سے ابّا نے میرے بیاہ کے لئے قرض لیا ہے اصل اور سود کے حساب کتاب پر جی ہی جی میں خوش ہو رہا ہوگا۔۔۔ بولتے بولتے وہ ایک دم چپ ہوگئی اس نے دیکھا لیلیٰ کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔''لیلیٰ! تو رو رہی ہے تو نے بھی میرے دکھ کو محسوس کر لیا۔'' یہ کہکر اس نے اپنی باہیں لیلیٰ کی گردن میں حمائل کر دیں۔

سسکیوں اور آہوں سے بھری ہوئی رات جلد جلد وقت کی پگڈنڈیوں پر دوڑنے لگی۔ درختوں کی ٹیڑھی میڑھی ڈالیوں پر پتوں کے نیچے سوئی ہوئی چڑیاں جاگیں اور ساتھ ہی ان کے چہچہے بھی جاگے۔ مہرانساء کی باہیں لیلیٰ کے گلے سے جدا ہوئیں، بوجھل پاؤں سے دھیرے دھیرے چلتی ہوئی وہ اندر کی طرف چلی گئی۔ دالان میں سب لوگ اسی طرح سوئے ہوئے تھے۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے کمرے میں قدم رکھا، اس کی دادی بھی اسی طرح بے ہوش پڑی سو رہی تھی۔۔۔

نیم روشن، نیم تاریک ماحول میں مہرانساء کی ماں کا تھکا تھکا سا بوڑھا جسم دھیرے دھیرے اجاگر ہوتا چلا گیا جیسے وہ عدم وجود سے اچانک وجود میں آیا ہو۔ مہرانساء کی چارپائی کے سرہانے پہنچ کر اس وجود کا بوڑھا جسم تھوڑا سا آگے کی جانب جھکا۔ مہرانساء چارپائی پر بے سدھ پڑی تھی۔ اس وجود نے اپنی بیٹی سے سرگوشی کے لہجے میں کہا، ''بیٹی ہمیں معاف کر دینا۔ ہم نے تو پوری برادری کے سامنے تجھے شہاب الدین کے نام کر دیا تھا۔ سب ہی جانتے تھے کہ تم ایک دوسرے کو پسند کرتے ہو مگر کیا کریں۔۔۔ زمیندار کے بندوقوں والے آئے، گلی میں ہمارے گھر کے چاروں گوشوں میں بندوقیں چلا کر اعلان کر دیا'' مہرانساء زمیندار صاحب کے بیٹے کی ہوئی۔۔۔ سب خبردار ہو جاؤ۔۔۔'' جس لڑکی کے لئے بندوقیں والے اعلان کرتے ہیں اس کا رشتہ کوئی نہیں لاتا۔ شہاب کے لوگ بھی پیچھے ہٹ گئے یہی شاید رب کی مرضی ہے۔۔۔ اس وجود نے بیٹی کے آگے ہاتھ جوڑے اور آگے بڑھ کر اسکی پیشانی کو چوما، جو بے جان اور سرد تھی۔ ۔۔۔ قریبی مسجد میں فجر کی اذان بلند ہوئی۔ تڑکا ہوا دن نکل گیا۔ ایک ایک کر کے سارے سونے والے جاگ اٹھے۔ مہرانساء نہیں جاگی، کیسے جاگتی۔۔۔ وہ اپنی رخصتی سے پہلے ہی رخصت ہو چکی تھی۔ اس نے اپنی جان دے کر زمیندار اور اس کے کارندوں کی بندوقیں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے بے کار کر دی تھیں۔

- بقیہ -

## گروی رکھے خواب

کالج میں بہت سی شیلڈ تقریری مقابلوں میں جیتنے کے باوجود میں جب یہ خواب دیکھتی کہ میں سڑک پر ننگے پاؤں چل رہی ہوں تو مجھے احساس ہوتا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے اور نہ ہی میں یہ پروا کرتی کہ لوگ مجھے کیا کہیں گے۔ بس ننگے پاؤں چل رہی ہوں تو مجھے احساس ہوتا کہ کوئی مجھے دیکھ رہا ہے اور نہ ہی میں یہ پروا کرتی کہ لوگ مجھے کیا کہیں گے۔ بس ننگے پاؤں چلے جاتی یہ خواب بھی میری روزمرہ کا حصہ بن گیا۔ کالج سے سسرال پہنچی تو اب خوابوں کا آئینہ دھندلانے لگا تھا جو چاہتیں جو اونچیں اڑانیں لے کر میں سسرال پہنچی تو ان کو ٹھیک ضرور لگی لیکن اتنی نہیں کہ زندگی بوجھ بنتی۔ سو زندگی گزرتی گئی اب میرے خواب اپنے کہاں رہے تھے۔ یہ خواب تو تقسیم در تقسیم ہوتے چلے گئے تھے۔ کبھی بچوں کے روپ میں، کبھی عدم تحفظ کی صورت میں، کہ کہیں خالد کی زندگی میں دوسری عورت نہ آ جائے۔ آنکھوں نے خواب دیکھنے ہی چھوڑ دیئے تھے۔ خوابوں کے بغیر زندگی ایک منطقی اور ایک سیدھی سادھی سڑک کی طرح تو تھی جس میں نہ کوئی ڈر، نہ کوئی خوف، نہ کوئی خواہش نہ چاہنا نہ چاہے جانا سب کچھ تو ایک عام سی ڈگر پہ چل رہا تھا۔ تب میں نے نفسیات پڑھنا شروع کی۔ ہماری نفسیات کی ٹیچر کہہ رہی تھی کہ خواب دیکھنا زندگی کی علامت ہے۔ جو آنکھیں خواب دیکھنا بند کر دیتی ہیں وہ بے حس ہو جاتی ہیں اور یہ بے حسی ان کی اگلی نسلوں تک چلتی چلی جاتی ہے۔ تو میں اس وقت سوچتی کہ میری ماں نے تو کہیں اپنی بے حسی مجھے جہیز میں تو نہیں دے دی۔ میں ہر دم خوش رہنے والی عورت تھی۔ نہ بہت چاہنا نہ بہت خواہشیں کرنا نہ بہت سی طلب۔ بالکل بھی تو میرے پاس کچھ نہیں تھا بس ایک خالی کاسہ جس میں کسی نے کچھ ڈال دیا تو مسکرا دی اور اگر کوئی ڈالے بغیر پاس سے گزر گیا تو بھی مسکرا دی۔ یہ کاسہ مدتوں خالی رہا۔ اب میری بیٹیاں جوان ہو رہی تھیں۔ اب پھر سے میں نے خواب بننے شروع کر دیئے۔ کبھی یہ خواب سفید گھوڑے پہ آتے شہزادے کا تھا جو میری شہزادی کو اپنے ساتھ لے جانے کے لیے آ رہا ہوتا اور کبھی یہ خواب ایسی حسین دنیاؤں کا ہوتا جہاں میں اپنی بچیوں کو ایک پری کی صورت اپنے پروں میں سمیٹے اڑ رہی ہوں۔ میرے پروں میں اتنی گنجائش ہوتی کہ میری دونوں بیٹیاں سمٹ جاتیں۔ لیکن اس خواب میں بھی ایک انجانا ڈر، ایک انجانا خوف سامنے آ جاتا کہ جب یہ بچیاں میرے پروں سے پھسل نہ جائیں۔ کسی چٹان پر گر نہ جائیں گھبرا کر میں اپنے پر سمیٹ کر کسی کونے میں دبک جاتی اور کتنے دنوں تک آنکھیں نہ بند کرتی کہ پھر وہ منحوس خواب دوبارہ نہ آ جائیں۔

آج میں پھر اس ڈبی کو سامنے رکھے سوچ رہی ہوں کہ کیا آج پھر کوئی نیا خواب، کوئی نئی آس، کوئی اُمید لے کر اس کے اندر گروی رکھ دوں تو کیا یہ پوری ہو جائے گی۔

# گروی رکھے خواب


شمع خالد

(راولپنڈی)


**فراز** جب امریکہ سے واپس آیا تو آتے ہی مجھے گلے مل کے کہنے لگا ماں یہ جو میں آپ کے لیے تحفہ لایا ہوں۔لوگوں کی نظر میں اس کی قیمت کچھ بھی نہیں لیکن میں جانتا ہوں آپ کے لیے یہ بہت قیمتی ہوگا۔میں نے جب یہ لیا تو نیو میکسیکو میں میرے دوست مجھے چھیڑنے لگے کہ یہ تو بچوں والی چیز ہے تم کیوں لے کے جا رہے ہو تو میں نے کہا کہ تم لوگ اس کا اندازہ نہیں لگا سکتے یہ میری ماں کے لیے بہت بڑا تحفہ ہوگا۔ساتھ ہی اُس نے ایک چھوٹا سا کارڈ مجھے پکڑایا۔کیم کے شاخوں سے بنی یہ چھوٹی سی گول ڈبیا جس کے اوپر ایک شاہین کی تصویر بنی تھی۔اس نے میرے ہاتھ میں رکھا اور ساتھ ہی ایک چھوٹا سا کارڈ بھی جس میں لکھا تھا کہ آپ اپنے خواب اس ڈبیا میں بند کر دیں اور اس کے بارے میں ہدایات لکھیں تھیں۔فراز کہہ رہا تھا امی آپ جب بھی امریکہ گئیں آپ کو میں نیو میکسیکو ضرور لے کر جاؤں گا۔ہے تو یہ امریکہ کا ہی صوبہ لیکن کس قدر مختلف، کس قدر دیدہ زیب اور کس قدر الگ اور منفرد۔ہم جب میکسیکو گئے تو سڑک کنارے ایک پہاڑی بالکل اونٹ کی طرح بنی ہوئی تھی اور اس کے سامنے جو جوا خانہ تھا اس کا نام بھی اونٹ۔۔۔کے نام پہ ہی تھا۔اس شہر کا نام بھی دنیا کے سب سے بڑے جوے خانے اسی صوبے میں ہیں۔اسی صوبے کا ایک حصہ البوقرقی اور لینٹا فے کے راستے میں ایک قصبے میں جب ہم گئے تو میں دیکھ کر حیران رہ گیا کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ کوئی ایڈوانس ملک کا صوبہ ہے۔یہاں رہنے والوں کے چہرے روشن اور مسکراہٹ سے بھرپور تھے۔ہر گاڑی آپ کے پاس سے گزرتی آپ کو ہاتھ ہلا کر ویش کرتے اور آنکھوں اور ہونٹوں پہ سجی مسکراہٹ آپ کا استقبال کرتی۔آپ وہاں سارے لوگوں کے مہمان ہوتے۔میں ایک جگہ گیا ایک بوڑھی عورت کڑاہی میں روٹی پکا رہی تھی۔میں اس عجیب وغریب روٹی کو دیکھ کر رک گیا تو اس نے مسکراتے ہوئے مجھے ایک روٹی پلیٹ میں رکھ کر دیتے ہوئے کہا۔لوکھاؤ اس کی آواز میں اتنی اپنائیت تھی۔اس کا لہجہ اتنا پرخلوص تھا کہ میں انکار کیے بغیر نہ رہ سکا۔میں تو ہاتھ میں تھامی ڈبیا سے ہی گفتگو کر رہی تھی جب فراز کی کوئی بات سنائی دی تو میں نے پوچھا کہ تم نے وہاں تصویر بنائی تو وہ کہنے لگا نہیں وہ لوگ تصویر نہیں بنانے دیتے اور ان پرخلوص لوگوں کو دھوکہ دینے کو دل بھی نہیں کرتا۔وہ نہیں چاہتے کہ لوگ اُنہیں زیادہ جانیں، زیادہ پہچانیں، بس وہ اپنی زندگی میں ہی خوش وخرم ہیں۔فراز اور بہت کچھ کہتا رہا لیکن میں ہاتھ میں پکڑے کارڈ کو پڑھ رہی تھی جس پر لکھا تھا کہ آپ اپنا کوئی بھی خواب لکھ کر اس ڈبیا کے اندر رکھ دیجیے اور اسے اپنے بستر کی سائیڈ ٹیبل پر اس کو رکھ دیجیے۔سونے سے پہلے اس کو غور سے دیکھئے اور اپنے خواب کے بارے میں سوچیے۔صبح اُٹھ کر بھی سب سے پہلے اسی ڈبیا پر نظر ڈالیے اور اس یقین کے ساتھ ڈالیے کہ آپ نے جو خواب اس میں لکھ کے رکھا ہے وہ یقیناً پورا ہو جائے گا۔فراز اور بھی جانے کیا کچھ کہتا رہا۔لیکن میں ہاتھ میں تھامی ڈبیا کو دیکھتی رہ گئی جانے کب وہ گیا۔کب میرے کمرے کی لائٹیں آف کر دی گئیں لیکن میں اپنے ماضی کی گٹھی میں رکھے خوابوں کی پڑیا کو کھولے بیٹھی تھی۔اس میں بہت سے کنارے ان چھوئے خواب یونہی دھرے ہوئے تھے۔کچھ خواب چکنا چور ہوئے۔ریزہ ریزہ اپنی ہیبت کھونے کے باوجود مجھے پکار رہے تھے کہ ہم بھی کبھی تمہاری آنکھوں میں اترتے تھے۔کچھ خواب جو کبھی دیکھے ہی نہ تھے وہ میری طرف شکوہ بھی نظروں سے دیکھ رہے تھے اور کہہ رہے تھے ہمیں تو تم نے اس قابل بھی نہ جانا کہ اپنی آنکھوں میں اترنے دیتیں پھر تم نے ہمارا درد کیسے اپنے سینے میں ایک قیمتی خزانے کی طرف دفن کر دیا۔ہم تو یونہی کنوارے کے کنوارے ان دیکھے، ان سنے، ان چاہے منتظر آنکھوں سے تمہارے ساتھ جڑے رہے لیکن تمہارے پاس ہمیں دیکھنے ک، ہمیں پرکھنے کی، ہمیں چاہنے کی ہمیں اپنانے کی خواہش کب جاگی، کب ختم ہوئی، کب درد بنی، یہ تو احساس ہی نہ ہو سکا۔ہاں ان خوابوں کی گٹھی سے ایک دھندلا سا چہرہ مسکراتا ہوا نکلا کہ دیکھو میں وہ خواب ہوں جو تم نے بچپن کے سر پہ کھڑے دیکھا تھا لیکن میں دل میں کانپ گئی لیکن اس خواب کی تعبیر نے تو مجھے وقت سے پہلے بیدار کر دیا تھا۔تمہیں میں ابھی مکمل چاہ بھی نہ سکی تھی کہ اس رات تمہیں وہی ڈائیلاگ کسی اور لڑکی کے ساتھ بولتے سن گیا تھا جو تم مجھے بچوں کی کہانیاں سناتے سناتے سرگوشی میں کہہ جاتے تھے اور ایک دن یہی سرگوشی امی نے سن لی اور امی نے بتایا کہ اب تمہاری خواب دیکھنے کی عمر گزر گئی ہے اب تم جا کر گھر کا کام کاج گھر ہستی سیکھو سو میں نے گھر اور کتابوں سے ایسا دل لگایا کہ بچپن کب آیا، گزر گیا، آیا بھی کہ نہیں کہ نہ تو میں نے گڑیوں کی شادی رچائی، نہ ہی میں نے قیمتی کھلونے دیکھے۔دیکھا تو بس یہی کہ آج رات کے کھانے کے لیے کچھ ہے کہ نہیں یوں بھوک، سفید پوشی اور معاشرے میں سفید پوشی کا بھرم رکھنے کے چکر میں بچپن جانے کب اور کیسے بیت گیا۔جوانی کے دہلیز پہ کھڑی ہوئی تو امی مجھے یوں چھپانے لگی جیسے انہیں مجھ سے چھن جانے کا ڈر ہو، جیسے میں ان کی بہت قیمتی شے ہوں۔تب میں ایک ہی خواب دیکھا کرتی ہاں وہ خواب آج بھی میری گٹھڑی میں پڑا تھا۔بن چھوا ویسے ہی تروتازہ، ویسا ہی رنگین جیسا میں نے اسے لڑکپن میں دیکھا تھا۔اونچا اڑنے کا خواب یہ خواب روز میری آنکھوں میں آتا تو مجھے لگتا کہ میں اونچی ہی اونچی اڑ رہی ہوں۔پہاڑوں سے بھی اونچی۔بادلوں کو چھونے کے لیے۔بادلوں کو اپنے چہرے پر محسوس کرتی، اونچی اڑتی رہتی۔پھر اچانک کب اور کیسے اس خواب نے پلٹا کھایا اب مجھے یوں لگتا جیسے میں کسی پہاڑی سے پستی میں گرتی چلی جا رہی ہوں اور اکثر چیخ مار کر آنکھ کھل جاتی۔امی مجھے گرنے سے بچا لیجیے۔یہ خواب آج بھی ایک درد کی طرح میرے سینے سے چمٹا رہتا ہے لیکن آنکھوں میں نہیں آتا۔

باقی صفحہ ۷۱ پر ملاحظہ کیجیے

# پچھتاوا

محمد عمران قریشی (پرولیا، بنگال)

''پچھلے چند دنوں سے جب سے اس کی شادی کا کارڈ ملا ہے میں انگارے پر لوٹ رہا ہوں!'' بیٹھے بیٹھے اچانک کھڑے ہو کر بے چینی کے عالم میں سلیم ٹہلنے لگا۔

''کیوں؟'' افسر نے حیرت کا اظہار کیا۔

''جب یہ لونڈا آٹھ دس برس کا تھا تو کوئی بات نہیں تھی۔ لیکن اس کے بعد اس نے جو قد کاٹھی نکالی تو خود میں بھی حیران رہ گیا''۔ سلیم نے حیرت کے ساتھ رشک اور حسد کی آمیزش کا اظہار کیا۔

''تم نے آخر ایسا سنگدلانہ فیصلہ کیا کیسے تھا؟'' افسر نے اپنے دوست کے ذریعے ماضی میں لیے گئے فیصلے پر افسوس کا اظہار کیا۔

''کیا کرتا یہ سالی غریبی جو نہ کرائے!'' سلیم اپنے فیصلے کے حق میں سپر ڈالتے ہوئے کہا۔

''آخر اس سے پہلے بھی تو تمہارے چار بچے پل ہی رہے تھے!'' افسر نے اس کی فرار کی راہیں روکتے ہوئے کہا۔

''ہاں کسی طرح تو پل ہی رہے تھے لیکن........!'' لیکن کہہ کر سلیم آسمان کی جانب دیکھنے لگا شاید وہ خدا سے یہ سوال کرنا چاہتا تھا کہ ''مجھے اولاد کی نعمت سے تو نوازا لیکن مفلسی کی بے رحم زنجیروں سے جکڑ کیوں دیا کہ بچوں کی معصوم معصوم خواہشات بھی پوری نہ کر سکتا'' سلیم رکشا کھینچ کر اور اس کی بیوی محلے کے گھروں میں کام کر کے بچوں کی پرورش میں لگے رہے اور دن کا زیادہ تر حصہ ماں، باپ کے بغیر بچے آوارہ کتوں کی طرح گلیوں میں اِدھر اُدھر پھرتے رہتے۔

سلیم کی جب شادی ہوئی تھی تو وہ خود بھی نہیں جانتا تھا کہ شادی کے سات، آٹھ برسوں بعد وہ چار، پانچ بچوں کا باپ بن جائے گا۔ سلیم کا شمار محلے کے شریف رکشے والوں میں ہوتا تھا۔ وہ رکشا کھینچتا ضرور تھا لیکن جوا، شراب اور دیگر برائیوں سے کوسوں دور تھا۔ رات میں گھر آتے وقت وہ کبھی خالی ہاتھ نہ آتا۔ کبھی مٹھائی، کبھی بیوی کی ضرورت کی کوئی چیز، کبھی گھر کا کوئی سامان یا بیلے کے پھولوں کا گجرا ہی سہی لیکن لاتا ضرور تھا۔

شادی کے بعد سلیم سرِ شام ہی گھر واپس آجاتا کیونکہ وہ اپنی بیوی کے ساتھ زیادہ وقت گزارنا چاہتا تھا۔ کچھ مہینے تک تو ایسے ہی چلا پھر بیوی کے سمجھانے پر کہ ''چند مہینے بعد ہم دو سے تین ہو جائیں گے اسی لیے آنے والے وقت کے لیے کچھ روپئے بچا کر رکھنا چاہئے اور اس کے لیے آپ کو کچھ دیر اور کام کرنا چاہئے''۔ سلیم نہ ہی لاپرواہ تھا اور نہ ہی غیر ذمے دار۔ وہ اپنی ذمے داری کا احساس کر کے رات کے دس بجے کے بعد ہی واپس گھر آتا۔

پہلے بچے کی پیدائش میں کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی کیونکہ سرکاری اسپتال میں نارمل ڈلیوری ہوئی تھی۔ غریب کے گھر کا بچہ بغیر کسی چاؤ چونچلے کے لیکن ماں، باپ کے پیار کے سائے تلے پلتا رہا۔ پہلا بچہ ابھی ماں کا دودھ بھی نہیں چھوڑا تھا کہ آسمان سے ایک اور تارا ٹوٹ کر سلیم کی بیوی کی کوکھ میں آ گرا۔ اب یہ سلیم کی کسی بھی قسم کے نشے اور برائی سے دوری کا نتیجہ تھا یا جی توڑ محنت کرنے والے جسم کا تقاضا یا خدا کی مرضی۔ لیکن سچائی یہی تھی اور پھر پے در پے تین، چار بچوں کی پیدائش۔ بھوک سے بلبلاتے ہوئے بچے جب ماں سے لپٹتے تو ممتا کے ہاتھوں مجبور ماں کو بھی چہار دیواری سے باہر قدم نکالنے پڑے اور محلے کے خوش حال گھروں میں کام کر کے بچوں کے پیٹ بھرنے کا سامان فراہم کرتی رہیں۔

محلے کے سارے لوگ سلیم کی قسمت پر رشک کرتے کہ خدا نے اسے ایک نہیں بلکہ چار چار بیٹوں سے نوازا تھا لیکن سلیم اپنی غربتی پر افسوس کرتا کہ بچوں کو مناسب غذا بھی نہیں دے پا رہا ہے۔ گھر کے چاروں کونوں میں غریبی پاؤں پسارے سو رہی تھی۔ ایسے میں پانچویں بچے کی آمد کی دھمک سن کر دونوں میاں، بیوی پر بجلی سی گر پڑی۔

خدا کی مصلحت خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ ایک طرف سلیم کے یہاں پانچویں بچے کی علامات ظاہر ہو چکی تھیں جبکہ دوسری جانب سلیم کا برادر نسبتی جس کا اپنا مکان تھا، جما جمایا کاروبار تھا، ایک خوبصورت اور سلیقہ شعار بیوی بھی تھی لیکن پتہ نہیں گزشتہ چھ برسوں سے اب تک آسمان سے کوئی تارا ٹوٹ کر اس کی کوکھ میں آنے سے کیوں گھبرا رہا تھا؟۔

سلیم کا جب پہلا بچہ پیدا ہوا تھا تو روایت کے مطابق اس کا برادر نسبتی اپنی بہن، بہنوئی اور بھانجے کے لیے تحفے تحائف لے کر آیا تھا۔ اس کے بعد بھی ہر بچے کی پیدائش کی خبر سلیم کے برادر نسبتی کو پہنچائی گئی لیکن وہ پھر کبھی آ نہیں پائے۔ لیکن خلاف معمول جب پانچویں بچے کی پیدائش ہوئی تو دونوں میاں، بیوی سلیم کے یہاں تحفے تحائف لے کر پہنچ گئے۔ سلیم کے ساتھ اس کی بیوی بھی حیرت میں تھی کہ اتنے برسوں بعد یہ کہاں کا پیار امنڈ پڑا۔ سلیم کا برادر نسبتی تو چند روز کے بعد ہی کاروبار کی مصروفیت کی وجہ سے واپس لوٹ گیا لیکن اپنی بیوی کو وہیں چھوڑ گیا۔ سلیم کی بیوی گود کے بچے کو سنبھالتی اور اس کی بھابی گھر کا کام کاج اور بچوں کی دیکھ بھال کرتی۔

سوکھی ندی سے پانی کی آس کیسی! سلیم کی بیوی کو مناسب غذا نہیں مل پا رہی تھی اسی لیے دودھ بھی نہیں اتر رہا تھا اور بچہ ہر وقت بلکتا رہتا اور دیگر بچے بھی چیخ پکار کرتے کیونکہ سلیم اپنے کنبے کی جس گاڑی کو دو پہیئے کی مدد سے کھینچ رہا تھا اس کا ایک پہیہ وقتی طور پر رک سا گیا تھا۔ سلیم کے برادر نسبتی کی بیوی یہ تمام حالات اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی۔ ایک روز موبائل سے تفصیلی گفتگو کر کے اپنے

شوہر کو بلا لی۔ رات میں جب بچے کھا پی کر سو گئے تو چاروں کسی اہم مسئلے پر گفتگو کرنے کے لیے بیٹھ گئے۔ گود کا بچہ کم دودھ ملنے پر رہ رہ کر احتجاج کر رہا تھا۔ سلیم کی بیوی جو اپنی بھابی کے پیچھے بیٹھی تھی ساڑی کے آنچل میں چھپا کر بچے کو چھاتی سے لگاتی لیکن تھوڑی دیر بعد ہی بچہ پھر سے چیخ پڑتا۔

''دیکھو بھئی! بچے کا پیٹ بھر نہیں پا رہا ہے اور تمہاری اتنی آمدنی بھی نہیں ہے کہ ڈبے کا دودھ مہیا کرا سکو اور اگر بچے کو بھر پیٹ دودھ نہ ملا تو ہو سکتا ہے کہ کسی بیماری میں مبتلا ہو جائے!'' سلیم کے برادرِ نسبتی نے بچے کی صحت کی جانب دھیان دلاتے ہوئے کہا۔

''ہاں بات تو سہی ہے لیکن ہم تو اپنی سی کوشش کر ہی رہے ہیں۔ اب بھیک تو مانگا نہیں جائے گا مجھ سے'' ۔سلیم نے اپنی خودداری کا اظہار کیا۔

''دیکھئے ہم کوئی غیر نہیں ہیں۔ ایک بات کہتی ہوں برا نہ مانئے گا!'' سلیم کے برادرِ نسبتی کی بیوی نے کسی قدر دھڑکتے دل کو قابو میں کرتے ہوئے کہا۔

''نہیں بھابی آپ کوئی غیر تھوڑے ہی ہیں آپ تو ہمارے بھلے کے لیے ہی کہیئے گا!'' ۔سلیم کی بیوی اپنائیت کے جذبے سے سرشار ہو کر بولی۔

''بھئی سلیم! پہلے ہی سے تمہارے چار چھوٹے چھوٹے بچے ہیں اسی کا پیٹ مشکل سے بھر پاتا ہے ایسے میں پانچویں بچے کی پرورش کتنی مشکل ہوگی! آپ نے کبھی سوچا ہے؟'' سلیم کے برادرِ نسبتی نے فکرمند لہجے میں کہا۔

''ہم چاہتے ہیں کہ آپ کے سبھی بچے پرورش پا جائے یہ چار بچے جس کا انحصار دودھ پر نہیں ہے وہ تو کچھ نہ کچھ کھا پی کر پیٹ بھر ہی لیں گے لیکن یہ معصوم جس کو صرف دودھ چاہئے اور یہ یہاں ناممکن ہے تو کیوں نہ ہم ایسا کریں کہ اس ننھی سی جان کو بچانے کی خاطر اپنے ساتھ لے جائیں۔ اللہ نے ہمیں ہر طرح سے خود کفیل بنایا ہے۔ بچے کی دیکھ ریکھ، پرورش و پرداخت میں کوئی کمی نہ ہوگی اور آپ کو بھی اطمنان رہے گا کہ بچہ اپنوں کے درمیان پرورش پا رہا ہے اور پھر ایک دن ہمارا سب کچھ اسی بچے کا ہی ہوگا'' ۔سلیم کے برادرِ نسبتی کی بیوی نے اپنی غیر آباد کوکھ کو آباد کرنے کی فکر کرتے ہوئے کہا۔

سلیم اور اس کی بیوی یہ باتیں سن کر لمحہ بھر کے لیے سکتے میں آ گئے اور دونوں ایک دوسرے کو حسرت سے دیکھنے لگے۔ دونوں کو خاموش دیکھتے ہوئے سلیم کے برادرِ نسبتی نے کہا۔''بھوک کی شدت سے بچہ مرجائے اس سے تو بہتر ہے کہ آپ کی نظروں سے اوجھل ہو کر اس کی صحیح پرورش ہو جائے اور پھر آپ کا بچہ ہے آپ جب چاہیں آ کر دیکھ لیا کریں گے اور پھر کبھی کبھار ہم بھی لے کر آ جایا کریں گے آپ یہ چاہتے ہیں کہ نہیں کہ آپ کا بچہ جیتا رہے اور نیک انسان بن جائے'' ۔

اور پھر صبح سویرے سلیم کے برادرِ نسبتی اور اس کی بیوی سلیم کے پانچویں بچے کو اپنے ساتھ لے گئے۔

یادوں کی دنیا سے باہر نکلتے ہوئے سلیم نے کہا کہ ''جانتے ہو افسر! میرے سبھی بچوں میں سب سے بہتر پرورش اسی بچے کی ہوئی جسے میری بیوی کے بھائی اور اس کی بیوی لے گئے تھے۔ اسے لکھا پڑھا کر ایک نیک انسان بنایا اسے سماج میں عزت ملی۔ سب ٹھیک مجھے اس سے انکار نہیں۔ اگر یہ لڑکا میرے پاس رہتا تو میرے دیگر بچوں کی طرح غربت اور مفلسی میں پل کر گم نامی کی زندگی گزارتا'' ۔سلیم سچائی کا اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

''لیکن تمہارے انگارے پر لوٹنے والی بات میری سمجھ میں نہیں آئی'' ۔افسر اپنی بے چینی کا اظہار کیا۔

''بھئی بات یہ ہے کہ میرا بچہ جب بولنے لگا تو مجھے پھوپھا اور اپنی ماں کو پھوپھی پکارتا۔ میں نے سمجھا کہ ابھی بچہ ہے بڑا ہو جائے گا تو رشتے ناطے سمجھ میں آ جائیں گے اور پھر میں نے بچے کو پرورش کے لیے دیا تھا نا کہ اپنا بنانے کے لیے'' ۔سلیم بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

''ارے بھئی اس میں اپنا بنانے کی کون سی بات ہے وہ تو اپنوں ہی کے درمیان پرورش پا رہا تھا'' ۔افسر نے حیرت کا اظہار کیا۔

''اگر بات یہیں تک ہوتی تو کوئی بات نہ تھی'' ۔سلیم نے سلگتے دل کی آنچ کم کرتے ہوئے کہا۔

''تو پھر بات کیا ہے؟'' افسر نے اصرار کیا۔

''بات یہ ہے کہ وہ بچے کی جان بچانے لے گئے تھے میں نے کسی کے ہاتھ فروخت تو نہیں کیا تھا پھر ان لوگوں نے میرے بیٹے کی شادی کے کارڈ میں ہمارے زندہ رہتے ماں، باپ کے نام کے خانے میں اپنا نام کیوں لکھوا دیا؟'' سلیم کے سینے کے دہکتے انگارے کی تپش اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔

## ''جرأتِ رندانہ''

میں ایک کسان ہوں پگڑی میری شان ہے۔ یہ میری عزت ہے مجھے امریکہ کا ویزہ نہیں چاہیے۔ جب ساری دنیا امریکہ کے ویزہ کو زندگی اور کامیابی کی ضامن سمجھ بیٹھی ہے ایسے وقت میں یہ الفاظ بھارتی لوگ سبھا کے رکن وریندر سنگھ جب ویزے کے حصول کے لیے امریکی سفارت خانہ پہنچے اور اُنہیں پگڑی اُتارنے کے لیے کہا گیا تو اُنہوں نے جواب دیا بھاڑ میں جائے امریکہ اور اُس کا ویزہ پگڑی ہماری آن، پگڑی ہماری شان ہے اس کے لیے میں ایک تو کیا سینکڑوں امریکی ویزے قربان کر سکتا ہوں۔

# "جذبۂ شوق"

## محمودالحسن

(راولپنڈی)

اُن کی تشہیر نہ ہوگی مِری تحقیر کے ساتھ
آبروحُسن کی ہے عشق کی توقیر کے ساتھ

دل میں ہو قوّتِ ایمان تو ہو سکتا ہے
چاکِ تقدیرِ رفُو سوزنِ تدبیر کے ساتھ

غمِ دوراں سے رہائی کا طریقہ یہ ہے
باندھ دے کوئی مجھے آپ کی زنجیر کے ساتھ

گفتگو کھاتی ہے کس طرح خموشی سے شکست
کر کے دیکھے کوئی باتیں تری تصویر کے ساتھ

نرم گفتار سے جو کام نکل سکتا ہے
وہ نہ پتھر سے نکلتا ہے نہ شمشیر کے ساتھ

تُم کو اُلفت کی حرارت کا نہیں ہے احساس
کاش تُم ہاتھ ملاؤ کسی دلگیر کے ساتھ

جذبۂ شوق اُنہیں کھینچ کے لا سکتا ہے
جانے کیوں لوگ بہل جاتے ہیں تصویر کے ساتھ

اپنی آنکھوں سے اُسے دیکھ چُکا ہوں اکثر
اُس کشش کو کہ جو تھی نالۂ شبگیر کے ساتھ

عشق کہتا ہے کہ دے ساتھ زباں کا دل بھی
دل میں اک درد اُٹھے نعرۂ تکبیر کے ساتھ

اُلجھنیں غم کی نہیں برہمیِ دل کا سبب
عشق جب تک ہے ہمیں زلفِ گرہ گیر کے ساتھ

ہم تو قائل ہیں فقط حسنِ عمل کے محمودؔ
خواب سے اپنا تعلق ہے نہ تعبیر کے ساتھ

## پروین کماراشک

(بھارت)

ترے بندوں سے میں لڑتا بہت ہوں
خدا! میں تجھ سے شرمندہ بہت ہوں

محبت کا جہاں چلتا ہے سکّہ
میں اُس بازار میں بکتا بہت ہوں

وہ آجاتا ہے مجھکو زندہ کرنے
پر اُس کے بعد میں مرتا بہت ہوں

تُو مجھکو پاؤں کی مٹّی بنا لے
میں تیرے پاؤں میں سجتا بہت ہُوں

کوئی شے مجھ سے اونچی ہو گئی ہے
میں اپنی ذات سے نیچا بہت ہوں

کہا میں نے مجھے اک موتی دے دے
سمندر نے کہا، گہرا بہت ہوں

بہت خوش ذائقہ ہے خون میرا
میں اپنے آپ کو پیتا بہت ہوں

مکاں ڈوبے ہوئے ہیں آنسوؤں میں
میں غم کے شہر میں رویا بہت ہوں

وہ قاصر ہے مجھے پہچاننے سے
میں اُس کے سامنے جاتا بہت ہوں

بزرگوں میں سیانا ہُوں بہت اشکؔ
مگر بچوں میں، مَیں بچہ بہت ہوں

○

## عبداللہ جاوید
(کینیڈا)

صدا سکھ دے کے دکھ پایا، نہ سمجھا
یہ دل دستور دنیا کا ، نہ سمجھا

فضا میں ناچتا تھا والہا نہ
ہوا کی زد میں تھا تنکا ، نہ سمجھا

یہ رنگت جان ہی لے کر ٹلے گی
خزاں کے رنگ کو پتّا ، نہ سمجھا

پرائی آگ میں جلتا رہا یوں
خود اپنی آگ پروانا ، نہ سمجھا

اسے اندھی محبت ہی کہیں گے
ہوئے اس کے جسے دیکھا، نہ سمجھا

اکیلے میں بھی کیوں تنہا نہیں ہم
اکیلے میں بہت سوچا ، نہ سمجھا

بنا نے والا سب کچھ جانتا ہے
بنا نے والے کو پُتلا ، نہ سمجھا

بہت دیکھی ہے دنیا آپ نے بھی
مگر جاویدؔ جو دیکھا ، نہ سمجھا

○

## مظفر حنفی
(دہلی، بھارت)

تشویش اور زیاں کے پہلو عرضِ ہنر میں صاف
شہرت سے ہٹ کر دیکھا تو مطلع گھر میں صاف

ساحل ساحل ہانپ رہا ہے اک طوفاں لاریب
اِک چنگاری کانپ رہی ہے ہر پتھر میں صاف

ایک شرر سے خرمن خرمن مٹھّی مٹھّی راکھ
ہر بستی نازک بستی ہے دو خنجر میں صاف

تیر چڑھائے کھول رہی تھی خُون کی ہر اک بوند
رات ہوئی تو سارے شکوے ایک نظر میں صاف

کوسوں دُور کھڑی تھی مجھ سے وہ آنچل پھیلائے
میں اُس کو پہچان رہا تھا گردِ سفر میں صاف

اندر سے اِک آندھی آئی، توڑ گئی ہر باندھ
جتنی سمتیں آئیں اِک اِک جنبش پر میں صاف

ڈالی ڈالی پر قابض ہیں دو زہریلے ہاتھ
نام ہمارا کندہ ہے ہر ایک ثمر میں صاف

رات اندھیری اور مظفرؔ دل میں اُس کی یاد
ایک ستارہ سا لرزاں ہے روزن و در میں صاف

○

## آصف ثاقب

(بوئی، ہزارہ)

جانے کب سے مجھے ارمان ہے برساتوں کا
اپنی بستی میں جو فقدان ہے برساتوں کا

اُس کو ہر حال میں مرہونِ بقا رہنا ہے
میری آنکھوں سے جو پیمان ہے برساتوں کا

''دشتِ وگلزار'' کے آثار ہیں اپنے اپنے
خار اور پھول پہ احسان ہے برساتوں کا

اک ستارہ سا جو پلکوں پہ لرز جاتا ہے
میں سمجھتا ہوں یہ امکان ہے برساتوں کا

کون روکے گا اُسے شور شغب سے لوگو
ہر طرف گاؤں میں طوفان ہے برساتوں کا

مرے اس باغ میں ہیں نتھیا گلی کے موسم
اور کہسار ہیں کاغان ہے برساتوں کا

اس طرف کھیت میں گرمی کے شرارے برسیں
اُس طرف شہر میں دوران ہے برساتوں کا

اس کی تاویل بھلا اور بھی کیا ہے ثاقبؔ
چڑھتا سیلاب تو ہیجان ہے برساتوں کا

❍

## غالب عرفان

( کراچی)

وہ شناسا سہی انجان بھی ہو سکتا ہے
میں پلٹ آؤں یہ امکان بھی ہوسکتا ہے

جس نے گرداب سے ساحل پہ مجھے لا پھینکا
وہی دریا مری پہچان بھی ہو سکتا ہے

تیری تصویر مقابل ہو ضروری تو نہیں
سامنے میز پہ گلدان بھی ہوسکتا ہے

تیری یادوں کے تصّرف میں یہ کمرہ اور میں
مجھ کو تنہائی میں وجدان بھی ہوسکتا ہے

میری تہذیب مٹاؤ گے تو میرا یہ قلم
میری تاریخ کو عنوان بھی ہو سکتا ہے

روح، صدیوں کی مسافت کو سموئے لیکن
جسم اک لمحے میں بے جان بھی ہوسکتا ہے

تیری قربت سے الگ ہٹ کے تجھے پہچانوں!
میری آنکھوں میں وہ وجدان بھی ہوسکتا ہے

❍

## عزیزجبران انصاری

(کراچی)

جو کہ دیا ہے اس سے مکرتے نہیں عزیز
تہمت ہم اپنے سر پہ یہ دھرتے نہیں عزیز

نازک ہے کتنا کارِ جہاں ہم سمجھتے ہیں
شبنم بغیر پھول نکھرتے نہیں عزیز

مانا کہ زخم زخم ہیں پھر بھی دعائیں ہیں
انسانیت کی سطح سے گر تے نہیں عزیز

یہ اور بات ہے نظر انداز کردیں ہم
لفظوں کے گھاؤ ایسے ہیں بھرتے نہیں عزیز

ہم خود ہی دل کو شہرِ خموشاں بناتے ہیں
جذبے کسی بھی حال میں مرتے نہیں عزیز

احساس کی رہین ہے پھولوں کی سب پھبن
مردہ دلوں میں پھول اترتے نہیں عزیز

باقی جو زندگی کے ہیں دن کٹ ہی جائیں گے
سچ ہے ترے بغیر سنورتے نہیں عزیز

قسمت میں جو لکھے ہیں گزاریں گے وہ ضرور
ہم اتنے سخت جاں ہیں بکھرتے نہیں عزیز

جبران جانتا ہے یہ بے مہر آسماں
ہم مشکلاتِ وقت سے ڈرتے نہیں عزیز

○

## اشرف جاوید

(لاہور)

(نذرِ غالب)

چہرے پر لکھی کہانی اور ہے
کہتا ہے جو مُنہ زبانی اور ہے

مار دیتی ہے محبت جیتے جی !
یہ کرم ، یہ مہربانی اور ہے

اور ہے کچھ بام و در کی آرزو!
خواہشِ نقلِ مکانی اور ہے

کوئی ایسا بیش قیمت بھی نہیں
تنگ دستی میں گرانی اور ہے

آتے جاتے چھان لیں گے دشت بھی
آتے جاتے خاک اُڑانی اور ہے

کوئی دن کا اور ہے کارِ زیاں
کوئی دن کی رائیگانی اور ہے

کرتو لُوں اِس بے یقینی کا یقیں !
کیا کروں ! یہ بد گمانی اور ہے

چل پڑی ہیں کیا ہوائیں ہجر کی!
موجِ صحرا کی روانی اور ہے

ٹوٹ کر بھی میں، اگر بکھرا نہیں
یعنی مجھ میں سخت جانی اور ہے

○

# سرخ لباس

## (ایلس منرو)

ترجمہ: ڈاکٹر فیروز عالم

(کیلیفورنیا)

(**ایلس** منرو کینیڈا کے صوبے انٹاریو میں ۱۹۳۱ء پیدا ہوئی۔ اس نے ساری زندگی وہیں گزاری۔ وہ درمیانے درجے کے طبقے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کی کہانیاں اسی علاقے کے پس منظر میں لکھی گئی ہیں، یہ زیادہ تر دیہی علاقہ ہے اور یہاں کے عوام کا ذریعہ معاش کھیتی باڑی ہے اس نے اپنے اطراف پھیلے لوگوں کی زندگی اور انکے مسائل کو اپنی کہانیوں کا موضوع بنایا ہے۔ اسے ۲۰۱۳ء میں ادب کا نوبیل انعام ملا۔ یہاں ہم اس کی ایک کہانی جو مغربی معاشرے میں نو بالغ لڑکیوں کی نفسیاتی الجھنوں کی عکاسی کرتی ہے پیش کر رہے ہیں۔ یہ کہانی پہلے پہل ۱۹۴۶ء میں شائع ہوئی تھی)

☆

میری ماں بڑے پیار سے میرے لئے سرخ لباس تیار کر رہی تھی۔ پورے نومبر کے مہینے میں، میں جب بھی اسکول سے واپس گھر آتی تو وہ باروچی خانے میں پرانی میز پر سرخ رنگ کے کپڑوں کی کترنیں بچھائے میرے لباس کو ڈیزائین کرنے میں مصروف ہوتی۔ سرخ رنگ کا کپڑا مخمل کا تھا جسکا سینا مشکل تھا کہ کبھی کبھی وہ ہاتھوں سے پھسل جاتا تھا اور کبھی اس کے تاگے کچھ جاتے تھے، پھر وہ جو ڈیزائین بنانا چاہتی تھی وہ تھا بھی کچھ مشکل۔ وہ کھڑکی کے پاس رکھی پرانی سلائی کی مشین پر جھکی محنت کرتی نظر آتی۔ اس کے علاوہ وہ اچھی سلائی کرنا جانتی بھی نہیں تھی۔ مجھے معلوم تھا کہ میری نانی اور دادی سلائی میں بہت ہی مشاق تھیں کیونکہ وہ کسی اور دور کی تھیں جب سلائی خواتین کے لئے بہت اہم ہوتی تھی۔ جب میں بچی تھی تو وہ میرے لئے کپڑے سیتی تھی جو پرانی طرز کے تھے جن میں ملکہ وکٹوریا کے دور کی کشیدہ کاری اور لیس کے گلے ہوتے تھے میں نہایت فرمانبرداری سے وہ کپڑے پہن لیتی تھی مگر اب، اب جبکہ مجھ میں کچھ سمجھ آ گئی تھی مجھے اس قسم کے کپڑے اچھے نہیں لگتے تھے۔ میرا دل چاہتا تھا کہ میں نئے ڈیزائین کے کپڑے پہنوں جیسے کہ میری قریبی دوست ''لانی'' پہنتی تھی جو شہر کی فیشن ایبل دکان سے خریدے جاتے تھے۔

کبھی کبھی لانی بھی میرے ساتھ اسکول سے میرے گھر آتی۔ میری ماں فورا فٹنگ دیکھنے کے لئے مجھے ادھ سلا لباس پہنا دیتی اور کبھی جھک کر، کبھی سیدھے کھڑے ہو کر، کبھی آگے سے، کبھی میرے پیچھے جا کر اس لباس کو دیکھتی، پنیں لگاتی اور کبھی بار بار پیمائش کرتی۔ میری ماں گھر میں بہت عام سا لباس پہنتی، پھر وہ صرف ٹخنوں تک موزے پہنتی، وہ جب جھکتی تو اسکی موٹی اور بدزیب پنڈلیاں واضح ہو جاتیں جن پر چربی کے موٹے موٹے گٹے پڑے تھے اور زرد جلد کے نیچے نیلی اور گلابی نسوں کے جال تھے۔ مجھے یہ بہت ہی شرمناک لگتے تھے اور میں جان بوجھ کر لانی کو باتوں میں الجھا لیتی تا کہ اس کی توجہ کسی اور طرف ہو جائے۔ مگر لانی بہت ہی تہذیب کے ساتھ جس میں میری ماں کے لئے ادب اور اسکی آنکھوں میں اسکی محنت کو سراہنے کے جذبات ہوتے گم سم بیٹھی رہتی۔ دراصل یہ اسکی چالاکی اور منافقت تھی جو وہ بزرگوں پر ظاہر کرتی تھی ورنہ بعد میں وہ خوب ہنستی اور انکا مزاق اڑاتی۔ میری ماں نے یکا یک مجھے گھما کر اسکی جانب سیدھا کیا اور پوچھا ''لانی کہو یہ خوبصورت ہے کہ نہیں'' لانی نے مکاری سے، مگر پورے خلوص اور سچائی کی ایکٹنگ کرتے ہوئے کہا ''بالکل بالکل''۔ لانی کی ماں مر چکی تھی وہ اپنے باپ کے ساتھ رہتی تھی جس کے پاس لانی پر توجہ دینے کو کوئی وقت نہیں تھا اس لئے وہ کچھ خود مختار سی ہو گئی تھی۔ میری ماں لانی سے باتیں کرتے ہوئے مجھ پر تنقید کرتی جیسے وہ کوئی عمر رسیدہ ہو اور میں ایک کم سن نا سمجھ بچی۔ لانی سے باتیں کرتے وہ مجھ سے کہتی، سیدھی کھڑی ہو، ہلو مت، وغیرہ وغیرہ۔ میں سرخ مخمل میں دفن ہوتی، میرا دم سا گھٹ رہا ہوتا، مجھے کہیں کہیں پنیں چبھ رہی ہوتیں مگر وہ بولتی چلی جاتی ''لانی، مجھے یقین نہیں ہے کہ یہ اسے سراہتی بھی ہو۔ میرے لئے کبھی کسی نے لباس نہیں سیا تھا۔۔۔ اور وہ پھر ایک لمبی کہانی شروع کر دیتی جو میں کئی دفعہ سن چکی تھی کہ کیسے اس نے سخت کس مپرسی میں بچپن گذارا کیسے ہائی اسکول کے بعد اسے فورا ریستوران میں جا کر میزیں صاف کرنی پڑتی تھیں اور کس طرح اسے ہائی اسکول جاری رکھنے کے لئے محنت اور ملازمت کرنی پڑتی تھی۔ اگرچہ شروع میں یہ کہانیاں میرے لئے دلچسپ تھیں مگر اب میں ان سے اکتا گئی تھی۔ اس تمام گفتگو کے درمیان لانی توجہ سے میری ماں کی باتیں سنتی رہی، چاکلیٹ چباتی رہی اور گول گول آنکھوں سے انہیں تکتی رہی۔ بڑی مشکل سے ہماری جان چھوٹی اور ہم اوپر میرے کمرے میں پہنچے۔ کمرے میں بہت سردی تھی مگر ہم وہیں بیٹھ گئے کیونکہ ہمارے پاس اسکے علاوہ کوئی چارہ بھی نہیں تھا۔ ہم باتیں کرتے، پھر بے ساختہ ہنستے اور پھر اپنی دھن میں لگ جاتے، ہم دونوں تیرہ سال کے تھے اور ہم نے ابھی ابھی کچھ دنوں پہلے ہائی اسکول شروع کیا تھا۔ یہ عجیب دنیا تھی۔ ہم بستر پر اوندھے لیٹے کلاس کے لڑکوں کا شمار کرتے۔ ایک قطار سے ان کی جانچ کرتے ''کیا یہ تمہیں پسند ہے۔۔؟؟'' ''نہیں یہ تو ایویں ہی ہے۔۔۔ اچھا یہ کیسا ہے، کیا تم اس کے ساتھ باہر جاؤ گی'' ''پتہ نہیں۔۔۔ کیا یہ تمہیں آدھا ادھورا بھی پسند نہیں۔۔۔ اوہ اسے تو دیکھو۔ جیسے اس خوبرو لڑکے کو دیکھ کر تو ہمارے منہ میں پانی سا بھرنے لگتا۔ پھر ہم کھل کھلا کے ہنس پڑتے جیسے کوئی ہمیں گدگدیاں کر رہا ہو جبکہ حقیقت تو یہ تھی کہ ہمیں باہر جانے کے لئے نہ صرف کسی نے پوچھا نہ تھا بلکہ ہمیں تو کسی نے اب تک نوٹ ہی نہیں کیا تھا۔ ہم سستے سے رسالے پڑھتے اور خاص طور سے ان میں سوال جواب کا کالم ضرور پڑھتے کہ لڑکوں کو کیسے رجھایا جائے، ان کے ساتھ جاتے ہوئے کیسے ایسا برتاؤ کیا جائے کہ وہ متاثر ہو

جائیں۔اور یہ کہ ان لمحات میں انہیں کس حد تک آگے بڑھنے کی اجازت دی جائے۔پھر ہم میک اپ کے طریقے ڈھونڈھتے کہ خود کو کیسے حسین بنا سکیں۔بس ایک ٹھنڈی آگ میں ہم جل رہے تھے۔لانی اور میں نے سن رکھا تھا کہ شوہر کیوں بیویوں سے غیر مطمئن رہتے ہیں ہم یہ جاننے کے لئے بیقرار رہتے تھے مگر حیف ہمارے پاس ایسے کتنے ہی سوالوں کے جواب نہیں تھے۔جنس کی بہت ہی معمولی سی آگاہی نے ہمیں مزید تجسس میں مبتلا کر دیا تھا مگر ہم ایک دوسرے کو اس سے زیادہ کچھ نہیں بتا پاتے تھے کہ ہم لڑکیاں ہیں اور ہماری کلاس میں کچھ شریر دلچسپ لڑکے ہیں جن کی موجودگی میں ہمیں خواہ مخواہ شرم سی آنے لگتی ہے اور ہاتھ پیر ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں ہم نے معاہدہ کیا تھا کہ ایک دوسرے کو ہر بات بتائینگے مگر میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ میری ماں یہ لباس کرسمس کے سالانہ ڈانس کے لئے تیار کر رہی ہے کیونکہ میں نے فیصلہ کیا تھا کہ میں اس ڈانس میں نہیں جاؤنگی۔ہائی اسکول میں، جو میرے لئے نیا تھا، میں کبھی بھی سکون سے نہیں رہی تھی، ایک بیچینی، گھبراہٹ شرمندگی اور احساس کمتری کا شکار تھی۔اگرچہ ششماہی امتحانات سے پہلے لانی کے بھی ہاتھ برف کی طرح سرد ہو جاتے تھے اور اسکا دل تیز تیز دھڑ کنے لگتا تھا مگر میرا تو برا ہی حال ہو جاتا تھا، ایک بے انت نا امیدی طاری ہو جاتی تھی۔جب مجھ سے کوئی سوال پوچھا جاتا تو میرے ہاتھ پیر پھول جاتے، آواز پھٹ کر مینڈک جیسی ہو جاتی اور سانس اکھڑ جاتی اور اگر مجھے بلیک بورڈ پر جا کر سوال حل کرنے کا حکم دیا جاتا تو بس بیہوش ہو کر گرنے لگتی۔مجھے حساب سے نفرت تھی، سائنس میری دشمن تھی، اسے ہمارے ہیڈ ماسٹر پڑھاتے تھے جن کو شاگردوں کی بے عزتی کرنے میں خاص مہارت تھی۔مجھے انگریزی سے چڑھ تھی کیوں کہ جب اسکی ٹیچر جو نازک اور کمزور سی لڑکی نما عورت تھی اور تھوڑی سی بھینڈی بھی تھی، ہمیں شیکسپئر پڑھاتی تو لڑکے یا تو ایک دوسرے کی پیٹھ پر تبلہ بجاتے یا پھر آپس میں بنگو کھیلتے۔وہ بیچاری پہلے ڈانٹنے کی کوشش کرتی پھر خوش آمدیں کرتی مگر لڑکے اس کی ایک نہ سنتے۔آخر کار وہ رونے لگتی۔

مگر در حقیقت سکول میں نہ ہی سنجیدگی سے حساب، سائنس یا عالمی تاریخ کے مضامین کا راج تھا نہ ہی الجبرا یا سماجیات کا۔۔۔اسکول کا ماحول ایک زیر آب جنسی مقابلے اور ایک دوسرے پر سبقت لیجانے کی کشمکش سے سے آلودہ تھا اس کشیدہ ماحول میں مجھے اس بات کی مکمل آگہی تھی کہ میرا کوئی شمار نہیں۔اس معاملے میں میں کسی مقابلے سے پہلے ہی مکمل طور پر شکست خوردہ تھی۔میں نے اپنی شکست تسلیم کر لی تھی۔اسی لئے میں سالانہ رقص میں جانے کے لئے قطعئی تیار نہیں تھی۔مجھے یقین تھا کہ اس رقص کے دوران، رقص کی دعوت تو بڑی بات ہے کوئی مجھ پر نظر بھی نہیں ڈالے گا۔دسمبر کے مہینے کے شروع ہوتے ہی سخت برفباری شروع ہو گئی میں نے سوچا یہ تو بہت اچھا ہوا کیونکہ اب میں جان کر کے گھر آتے ہوئے اپنی بائیسکل کو برفیلی سڑک پر پھسلا کر گرنے اور ٹخنے کو توڑنے کا بہانہ بنا کر رقص سے پیچھا چھڑا سکتی تھی۔مگر کوشش کے باوجود میں ایسا نہ کر سکی۔پھر مجھے خیال آیا کہ بچپن سے میرے پھیپڑے کمزور رہے ہیں اور موسم سرما میں مجھے سخت جاڑہ بخار اور کھانسی ہو جاتی ہے تو کیوں نہ میں ایسی حرکتیں کروں کہ مجھے نمونیا ہو جائے۔انتہائی سردی میں میں کمرے کی کھڑکی کھول کر سر باہر نکال کر گہرے گہرے سانس لیتی، برف کے ذرات میرے چہرے پر گرتے اور میری جلد میں مرچیں سی لگتیں، اس پر بھی بس نہیں کرتی تو میں اپنے شب خوابی کے لباس کی فراک اتار کر برف کے سامنے اپنا سینا برہنہ کرتی اور کبھی کبھی کھڑکی کی چوکھٹ پر جمع برف کو مٹھیوں سے اٹھا کر اپنے سینے پر ملتی۔ان حرکتوں سے میرے کپڑے گیلے ہو جاتے اور میں انہی گیلے کپڑوں میں سو جاتی کیونکہ میں نے سنا تھا کہ بیمار ہونے کا یہ یقینی طریقہ ہے۔میں جب صبح اٹھتی تو کھنکار کر دیکھتی کہ آیا میرا گلا خراب ہو گیا ہے، جان کر کھانستی کہ سینے میں درد یا جلن ہے اور اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر دیکھتی کہ کتنا بخار ہے مگر ہائے افسوس میں ہر صبح بھلی چنگی صحت مند اٹھتی۔یہاں تک کہ رقص کا دن آ پہنچا۔

میں نے اس دن اپنے بالوں میں فولادی کرلر لگائے، حالانکہ میرے اپنے بال قدرتی طور پر ہلکے گھونگر والے تھے اور مجھے ان کی چنداں ضرورت نہ تھی مگر میں اپنی مقابل لڑکیوں سے پیچھے نہیں رہنا چاہتی تھی۔میں کرلر لگا کر صوفے پر لیٹ گئی میرے سامنے دیوار پر میری بچپن کی تصویر لگی تھی میں دیوار پر لگی اپنے بچپن کی تصویر کو دیکھ کر دعا کر رہی تھی کہ کاش میں پھر بچی بن جاؤں اور اس مشکل گھڑی سے مجھے نجات مل جائے۔۔مگر جب میں نے بالوں سے کرلر نکالے تو ایک تو میرے بالوں کے قدرتی گھونگر اور پھر ان کرلروں کی وجہ سے میرے بال عجیب وحشیوں کی طرح سر پر سیدھے لوہے کے تاروں کی طرح کھڑے ہو گئے۔لگتا تھا کہ میرے سر پر جھاڑیاں اگ آئی ہیں۔میں نے لاکھ کوشش کی، بار بار برش سے انہیں سیدھا کرنے کی کوشش کی مگر یہ اور الجھتے چلے گئے۔پھر میری ماں نے میرے گالوں پر غازہ لگایا مگر گرم کرلر اور کمرے میں چلنے والے ہیٹر نے میرے گالوں کو سرخ کر دیا تھا اور ان پر پسینے کی بوندیں چمک رہی تھیں جن کے وجہ سے غازے سے تپے گالوں پر لمبی لمبی لکیریں پڑ گئی تھیں۔میرا لباس پرانے زمانے کی شہزادیوں جیسا تھا جب پیٹ پر ایک سخت چوڑا کمر بند باندھ کر کمر کو ایک بالشت کر دیا جاتا تھا اور سینے کو مزید ابھارا جاتا تھا، میں بھی آج اسی تکلیف دہ کیفیت میں مبتلا تھی کہ سانس لینا مشکل ہو رہا تھا مگر میری ماں نے مجھے گھما کر قد آدم شیشے کے سامنے کھڑا کر دیا۔وہ خوشی سے پھولی نہ سما رہی تھی جب کہ میں اس حلیے میں عجب مسخری لگ رہی تھی۔مگر جب لانی کے آنے پر میں نے دروازہ کھولا تو اس نے مجھے دیکھ کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے کہا'' اف خدایا یہ تم نے اپنے بالوں اور خود کو کیا بنا لیا ہے؟؟''''کیوں کیا اچھی نہیں لگ رہی؟؟'' وہ کہنے لگی تم تو کسی جنگل کی مخلوق لگ رہی ہو'' پھر اس نے برش اور کریم لیکر میرے بالوں کو درست کرنے کی کوشش کی جو کچھ بہتر ہو گئے۔میں نے لانی پر نظر ڈالی وہ ہلکے آسمانی لباس اور ہلکے سے میک اپ میں بہت اچھی لگ رہی تھی۔اس کے علاوہ اس کے سیدھے سیدھے بھورے بال اسکے کاندھوں پر جھول رہے تھے۔میں نے ہمیشہ سوچا تھا کہ لانی تو اچھی کیا کبھی قبول صورت بھی نہیں لگ سکتی کہ اسکے دانت ٹیڑھے میڑھے تھے اور اسکی جلد پیلی اور بدرنگ تھی مگر آج وہ مجھ

سے کہیں زیادہ اچھی لگ رہی تھی۔ دروازے سے نکلتے ہوئے میری ماں نے کہا ''خوب خوب مزالینا اور خوش رہنا'' مجھے اس پر غصہ آیا کہ اسے معلوم ہے کہ مزا کیا لینا ہمیں تو کوئی پوچھے گا بھی نہیں۔

رقص ہمارے جمنازیم میں تھا جس میں کچی لکڑی کی بو بسی ہوئی تھی دیواروں پر سرخ اور سبز رنگ کی گھنٹیاں اور کرسمس کی دوسری آرائشی اشیا لٹکی تھیں۔ بڑی کلاسوں کے تمام طلبہ جوڑوں کی شکل میں آئے تھے اس لئے کہ ہائی اسکول کے ان درجوں میں عام طور سے مستقل جوڑے بن جاتے ہیں۔ لڑکیاں اپنے ساتھیوں کے ساتھ لگی کھڑی تھیں اور بڑے پیار اور کچھ غرور سے انکے بازوؤں کو تھامے تھیں۔ ان کے چہرے سے خوشی و مسرت پھوٹی پڑتی تھی۔ جیسے ہی موسیقی شروع ہوئی یہ تمام جوڑے بڑی تمکنت سے جیسے ہوا میں تیرتے ہوئے، ایک دوسرے کی بانہوں میں رقص کرنے لگے۔ ان کے لئے ہم جیسی لڑکیوں کا، جو دیوار سے لگی کھڑی تھیں وجود ہی نہ تھا۔ میں اور لانی بھی دیوار سے لگے کھڑے تھے، ایک تو ہال بہت سرد تھا دوسرے ہمیں جو تو ہین کا احساس ہو رہا تھا اسکی وجہ سے جیسے ہمارے اندر ایک کپکپی سی طاری تھی۔ موسیقی ختم ہوئی اور تمام جوڑے کچھ سانس لینے رقص کرنے کے فرش سے نکل آئے۔ میں نے ایسے ہی نظریں اٹھا کر دیکھا۔۔ ایک لڑکا جسکا نام جیسن میسن تھا جھجکتا ہوا اور نا چاہتے ہوئے میری طرف بڑھا اور میری کمر میں ہاتھ ڈال کر رقص کرنے لگا۔ اسکا برتاؤ ایسا تھا جیسے وہ میری کمر یا انگلیوں کو چھونا بھی نہ چاہتا ہو اور رقص بھی کسی زور زبردستی سے کر رہا ہو۔ ادھر میرا یہ حال تھا کہ میری ٹانگیں کپکپا رہی تھیں اور میرا حلق ایسا خشک تھا کہ اگر میں بولنا بھی چاہتی تو میری آواز نہیں نکلتی، اس لئے کہ یہ لڑکا اسکول کے ''ہیروؤں'' میں شمار ہوتا تھا۔ وہ باسکٹ بال کھیلتا تھا اور برف پر کھیلے جانے والی ہاکی کا چمپین تھا اور یہ اسکول کی راہداریوں میں اس غرور اور انداز سے چلتا تھا جیسے وہ کسی شاہی خاندان سے تعلق رکھتا ہو۔ اسے یقین تھا کہ اسکول کی تمام حسینائیں اسکے ساتھ چند لمحیں گذارنے کی حسرت میں مری جاتی ہونگی۔ مجھے بھی حیرت تھی کہ ایسا کیوں کر ہو رہا ہے۔۔ اس لئے کہ اس بھرے مجمع میں رقص گاہ کے فرش پر مجھ جیسی کے ساتھ جو صرف نظر انداز کرنے ہی کہ قابل تھی دیکھا جانا تو اس کے لئے کڑوی گولی کی طرح تھا مگر چند ہی لمحوں میں اس نے اپنا ہاتھ میری کمر سے ہٹا لیا اور میرا ہاتھ جو اسکے کندھے پر رکھا تھا اسے بھی ہٹا کر سرد لہجے میں ''بائی'' کہا اور اپنے دوستوں کی جانب چل دیا۔ مجھے ہوش آنے میں تھوڑی دیر لگی اور مجھے احساس ہوا کہ تماشہ ختم ہوا اور اب وہ میری طرف واپس نہیں آئے گا۔ میں تھکے قدموں سے دیوار کی طرف آئی۔ میں کچھ حیران سی تھی اتنے میں ہماری ایک ٹیچر بارہویں کلاس کے لڑکے کے ساتھ رقص کرتی میرے پاس سے گذری میں نے اسکی آنکھوں میں دیکھا کہ وہ میری ہمت افزائی کر رہی ہے۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ اس نے میسن سے کہا تھا کہ وہ میرے ساتھ کم از کم ایک ڈانس کرلے۔ میں سمجھ گئی تھی، مجھے کوئی شکوہ بھی نہیں تھا اور میں میسن سے ناراض بھی نہیں تھی۔ اسکول میں میری اور میسن کی جو حیثیت تھی اس کو دیکھتے ہوئے یہ انہونی بات نہیں تھی۔ مگر مجھ پر گھڑوں پانی پڑ گیا تھا، میں شرمندگی سے اپنے ناخن چبانے لگی۔ موسیقی اب بھی جاری تھی وہی دھن جس کے شروع میں میسن مجھے رقص کے لئے لے گیا تھا اور ادھورے ہی میں مجھے اکیلا چھوڑ گیا تھا۔ خدا خدا کر کے وہ دھن ختم ہوئی اور لوگ فرش سے باہر نکلے، میں بھی اس ہجوم میں گم ہو گئی، میں نے دعا مانگی کہ خدا کرے کسی نے یہ تماشہ نہ دیکھا ہو۔

تھوڑی ہی دیر میں آرکسٹرا نے ایک اور بہت رومانٹک دھن بجانی شروع کردی۔ میں رقص گاہ کے جس کنارے کھڑی تھی وہاں بہت بھیڑ تھی مگر جیسے ہی یہ دھن شروع ہوئی بھیڑ اس تیزی سے چھٹی کہ میں چند لڑکیوں کے ساتھ اکیلی رہ گئی کیونکہ دھن شروع ہوتے ہی لڑکے بیقراری اور تیزی سے لڑکیوں کی طرف بڑھے اور زیادہ تر لڑکیاں انکی بانہوں میں جھولتی جھمکیلے فرش کی جانب روانہ ہو گئیں، لانی بھی ایک لڑکے کے ساتھ رقص کر رہی تھی۔ مجھے کسی نے بھی نہ پوچھا، میں تنہا اداس کھڑی تھی۔ مجھے یاد آیا کہ میں نے اور لانی نے ایک نسوانی رسالے میں پڑھا تھا کہ ایسے موقعوں پر لڑکوں کو رجھانے کے لئے کوشش کرو کہ تمہاری آنکھیں ایسے چمک رہی ہوں جیسے ان میں ستارے بس گئے ہیں، اپنی آواز کو ایسا دھیما اور کھنک دار بناؤ کے لگے جیسے نقرئی گھنٹیاں بج رہی ہوں، مگر مسئلہ یہ تھا کہ ایسا کیسے کرو۔۔ میرے تو یہ بس میں نہ تھا۔ ہاں مجھے کالم نگار کی یہ نصیحت یاد تھی کہ مسکراؤ اور اپنے چہرے پر ایک خوشی کا تاثر قائم کرو۔ میں نے پر جوش طور پر مسکرانا شروع کیا اور چہرے کے کھنچاؤ پر مسرت کا ملمع چڑھایا مگر تھوڑی دیر بعد میں خود سے شرمندہ ہو گئی کیوں کہ کوئی مجھ پر اب بھی توجہ نہیں دے رہا تھا، میں بے وجہ مسکراتی ہوئی عجب احمق لگ رہی تھی۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ جو لڑکیاں خوش قسمت تھیں اور لڑکوں کی بانہوں میں ناچ رہی تھیں ان میں تو کوئی بھی نہیں مسکرا رہی تھی نہ ہی انکے چہرے پر مسرت کا کوئی نام و نشان تھا مگر پھر بھی وہ لڑکوں کی بانہوں میں تھیں اور میں۔۔۔ میں نے مزید بیحد افسوس سے یہ بھی نوٹ کیا کہ ہر قسم کی لڑکیاں ناچ رہی تھیں۔۔ موٹی اور بھدی لڑکیاں، بدنما چہرے والی لڑکیاں، مہاسوں اور کھردری جلد والی لڑکیاں، سبھی کسی نہ کسی کے ساتھ ناچ رہی تھیں۔۔ کیوں، ایسا کیوں کہ سب خوش قسمت ہیں سوائے میرے۔ میں نے تو اپنے بالوں میں کرلر بھی لگائے تھے، میرا الباس بھی مخمل کا تھا اور میں نے سب سے اچھی اور مہنگی خوشبو بھی لگائی تھی۔ میرے اندر جیسے کوئی چیز ٹوٹ گئی ہو، مجھے یقین ہو گیا کہ مجھ میں کوئی ایسا نقص ہے، ایسا ناقابل تلافی نقص جو مجھے نظر نہیں آتا مگر سب کو نظر آتا ہے۔ میں بالکل ٹوٹ گئی میں دو لڑکیوں کے درمیان سے نکل کر، جو میری ہی طرح اکیلی رہ گئی تھیں زنانہ غسل خانے کی جانب بھاگی۔ غسل خانہ بہت وسیع تھا۔ اس کے ایک طرف کئی چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں بنی تھیں اور دوسری جانب دیوار کے ساتھ ایک لمبا آئینہ تھا اور اسکے ساتھ ہی ایک کاؤنٹر پر منہ دھونے کے لئے واش بیسن لگے تھے۔ میں نے ایک کوٹھری میں گھس کر دروازہ بند کیا اور وہاں بیٹھ کر خوب روئی اور دل کا غبار نکالا۔ بس میں وہاں بیٹھی رہی۔۔ بہت دیر تک۔ مجھے آ

واز آتی تھی کہ لڑکیاں آتی ہیں اپنا میک اپ درست کرتی ہیں، بال ٹھیک کرتی ہیں ہاتھ دھوتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔۔میں بس وہیں بیٹھی رہی۔کسی کو خبر نہ تھی کہ میں یہاں بیٹھی ہوں، مجھ میں واپس جا کر مجمع کو منہ دکھانے کو حوصلہ نہ تھا۔اتنے میں ایک لڑکی آئی، مجھے سنک میں پانی کھلنے کی آواز آئی، وہ تو بہت ہی زیادہ عرصے تک وہاں رہی اتنی دیر تک کہ میں کچھ پریشان ہوگئی کہ وہ سوچے گی کہ میں کیوں اتنی دیر سے اس کوٹھری میں چھپی ہوں۔آخر ہمت کر کے میں باہر نکلی۔وہ اسوقت ہاتھ دھو رہی تھی۔میں اسے پہچانتی تھی۔وہ "میری فونٹین" تھی، بارہویں کلاس کی صدر تھی اور اسکول کی تمام تقریبات کا انتظام وہی کرتی تھی۔میں نے بہانہ بنایا کہ رقص گاہ میں بہت گرمی اور گھٹن تھی اس لئے میں کچھ تازہ ہوا کے لئے یہاں آ گئی تھی۔وہ کہنے لگی میں یہ سب کچھ کرتی تو ہوں مگر مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں اور میں اس سے لطف اندوز بھی نہیں ہو رہی۔اس نے کہا آؤ باہر چلیں مجھے بھی تازہ ہوا اور سگرٹ کی ضرورت ہے"۔مگر ہم باہر کیسے نکلیں گے" اس نے کہا "اڈوینچر" پھر وہ ایک تاریک اور خفیہ راستے سے مجھے ایک راہداری میں لے گئی جس میں کچھ اونچائی پر ایک کھڑکی تھی، ہم دونوں نے اس کھڑکی کو کھول کر سر باہر نکالا اور ہمت کر کے کود گئے۔وہ کہنے لگی میں آج شام یہاں صرف اس لئے آئی کہ یہاں کی آرائش اور انتظام میری ذمہ داری تھی ورنہ میں لڑکوں کے لئے پاگل نہیں ہوں۔میں خود میں مطمئن ہوں اور مجھے یہ بھی خیال ہے کہ ہر چیز کا ایک وقت ہے۔

کھڑکی سے آتی روشنی میں میں نے اسکے چہرے کی طرف دیکھا جو پتلا اور لمبوترا تھا، اسکی رنگت سنولائی ہوئی تھی اور اسکے چہرے پر مرجھائے مہاسوں کے داغ تھے۔وہ پھر کہنے لگی ایسا لگتا ہے کہ اس سکول میں ساری دنیا کی وہ لڑکیاں جمع ہوگئی ہیں جو لڑکوں کے لئے پاگل ہیں۔میں نے حیرت سے اسکی خود اعتمادی کو محسوس کیا اور اسکی ہاں میں ہاں ملائی۔مجھے اس سے باتیں کرنے میں مزہ آ رہا تھا اور مجھے اس سے بہت بڑا اخلاقی سہارا مل رہا تھا میں نے اسکا شکریہ ادا کیا کہ اس نے مجھ پر توجہ دی اور ایک حد تک میری ٹوٹی ہوئی عزت نفس کو بحال کیا۔وہ کہنے لگی میرے ماں باپ بہت زیادہ خوشحال نہیں میں اپنے اخراجات پورے کرنے کے لئے اسکول کے بعد کیفیٹیریا میں کام کرتی ہوں۔مجھے معلوم ہے ہائی اسکول کے بعد وہ میرے اخراجات کے بالکل ہی متحمل نہیں ہو سکتے مگر میں کالج جانا چاہتی ہوں۔میں نے فیصلہ کیا ہے میں کھیتوں میں کام کرونگی یا کچھ اور مگر اپنے ارادے ضرور پورے کرونگی۔اس کی باتیں سنتے ہوئے مجھے ایسا لگا کہ غم اور افسردگی کی ایک چادر جو مجھ پر تن گئی تھی وہ اٹھنے لگی ہے۔مجھ میں ایک انجانی مسرت سرائت کر رہی تھی۔میں نے اس کی طرف دیکھا اور میرے دل سے آواز آئی، اسے دیکھو، اس کو بھی میری طرح شکست کا سامنا کرنا پڑا، اسکی زندگی میں جدو جہد اور افلاس ہے مگر اس میں ایک بے نام سی قوت ہے، توانائی ہے جسکا منبع اسکی خود اعتمادی ہے۔میری کہنے لگی کیا ہم یہیں کھڑے کھڑے سارا وقت گذار دینگے، چلو تھوڑی دور پر کافی شاپ ہے ہم وہاں گرم گرم چاکلیٹ کا کپ پئیں گے اور ڈونٹ کھائینگے۔ہمیں واپس ہال میں جانا تھا تا کہ ہم اپنے گرم کوٹ اور دستانے اٹھالیں۔ہم اسی کھڑکی سے واپس عمارت میں داخل ہوئے، غسل خانے میں جا کر ہاتھ دھوئے اپنا میک اپ درست کیا۔میری نے مجھ سے کہا اب تم واپس رقص گاہ کی طرف جاؤ اور اسے ایک تماشہ سمجھ کر اس سے لطف اندوز ہو۔

میں واپس رقص گاہ پہنچی اور فرش کے کنارے کھڑے ہو کر رقص کرتے جوڑوں کو دیکھتی رہی۔مجھے لانی نظر نہیں آئی، وہ شاید رقص کرتے ہجوم میں کہیں گم تھی مگر مجھے اس کی تلاش بھی نہیں تھی۔مجھے ایسا لگتا تھا کہ لانی اب میری دوست نہیں رہیگی۔۔اور اگر دوست رہی بھی تو اس دوستی میں پہلے جیسی قربت و گہرائی نہیں ہوگی اس لئے بھی کہ مجھے احساس ہوگیا تھا کہ لانی کے ذہن پر ہر لمحے لڑکوں کا تصور چھایا رہتا ہے۔اس رقص گاہ کے کنارے کھڑے ہوئے مجھے لگا کہ میں اب پہلے کی طرح ناخوش نہیں ہوں۔میں نے سوچ لیا تھا کہ میں اب اس بات کی منتظر نہیں رہونگی کہ کوئی لڑکا آ کر مجھے پوچھے یا مجھ پر توجہ دے۔مجھے اب خود پر اور اپنے مستقبل پر توجہ دینی چاہئے، میں اب لڑکوں کو رجھانے کے لئے جھوٹ موٹ کی مسکراہٹ چہرے پر طاری نہیں کرونگی نہ ہی اپنی کسی حرکت سے یہ ظاہر کرونگی کہ میں کسی لڑکے کا انتظار کر رہی ہوں کہ وہ مجھے رقص کی دعوت دے۔کیونکہ اب میں مطمئن تھی کہ میں اپنی نئی دوست کے ساتھ گرم چاکلیٹ پینے اور ڈونٹ کھانے جا رہی ہوں۔میں اپنا کوٹ اور گرم دستانے اٹھانے کلوک روم کی طرف چلی کہ ایک لڑکا میری طرف بڑھا میں اسے پہچانتی تھی اسکا نام ریمنڈ بولنگ تھا۔اس نے دھیمی آواز میں کچھ کہا میں سمجھی کہ میں اس کے راستے میں ہوں اور وہ شاید باہر جانا چاہ رہا ہے اور راستہ مانگ رہا ہے، میں کچھ سمجھی ہی نہیں حتیٰ کہ اس نے دوسری دفعہ کہا کہ وہ میرے ساتھ رقص کرنا چاہتا ہے مجھے پھر بھی یقین نہیں آیا، پھر میں تو باہر جانے والی تھی مگر اس نے ایک بار پھر درخواست کی اور یہ سمجھتے ہوئے کہ مجھے اعتراض نہیں، نہایت نرمی سے میری کمر میں ہاتھ ڈال دیا اور مجھے سہارا دیتے ہوئے رقص گاہ کے فرش پر لے چلا۔میں نے بھی اسکے کندھے پر اپنا ہاتھ رکھ دیا اور ہم ناچتے ہوئے فرش کے عین درمیان میں پہنچ گئے، میں ناچ رہی تھی، میرے پیروں میں کوئی کپکپاہٹ نہیں تھی، میرا چہرہ پرسکون تھا اور اس پر ایک قدرتی مسکراہٹ جھلملا رہی تھی۔شاید اس وجہ سے کہ میں ایک ایسے لڑکے کے ساتھ ناچ رہی تھی جس نے خود مجھے رقص کے لئے مدعو کیا تھا۔کسی نے اس سے کہا نہیں تھا کہ میرے ساتھ ناچو، مجھے یہ سوچ کر بیحد خوشی ہو رہی تھی کہ اس شام اس لمحے میں بھی کسی کا انتخاب ہوں۔میں سوچنے لگی کہ میں اس سے کہوں یقیناً یہ غلط ہے، میں تو اپنی دوست کے ساتھ رقص گاہ چھوڑ کر باہر جا رہی ہوں مگر میں اس سے یہ نہ کہہ سکی۔جب ہم رقص کرتے فرش کے کنارے پر پہنچے تو میں نے میری فونٹین کو دیکھا جو لمبا کوٹ پہنے اور گلوبند لپیٹے باہر نکلنے کو تیار تھی، میں نے نیم شرمندگی سے اسے "بائی بائی" کا اشارہ کرتے ہوئے ہاتھ ہلایا کہ نہ جانے یہ سب کیسے ہوا ہے مگر میں اب اسکے ساتھ نہیں جا پاؤنگی۔اس نے بھی مسکرا کر ہاتھ ہلایا۔تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ وہ جا چکی تھی۔

باقی صفحہ ۹۵ پر ملاحظہ کیجیے

# زہریلاانسان

(ناول)

تابش خانزادہ (یوایس اے)

قسط......٦

**جہاں** تک مجھے یاد پڑتا تھا سونے سے پہلے حسب عادت میں نے کالی کو اپنے ہاتھوں سے بیگ میں رکھا تھا۔ میں نے خود کو سنبھالا اور مسٹر والٹن سے کہا، آپ ایک منٹ ٹھہریں میں ابھی آتا ہوں۔ میں نے دروازہ بند کر کے بیگ میں کالی کی موجودگی محسوس کی تو مجھے کچھ سکون ملا۔ سکون کی سانس لے کر ایک بار پھر دروازہ کھول کر مسٹر والٹن سے بڑے یقین سے کہا، چلیں میں تیار ہوں۔ میں کمرے سے منکوں کا جار ساتھ لے کر ننگے پاؤں اور سونے کے کپڑوں میں مسٹر والٹن کے پیچھے ہولیا۔ مسٹر والٹن اپنے موٹاپے کے باوجود بڑی تیزی سے میرے آگے آگے چل رہے تھے۔ ہاسٹل کے برآمدوں میں رات کے اس وقت کچھ غیر معمولی چہل پہل تھی۔ کچھ لڑکے تو ہمارے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ پہلے میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مسٹر والٹن مجھے کہاں لے کر جا رہے ہیں۔ لیکن اگلے چند لمحوں میں یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ وہ اپنے کمرے میں یا کسی اور طالبعلم کے کمرے میں نہیں جا رہے تھے۔ ان کا رخ کالج کے کلینک کی طرف تھا۔ کلینک کے سامنے اور اندر لڑکوں کا جمِ غفیر تھا، ہم ان کے درمیان اپنے لئے راہ بناتے ہوئے اندر پہنچے۔ میں نے ایک لڑکے کو کلینک کے ایک کمرے میں بستر پر لیٹے ہوئے دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے زور زور سے سانس لینے کی کوشش میں ہچکیوں پر ہچکیاں لے رہا تھا۔ اس کی دائیں پنڈلی پر پٹیاں بندھیں تھیں اور اس کا پورا جسم اتنی تیزی سے کپکپا رہا تھا جیسے ڈگڈگی بجاتے ہوئے ہاتھ کپکپاتا ہے۔

مریض نے بھی پاجامہ پہنا تھا جس کا مطلب تھا سانپ نے اسے سوتے میں کاٹا تھا۔ میں نے اس کا پاجامہ پھاڑ کر پنڈلی ننگی کر کے دیکھا تو مجھے کاٹ کے دو سوراخ ایک دوسرے سے کافی فاصلے پر نظر آئے۔ دانتوں کا فاصلہ بتا رہا تھا کہ سانپ خاصا بڑا ہے۔ دانتوں کا گہرا زخم اس بات کی دلیل تھا کہ سانپ نے مریض پر بے خبری میں وار کیا ہے۔ عموماً سانپ دیکھ کر لوگ اپنا جسم غیر ارادی طور پر دور کرتے ہیں اس لیے سانپ اگر کاٹتا بھی ہے تو ہاتھوں پر یا پاؤں پر۔ اور کاٹ کا زخم عموماً لمبا زیادہ ہوتا ہے اور گہرا کم۔ مجھے حیرت اس بات کی تھی کہ سانپ کے دانتوں کے نشان اردو کے نمبر پانچ (۵) سے ملتے تھے جو میرے لیے بالکل نئے تھے۔ اپنی اٹھارہ سالہ زندگی میں پہلی بار میں سانپ کی کاٹ دیکھ کر سانپ کا نام نہیں بتا سکتا تھا۔

لیکن یہ وقت اپنی حیرانی دور کرنے کا نہیں تھا۔ میں نے پھاڑے ہوئے پاجامے سے دانتوں کا زخم صاف کر کے اپنے جار سے دو منکے نکال کر دونوں زخموں پر لگائے تو وہ زخموں سے ایسے چپک گئے جیسے لوہا مقناطیس سے چپکتا ہے۔ زخم پر منکوں کا چپک جانا اس بات کی دلیل ہوتا ہے کہ ڈسنے والا سانپ زہریلا تھا اور یہ منکے اپنا کام کر رہے ہیں۔ سانپ کی کاٹ کے زخموں سے منکے چپک جانے سے زیادہ خوشگوار لمحہ کسی سپیرے کی زندگی میں نہیں ہوتا۔ منکوں کے لگتے ہی میں نے مریض کی پنڈلی پر بندھی ہوئی پٹیاں کھول دیں۔ پٹیاں دورانِ خون کو روکنے یا کم کرنے کے لیے باندھی جاتی ہے تاکہ جس میں زہر جلدی نہ پھیلنے پائے۔ جبکہ پٹیاں کھولنے سے دورانِ خون کو زخم پر لگے ہوئے منکوں سے زیادہ سے زیادہ گزارنے کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ منکے جس میں داخل شدہ تمام زہر آسانی سے چوس لیں۔

اپنے کام سے فارغ ہوا تو ماحول کا جائزہ لیا۔ باہر سارا کلینک لڑکوں سے بھرا تھا۔ کئی لڑکے شیشے والی کھڑکی سے کمرے کے اندر کا سارا منظر دیکھ رہے تھے۔ مریض اور میرے علاوہ کمرے میں سکول کی نرس، ڈاکٹر، مسٹر والٹن اور رچرڈ تھے اور سب کی نظریں مجھ پر لگی تھیں۔ مجھے پر سکون دیکھ کر رچرڈ نے سوال کیا، ہم نے مریض کو کلکتہ بھجوانے کے لیے ہیلی کاپٹر منگوایا ہے جو تقریباً دو گھنٹوں کے اندر یہاں پہنچ جائے گا۔ میں نے منکوں پر سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ منکا کاٹ سے چپک جانے کا مطلب ہے کچھ دیر میں سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا اور آپ کو ہیلی کاپٹر کی ضرورت نہیں پڑے گی اس لیے اگر آپ مناسب سمجھیں تو ہیلی کاپٹر کو منع کر دیں۔ پھر میں نے کسی کو مخاطب کیے بغیر سوال کیا، اس کو سانپ نے کب اور کہاں کاٹا تھا؟ مسٹر والٹن بولے، تقریباً دس منٹ پہلے اس کے کمرے میں۔ مریض کے جسم کی کپکپاہٹ میں اب خاصی کمی آنے لگ گئی تھی لیکن اس کی آنکھیں اب بھی نیم وا تھیں۔

میری نظریں منکوں پر جمی تھیں۔ ایسے میں ایک منکا گر گیا۔ منکا یا تو زہر جذب کر کے سیر شدہ ہونے پر گر جاتا ہے اور یا پھر جسم میں زہر باقی نہ ہونے کی وجہ سے۔ ایک منکا گرنے کا مطلب منکا سیر شدہ ہو کر گر گیا تھا۔ منکے کا رنگ بھی سیر شدہ ہو کر تبدیل ہو جاتا ہے۔ میں نے جار سے دوسرا منکا زخم پر لگایا تو وہ بھی پہلے کی طرح زخم پر چپک گیا۔ ایسے میں دوسرے دانت والا منکا بھی گر گیا تو میں نے وہاں بھی نیا منکا لگا دیا۔ منکے تبدیل کرنے کے بعد میں نے دوسرا سوال کیا؟ سانپ کہاں ہے؟ اس بار بھی میرے سوال کا جواب مسٹر والٹن نے دیا۔ سانپ کا ابھی تک کوئی پتہ نہیں۔ شاید وہ ابھی تک اس کمرے میں ہوگا جہاں اس نے ارون کو کاٹا تھا۔ دونوں منکے ایک بار پھر سیر شدہ ہو کر زخم سے گر پڑے تو میں نے تیسرا منکا لگا دیا۔ سانپ کی کاٹ سے عموماً ایک یا دو منکوں کے استعمال سے جسم سے زہر نکل جاتا ہے۔ کاٹ پر چھ منکوں کا مطلب تھا کہ سانپ نے مریض میں کافی مقدار میں زہر داخل کی تھی۔

منکے جوں جوں زہر چوس رہے تھے مریض کی حالت سنبھل رہی تھی۔ اس کی ہچکیاں اور کپکپاہٹ اب مکمل طور پر بند ہو چکی تھیں، اس کی سانسیں معتدل ہو چکی تھیں، اس کے جسم کی رنگت واپس آ چکی تھی اور اس نے آنکھیں

کھول لیں تھیں لیکن اس کے چہرے سے سانپ کی کاٹ کا خوف اب بھی عیاں تھا۔اور کیوں نہ ہوتا کسی کو ڈرانے کے لیے سانپ کا نام لیناہی کام ہوتا ہے۔اس بچارے کو تو کسی زہریلے سانپ نے کاٹا تھا۔آخر میں دونوں منکے ایک ساتھ گر پڑے جو جسم میں زہر ختم ہونے کی علامت تھی۔میں نے چوتھا منکا دونوں زخموں پر لگانے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں ٹِکا۔چوتھا منکا نہ لگنے کا مطلب تھا کہ جسم زہر سے پاک ہو چکا تھا۔میں نے مریض سے پوچھا جو کبھی مجھے اور کبھی اپنی کاٹ کو ٹکٹکی باندھے دیکھ رہا تھا، جب سانپ نے تمہیں کاٹا تو تم اس وقت کہاں تھے؟ مریض نے توانا آواز میں جواب دیا، سانپ نے مجھے میرے بستر پر سوتے ہی کاٹا تھا۔ میں نے کھڑے ہو کر رچرڈ سے کہا، دس پندرہ منٹ بعد یہ بالکل ہشاش بشاش ہو جائے گا۔میں اُس کمرے میں جانا چاہتا ہوں جہاں اسے سانپ نے کاٹا تھا۔ تمہارے خیال میں سانپ ابھی وہیں ہوگا؟ رچرڈ نے سوال کیا۔میں نے جواب دیا، یقیناً ڈسنے کے بعد سانپ سست ہو جاتے ہیں۔اس کو کس سانپ نے کاٹا ہے، رچرڈ نے دوسرا سوال کیا؟ یہی جاننے کے لیے تو میں وہاں جانا چاہتا ہوں۔ سانپ کی ایسی کاٹ میں نے اپنے جیون میں پہلی بار دیکھی ہے۔میں نے جواب دیا۔چلو، مسٹر والٹن نے کہا۔

میں نئے سانپ کو دیکھنے اور اس کا نام جاننے کے لیے بیتاب تھا۔ ڈاکٹر اور نرس کو مریض کے پاس چھوڑ کر رچرڈ بھی ہمارے ساتھ ہولیا۔ہم کمرے سے نکلے تو کچھ لڑکے کمرے میں آگئے اور باقی لڑکے ہمارے پیچھے پیچھے آنا شروع ہو گئے۔مسٹر والٹن اپنی رہنمائی میں ہمیں لڑکے کے کمرے تک لے گئے۔ یہ کمرہ دوسری منزل پر تھا جس کے برآمدے میں اس وقت بھی لڑکوں کا خاصا رش تھا۔میں مسٹر والٹن سے ایک تکیے کا غلاف اور ایک ڈش میں پانی لانے کا کہہ کر خود اپنے کمرے کی طرف جانے کے لیے مڑا اور رچرڈ کو بتایا کہ میں اپنے کمرے میں منکے واپس رکھ کر اور وہاں سے کچھ اور لے کر ابھی آتا ہوں۔میں تقریباً بھاگتا ہوا ہال میں کھڑے کھسر پھسر کرتے ہوئے لڑکوں کے درمیان جگہ بناتا ہوا تیسری منزل پر اپنے کمرے کی طرف لپکا۔منکوں کا جار رکھ کر کمرے سے رات کی رانی کا جار اُٹھا کر بھاگ کر واپس پہنچا تو رچرڈ برآمدے میں کھڑے طلباء کو اپنے اپنے کمروں میں جانے کی ہدایت دے رہا تھا۔میں نے انہیں بتایا کہ سانپ کی موجودگی کے خوف سے کسی کو نیند نہیں آئے گی۔میرے خیال کے مطابق اگر لڑکے اپنی آنکھوں سے سانپ کا پکڑا جانا دیکھ لیں تو باقی رات سکون سے سو سکیں گے۔اسے میری بات پسند آئی تو اس نے لڑکوں کو وہیں کھڑے رہنے کی تلقین کی ۔ڈش کی بجائے مسٹر والٹن کے ہاتھ میں پانی کا گلاس دیکھ کر میں نے کہا، سانپ گلاس میں پانی نہیں پیتے۔مجھے ڈش میں پانی لا دیں۔وہ جھینپنے کے انداز میں ڈش میں پانی لے آئے تو میں نے مسٹر والٹن کے ہاتھ سے پانی کی ڈش لے کر اس میں رات کی رانی کی پھل پتی ڈال کر کمرے کا دروازہ نیم وا کر کے اس کے سامنے برآمدے میں کھلا ہوا جار اور ڈش رکھنے کے بعد دروازے پر نظریں جمائے رچرڈ کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔

رچرڈ نے مجھے اپنے کام سے فارغ دیکھ کر پوچھا، اِس جار میں کیا ہے؟ میں نے جواب میں اسے بتایا کہ جار میں رات کی رانی کی پھل پتی ہے۔ سانپ اس کی خوشبو پسند کرتے ہیں اور اس پودے کے آس پاس اپنے لیے جوڑا تلاش کرتے ہیں۔اور پانی رکھنے کی کیا وجہ ہے؟ مسٹر والٹن نے سوال کیا۔ڈسنے کے بعد منہ خشک ہو جانے کی وجہ سے سانپ پانی کی طلب محسوس کرتا ہے، میں نے جواب دیا۔برآمدے میں موجود تمام لوگوں کی نظریں دروازے پر رکھے ہوئے جار اور ڈش پر تھیں۔چند منٹ کے بعد دروازہ ہلا اور ایک گول سے سر والا سانپ دروازے سے نمودار ہوا جس نے ڈش میں منہ ڈال کر پانی پینا شروع کر دیا اور اس کے ساتھ اس کا سفید اور پیلا اور دو میٹر لمبا جسم دروازے کے باہر تھا۔سانپ کو دیکھ کر میرے علاوہ برآمدے میں موجود سب لوگ غیر ارادی طور پر چند قدم پیچھے ہٹ گئے۔پانی پی کر سانپ نے اپنی دُم اُٹھا کر کسی چھن چھنے کی طرح بجانا شروع کر دی۔اس کے بعد وہ جار سے ہوتا ہوا میری طرف بڑھا اور کنڈلی مار کر میرے پیروں کے پاس بیٹھ کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔یہ سانپ میرے قدموں میں یوں بیٹھا تھا جیسے کوئی ملزم پولیس کے سامنے ہتھیار ڈالتا ہے۔سانپ کا میرے آگے یوں کسی معمول کی طرح بیٹھنا ہم سب کے لیے حیران کن تھا۔یہ چھنچھنا سانپ یعنی Rattle Snake تھا۔میں نے اس سانپ کے بارے میں پڑھا ضرور تھا لیکن دیکھنے کا یہ میرا پہلا اتفاق تھا۔پورے شمالی امریکہ میں اس سے زیادہ زہریلا سانپ نہیں پایا جاتا۔

میں نے اپنا ایک ہاتھ سانپ کے سامنے رکھا اور دوسرا ہاتھ آہستہ آہستہ پیچھے لے جا کر اس کی گردن پکڑ کر باقی ماندہ سانپ کو بھی اٹھا کر مسٹر والٹن سے تکیے کا غلاف لے کر سانپ کو غلاف میں ڈالا اور غلاف کو گرہ لگا دی۔جس ماحول کو چند لمحوں بیشتر واقعی سانپ سونگھ گیا تھا اس میں جیسے زندگی کے آثار واپس آ گئے تھے۔سارا برآمدہ بہت خوب کے نعروں اور تالیوں کے شور سے گونج اٹھا۔ رات کی رانی کے جار پر ڈھکنا لگا کر اسے بند کیا تو رچرڈ نے مجھ سے پوچھا۔کیا تم منکے اور گل پتی ہر وقت اپنے پاس رکھتے ہو؟ ہاں! یہ میرے ہتھیار ہیں۔ایک سپیرے کے ہتھیار، میں نے اسے باپو کی زبان میں جواب دیا۔اس وقت میں سوچ رہا تھا کہ باپو کی بات کتنی سچی تھی۔اگر آج میرے پاس یہ ہتھیار نہ ہوتے تو میں خود کو کتنا بے بس محسوس کرتا۔

میرے ذہن میں چند سوالات بُری طرح مچل رہے تھے۔اس سے پہلے کہ میں کچھ سوچتا۔رچرڈ نے میرے ہاتھ میں تکیے کے غلاف میں لپٹے سانپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے پوچھا، تم اس سانپ کا اب کیا کرو گے۔ میں اس بارے میں آپ سے کل کسی وقت تفصیلی بات کرنا چاہوں گا، میں نے جواب دیا۔کل کیوں؟ جو بات کرنی ہے ابھی اور اس وقت کرتے ہیں، اس نے چلتے ہوئے کہا۔مسٹر والٹن بولے، میرا دفتر یہاں سے چند کمرے دور ہے اگر آپ

مناسب سمجھیں تو وہاں بیٹھ کر باتیں کر لیں۔ رچرڈ نے طلباء کو کمروں میں جانے کو کہا۔ سانپ کے پکڑے جانے کے بعد کئی لڑکے اپنے اپنے کمروں کو پہلے ہی جانے لگ گئے تھے۔ ہم تینوں چلتے ہوئے مسٹر والٹن کے کمرے میں آئے۔ ہمیں اپنے کمرے میں چھوڑ کر میں نے مسٹر والٹن کو جاتے دیکھا تو انہیں گفتگو میں شرکت کے لیے روک لیا اور کہا، سانپ ٹھنڈے خون کا جانور ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو سردیوں کے موسم میں بلوں، غاروں اور کھوؤں میں تقریباً دفن کر دیتا ہے۔ یہ شمالی امریکہ میں پایا جانے والا سب سے زہریلا سانپ ہے۔ امریکہ سے اس سردی کے موسم میں یہ سانپ یہاں کیسے اور کیوں پہنچا؟ یہ سوال مجھے پریشان کر رہا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟ مسٹر والٹن نے پوچھا۔ میں نے جواب دیا، اگر آپ لوگ اجازت دیں تو میں اس سلسلے میں مزید تحقیق کرنا چاہتا ہوں۔ رچرڈ بولا، میری طرف سے تمہیں کھلی چھٹی ہے۔ مسٹر والٹن تمہاری ہر ممکن مدد کریں گے۔ اگر میری ضرورت ہو تو جب چاہے مجھ سے مل کر بات کر لو۔ اس کے علاوہ کچھ اور؟ اس نے سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے پوچھا۔ نہیں، میں نے جواب دیا۔ رچرڈ نے کہا، اچھا تو میں اب چلتا ہوں، جانے سے پہلے میں ارون کو کلینک میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ اسے آج رات کلینک میں ہی رہنے دیں تو اچھا ہوگا، میں نے جانے سے پہلے رچرڈ سے کہا۔ ہاں ہاں ضرور، رچرڈ نے میری طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ پھر وہ مجھے جذباتی انداز میں گلے لگاتے ہوئے بولا، میرے پاس تمہارے لیے شکریہ ادا کرنے کو الفاظ نہیں ہیں۔ آج تمہاری وجہ سے نہ صرف ایک اور جان بچی ہے، بلکہ ہمارے سکول کی عزت بھی بچ گئی ہے۔ یہ ایک سپیرے کے روزانہ کا معمول ہے، اس لیے شکریے کی ضرورت نہیں ہے، میں نے جواب دیا۔ رچرڈ کے جانے کے بعد میں نے سانپ اور رات کی رانی کا جار اٹھایا اور اپنے کمرے میں آ گیا۔ گھڑی رات کے دو بجا رہی تھی۔ میں نے سانپ کی گٹھڑی کو ایک کونے میں رکھا اور اپنے بستر پر سو گیا۔

دوسری صبح اگر امر مجھے بروقت نہ جگاتا تو شاید ناشتے کے ساتھ ساتھ میرا پہلا پیریڈ بھی رہ جاتا۔ اسے شاید رات والے واقعے کا علم نہیں تھا اس لیے اس نے کل رات والے سلسلے میں کوئی بات نہیں کی اور نہ ہی میں نے اسے کچھ بتانا مناسب سمجھا۔ میں جلدی جلدی تیار ہو کر اس کے ساتھ ناشتے کے لیے گیا۔ تمام دن گردنیں میری طرف مڑتی رہیں اور نگاہیں میری طرف اٹھیں رہیں۔ نہ کسی نے مجھ سے کچھ پوچھنے کی کوشش کی اور نہ میں نے کسی کو کچھ بتانے کی۔ دو بجے کے بعد لائبریری جانے سے پہلے حسبِ عادت امر کے کمرے میں چائے کے لیے گیا تو وہ مجھے کہنے لگا، سارا کالج کل رات والے واقعے کے بارے میں باتیں کر رہا ہے اور تم نے مجھے کچھ بتایا تک نہیں؟ میں نے کہا، اگر میں ضروری سمجھتا تو تمہیں سب سے پہلے بتاتا۔ ضروری کیوں نہیں تھا، یہ اتنی بڑی بات ہے کہ اسے تو اخباروں میں چھپنا چاہیے تھا۔ اخباروں میں سچی اور اچھی باتیں چھپتی ہی کہاں ہیں؟ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ تمہاری یہ بات تو بالکل بجا ہے، امر نے چائے کا کپ مجھے دیتے ہوئے کہا۔ پھر بولا، تمہیں یاد ہے ایک دن میں نے تمہیں کہا تھا کہ تمہارے گھر چلے جانے سے میرا من ہاسٹل میں نہیں لگتا۔ اگر تمہارے ماتا پتا برا نہ مانیں تو میں بھی ہر ہفتے تمہارے ساتھ گھر جایا کروں؟ اور تم نے مجھے اپنے بارے میں نہ صرف سب کچھ صاف صاف بتانے کے بعد کہا تھا کہ جب بھی من چاہے تمہارے ساتھ تمہاری جھونپڑی میں جا سکتا ہوں۔ میں نے چائے کی چسکی لیتے ہوئے کہا، ہاں مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ امر مسکراتے ہوئے بولا، اس دن میں نے تمہاری کسی بات پر یقین نہیں کیا تھا۔ میں سمجھا تھا شاید تم مجھے اپنے ساتھ نہ لے جانے کا بہانہ بنا رہے ہو۔ میں نے تمہیں غلط سمجھا تھا۔ امید ہے کہ تم مجھے معاف کر دو گے اور اب میں کسی دن تمہارے ساتھ تمہاری جھونپڑی میں ضرور جاؤنگا۔ میں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا، ٹھیک ہے، جب جی چاہے میرے ساتھ چلو۔

چائے پینے کے بعد وہاں سے نکل کر لائبریری جانے کی بجائے مسٹر والٹن کے دفتر جا پہنچا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ارون بالکل ٹھیک ہے اور وہ بھی مجھ سے مل کر میرا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہے۔ میں نے اپنے آنے کا مقصد بتاتے ہوئے ان سے پوچھا، ہمارے کمروں کی چابیاں کس کس کے پاس ہوتی ہیں؟ کہنے لگے، میرے علاوہ چار لوگوں کے پاس۔ میں نے ان چاروں سے بات کرنے کی خواہش ظاہر کی تو انہوں نے اپنے چپڑاسی کو بلا کر ان سب کو لانے کو کہا۔ میں نے وہاں سے اٹھتے ہوئے کہا، اگر آپ ان کو میرے کمرے میں لے آئیں تو زیادہ اچھا ہوگا۔ انہوں نے کوئی سوال پوچھے بغیر حامی بھر لی۔ میں نے اپنے کمرے میں واپس آ کر تکیے کے غلاف سے بڑے محتاط انداز سے سانپ نکال کر اسے اپنے ہاتھوں میں ایسے رکھ لیا کہ سانپ کا جسم میرے بازو سے لپٹا تھا اور اس کا منہ میرے ایک ہاتھ میں تھا جبکہ اس کی دم میرے دوسرے ہاتھ میں تھی۔

کچھ دیر بعد مسٹر والٹن دو مردوں اور دو عورتوں کو لے کر میرے کمرے میں آ گئے۔ مسٹر والٹن نے ان کا تعارف کراتے ہوئے بتایا، یہ رام لعل ہے، یہ مارتھا ہے، یہ کلپنا ہے، اور یہ علی بھائی ہیں۔ چاروں نے میرے ہاتھ میں سانپ دیکھا تو ایک لمحے کے لیے ٹھٹھک کر رک گئے۔ میں نے انہیں آگے آنے کو کہا۔ پھر ان سے ٹھہرے ہوئے لہجے میں مخاطب ہوا، اس وقت میرے ہاتھوں میں وہی سانپ ہے جس نے کل رات ارون کو ڈسا تھا۔ یہ سانپ خود چل کر وہاں نہیں پہنچا تھا بلکہ لایا گیا تھا۔ میں لانے والے کو نہیں جانتا لیکن یہ سانپ ضرور جانتا ہے۔ اگر تم میں سے کسی نے اس سانپ کو پہلے ہاتھ نہیں لگایا تو تمہیں فکر مند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ یہ سانپ خود ہی اپنے لانے والے کی طرف اپنی زبان سے اشارہ کرے گا۔ یہ کہتے ہوئے میں نے ان چاروں کو بڑے غور سے دیکھا تو اُن میں سے ایک پکی عمر کی عورت، جس کا نام مسٹر والٹن نے مارتھا بتایا تھا، کی ٹانگیں کانپنے لگیں تھیں، جسم میں ہلکا سا رعشہ اور ماتھے پر پسینہ تھا۔ میں نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا، اس سے پہلے کہ سانپ تمہاری طرف اشارہ کرے۔ اگر تم خود ہمیں بتا دو گے تو شاید تمہاری نوکری بچ جائے۔ پھر میں نے ان چاروں کو

باہر جا کر ایک ایک کر کے کمرے میں آنے کو کہا۔ مارتھا کسی بے جان لاش کی طرح چل کر کمرے سے باہر جا رہی تھی۔ ان کے باہر جاتے ہی مسٹر والٹن نے مسکراتے ہوئے کہا، میرا خیال ہے ہم دونوں نے دیکھ لیا ہے کہ یہ کس کی حرکت ہے۔ میں نے ان کی بات سے اتفاق کرتے ہوئے کہا، میں مارتھا کو سب سے آخر میں بلاؤنگا۔ اپنی بات آگے بڑھانے سے پہلے میں یہاں اس بات کا اقرار کرتا چلوں کہ میں نے ان سے سانپ کی زبان کے اشارے سے پہچان کے بارے میں جھوٹ بولا تھا۔ ایسے جھوٹ عموماً لاعلم لوگوں پر چل جاتے ہیں اور مارتھا کے ساتھ بھی وہی ہوا تھا۔

پہلے تینوں ایک ایک منٹ کے لیے کمرے میں آ کر واپس بھیج دئے گئے۔ میں نے مارتھا کو سب سے آخر میں بلایا۔ مارتھا دیسی عیسائی تھی اور طلباء کے کمروں کی صفائی کی انچارج تھی۔ مارتھا کمرے میں آتے ہی مسٹر والٹن کے قدموں پر گر کر زور زور سے گڑگڑا کر اپنے جرم کا اقرار کرتے ہوئے بولی، دولت کا لالچ بری بلا ہے سر۔ ارون کی سوتیلی ماں نے مجھے یہ سانپ خاموشی سے ارون کے بستر بناتے وقت بستر میں رکھنے کے عوض دس ہزار روپے دئے تھے۔ اس نے کہا تھا کہ سانپ کی کاٹ کے واویلے میں کسی کو اس بات کا پتہ تک نہ چلے گا۔

مارتھا کی یہ بات سچ تھی۔ عموماً ایسا ہی ہوتا ہے سانپ ایک کو کاٹتا ہے اور باقی تمام لوگ سانپ پر لاٹھیوں اور جوتوں کی برسات کر کے اسے ناقابل شناخت بنا دیتے ہیں اور اگر شناخت کے قابل بھی ہو تو سانپ کی قسم پر کون توجہ دیتا ہے۔ عام لوگوں کے لیے سانپ کی صرف اور صرف ایک ہی قسم ہوتی ہے اور اس قسم کا نام صرف اور صرف سانپ ہے۔ اگر یہ سب کچھ میری عدم موجودگی میں ہوتا تو ارون کی موت ایک حادثہ سمجھ لی جاتی۔ میں نے سانپ کو واپس تکیے کے غلاف میں رکھتے ہوئے پوچھا، تمہیں یہاں سانپ کس نے لا کر دیا تھا؟ یہ سانپ مجھے ارون کی سوتیلی ماں نے خود لا کر دیا تھا سر۔ وہ پرسوں ارون کے والد کے ساتھ یہاں آئی تھی، مارتھا بولی۔ میں نے کہا، اچھا اب تم جاؤ اور اس بات کو تم اپنے تک ہی رکھنا۔ آگے کسی کو نہ بتانا سمجھیں۔ جی سر بالکل سمجھ گئی، مارتھا یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گئی۔ مارتھا کے جانے کے بعد میں نے مسٹر والٹن سے کہا، اس سے پہلے کہ کالج اس کی نوکری کے بارے میں کوئی فیصلہ کرے، میں آپ کی موجودگی میں ارون سے کہہ کر اس کے والد کو یہاں بلوانا چاہتا ہوں۔ مسٹر والٹن اور میں ارون کے کمرے کو جانے کے لیے اپنے کمرے سے ابھی نکلنے والے تھے کہ میرے کمرے کے دروازے پر دستک ہوئی۔ میں نے دروازہ کھولا تو ارون میرے سامنے کھڑا تھا۔ میں نے اسے کمرے میں بلا لیا اور اس سے پہلے کہ وہ میرا شکریہ ادا کرتا میں نے اس سے پوچھا، کیا یہ سچ ہے کہ تمہارے والدین تمہیں چند روز پہلے یہاں پر ملنے آئے تھے؟ ارون کو اس بات پر حیرت تھی کہ مجھے اس کے والدین کے یہاں آنے کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔ اس لیے وہ حیرانی سے کہنے لگا، دو روز پیشتر۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ تم ایک بار پھر صرف اپنے والد کو یہاں بلاؤ، میں نے صرف کے لفظ پر زور دیتے ہوئے ارون سے کہا۔ اس نے نہ سمجھتے ہوئے پوچھا، ہاں! مگر کس لیے؟ میں نے جواب دیا، اگر ہم یہ باتیں تمہارے والد کی موجودگی میں تمہیں بتائیں تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اور ہاں! میرا شکریہ بھی اپنے والد کی موجودگی میں ادا کر دینا۔ وہ کہنے لگا، میں ابھی جا کر انہیں تار دے کر آتا ہوں۔ مسٹر والٹن نے کہا، تم میرے کمرے سے اپنے والد کے نمبر کی ایک ٹرنک کال بک کروادو۔ ہم انہیں بہت جلدی بلانا چاہتے ہیں۔ ہم نے پہلے مسٹر والٹن کے کمرے والے فون سے ارون کے والد کے لیے ایک کال بک کروائی۔ پھر ڈاک خانے سے ایک تار بھی دے آئے۔ اس عرصے میں ہم ایک دوسرے سے کافی متعارف ہو چکے تھے۔

ہمارے کالج میں گیارہویں جماعت میں پڑھنے والے ارون اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔ ارون کی ماں چند برس پہلے ایک ہوائی حادثے میں فوت ہو گئی تھی۔ ارون کے والد، انیل کمار کی ہندوستان کے کئی علاقوں میں فولاد کی ملیں تھیں۔ اس کا کاروبار پوری دنیا میں پھیلا ہوا تھا جبکہ ان کا ڈیرہ بمبئی میں تھا۔ چھ ماہ پہلے امریکہ کے ایک کاروباری دورے کے دوران اس کی ملاقات لورا نامی ایک گوری سے ہوئی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو پہلی ہی نظر میں پسند کیا تھا اور پھر پچاس سالہ انیل نے تیس سالہ لورا سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد سے اب تک دونوں بہت خوش زندگی گزار رہے ہیں۔ ارون کا خیال تھا کہ اس کی نئی ماں اس کے ساتھ بڑے پیار سے پیش آتی ہے۔ ارون کو کمرے میں رہنے کی ہدایت کرتے ہوئے مسٹر والٹن نے وعدہ کیا کہ ٹرنک کال مل جانے پر وہ ارون کو کمرے سے بلوائے گا۔ ارون کے جانے کے بعد مسٹر والٹن نے مجھے کہا، تم کسی جاسوس کے انداز میں یہ تحقیق کر رہے ہو۔ جی ہاں، میں نے جواب دیا، اگر اس کالج میں کسی کو کچھ ہوتا ہے تو یہ ہمارے کالج کی بدنامی ہے۔ میرا خیال ہے ہم مسٹر سمتھ کو ان تمام حالات سے مطلع کر دیں۔ مسٹر والٹن نے جواب دیا، کیوں نہیں؟ میں نے کہا، میں چاہتا ہوں کہ ارون کے والد کو رچرڈ کی موجودگی میں مارتھا یہ سب کچھ بتائے۔ میں پرنسپل کو رچرڈ ہی کہتا تھا۔

مسٹر والٹن نے رچرڈ سے بات کرنے کی حامی بھری تو میں ان سے اجازت لے کر لائبریری میں سکول کا کام کرنے چلا گیا۔ مجھے ابھی وہاں بیٹھے ہوئے ایک گھنٹہ ہی ہوا ہوگا کہ ارون نے وہاں آ کر مجھے بتایا کہ اس کا والد کل یہاں پر آ رہا ہے۔ ہم دونوں وہاں سے اٹھ کر کھانے کے لیے گئے تو امر وہاں پہلے سے موجود تھا۔ ہم نے ایک ساتھ کھانا کھایا اور اپنے کمروں میں جانے لگا تو میں نے ارون سے پوچھا کہ کل رات اس نے کہاں گزاری تھی؟ وہ بولا کلینک میں۔ میں نے کہا، آج کی رات کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ کہنے لگا، اب تو مجھے اپنے کمرے میں سونا تو درکنار، جاتے ہوئے بھی ڈر لگتا ہے۔ میں کل رات والے واقعے کے بعد اپنے کمرے میں صرف چند لمحوں کے لیے کپڑے بدلنے گیا ہوں۔ میں نے کہا، اگر تم چاہو تو میں آج رات تمہارے کمرے میں رہ جاتا ہوں۔ اسے یہ بات پسند آئی۔ پہلے ہم امر کے کمرے میں گئے، میں اسے وہاں بٹھا کر

اپنے کمرے میں گیا، کالی کو بتایا کہ میں رات کہیں اور رہوں گا۔ اپنے سونے کے کپڑے لئے اور امر کے کمرے سے ارون کو لیا اور وہاں سے ارون کے کمرے میں گئے۔ میں نے ارون کا کمرہ بستر اور غسل خانہ اچھی طرح کھنگالنے کے بعد اسے بستر پر سونے کو کہا تو اس نے پوچھا، تم کہاں سوؤ گے؟ میں نے کہا، میں سپیرا ہوں اور میں نے اپنی ساری زندگی زمین پر سو کر ہی گزاری ہے۔ کہنے لگا نہیں، میں تمہیں زمین پر نہیں سونے دوں گا۔ یا ہم دونوں بستر پر سوئیں گے یا پھر زمین پر۔ آخر کار ہم دونوں ایک بستر پر باتیں کرتے کرتے سو گئے۔

صبح ارون کو جگا کر میں اپنے کمرے میں آیا۔ تیار ہو کر امر کے ساتھ حسبِ عادت ناشتا کرنے کے بعد اپنی کلاسیں پڑھنے لگا۔ پانچویں پیریڈ کے دوران پرنسپل کا چپڑاسی مجھے بلانے آیا۔ کلاس سے باہر چپڑاسی نے مجھے بتایا کہ صاب کہتے ہیں کہ جو کچھ تم ساتھ لانا چاہتے ہو لے کر آ جاؤ۔ میں اسے واپس بھیج کر اپنے کمرے میں گیا۔ وہاں سے سانپ کا تھیلا اٹھایا اور پرنسپل کے دفتر آیا۔ سیکرٹری کے کمرے میں پریشان حال مارتھا بیٹھی تھی۔ دفتر میں ارون اور اس کے والد کے علاوہ مسٹر والٹن پرنسپل کے سامنے بیٹھے تھے۔ انیل، ارون کا والد میانہ قد و کاٹھ کا ایک ہنس مکھ سا انسان تھا۔ میں نے زوردار انداز میں سب سے نمستے کہا اور تھیلا ایک طرف رکھ کر مسٹر والٹن کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میرا خیال ہے کہ میرے آنے سے پہلے باپ بیٹا سانپ کے بارے میں سب کچھ سن چکے تھے اس لیے میں نے انیل کے چہرے پر اپنے لئے تشکر کے اثرات دیکھے۔ میرے بیٹھتے ہی پرنسپل نے مارتھا کو اندر بلوا کر کہا کہ کل تم نے جو کچھ مسٹر والٹن اور رامو کے سامنے کہا تھا وہ مسٹر کمار کو بتاؤ۔ جوں جوں مارتھا بولتی جاتی باپ بیٹے کے چہروں پر حیرانی اور پریشانی کے آثار گہرے سے گہرے تر ہوتے جاتے۔ مارتھا کی زبان سے مکمل کہانی سن کر دونوں باپ بیٹا فق ہو کر رہ گئے تھے۔ بات ختم کرنے کے بعد مارتھا کو واپس بھیج دیا گیا تو مسٹر والٹن نے انیل سے کہا، ہمیں سانپوں کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں ہیں۔ اگر رامو نہ ہوتا تو تمہارے بیٹے کی موت کو ایک اتفاقی موت قرار دے کر سانپ کو لاٹھی چارج کا نشانہ بنا دیا جاتا۔ مسٹر کمار اور ارون اپنی اپنی کرسیوں پر سے میرے سامنے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہونے لگے تو میں نے اٹھ کر انہیں گلے لگا کر کہا، ایک سپیرے نے اپنا کام کیا ہے اور بس۔ پھر رچرڈ نے انیل سے کہا، آپ کے بچے کی زندگی کے ساتھ ساتھ ہمیں اپنے کالج کی ساکھ کا بھی خیال ہے۔ اگر آپ نے اس مسئلے کا تدارک نہ کیا تو ہو سکتا ہے اس کا اگلا وار خطا نہ جائے۔

انیل نے بڑے جذباتی انداز میں کہا، مجھے اندازہ نہیں تھا کہ میں امریکہ سے اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے عورت کے بجائے ایک ناگن بیاہ لیا تھا۔ یہ پہلے اپنے زہر سے میرے ارون کو ختم کرتی، پھر مجھے اور اس کے بعد ہمارے سب سرمائے کی بلا شرکتِ غیرے مالک بن جاتی۔ یہ ناگن اب واپس امریکہ ہی جائے گی۔ پھر اس نے رچرڈ کو اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا، ارون اب اپنے کمرے میں جانے سے گھبراتا ہے۔ اسی کارن مسٹر شان کل رات ارون کے کمرے میں سویا تھا تو اسے سکون کی نیند آئی تھی۔ میری آپ سے بنتی ہے کہ اگر آپ کسی طرح ان دونوں کو ساتھ ساتھ کمرہ دے دیں تو نہ صرف ارون کی بلکہ میری راتیں بھی سکون سے گزریں گی۔ پرنسپل کی بجائے مسٹر والٹن نے کہا، کیوں نہیں؟ یہ سب کچھ آج ہی ہو جائے گا۔ پھر انیل نے میری طرف دیکھ کر کہا، مسٹر شان آج سے آپ میرے لیے میرے ارون سے کسی طرح کم نہیں ہیں۔ میں نے جواب دیا، اگر آپ مجھے اپنے ارون جیسا سمجھتے ہیں تو پھر مجھے مسٹر شان کی بجائے رامو کہہ کر مخاطب کریں۔ اس بات پر سب مسکرانے لگے تو انیل نے مجھے کہا۔ ٹھیک ہے رامو بیٹے، آج کے بعد تم مجھے انکل کہا کرو گے۔ اچھا انکل جی، میں نے جواب دیا، مجھے ارون سے اپنی دوستی اور بھائی چارے پر فخر ہوگا۔ پھر میں نے تھیلے میں رکھے سانپ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، تھیلے میں یہ سانپ کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا اس لیے اگر آپ چاہیں تو امریکی ناگن کے ساتھ ہی اس امریکی سانپ کو بھی واپس اپنے ملک بھجوا دیں۔ بمبئی میں ان سانپوں وانپوں کے چکر میں نہیں پڑتا، تم اس کے ساتھ جو کچھ کرنا چاہو میری بلا سے، انیل نے ڈرتے ہوئے کہا۔ اس کو مار کیوں نہیں دیتے؟ رچرڈ نے پوچھا۔ سپیرے سانپ پالا کرتے ہیں، مارا نہیں کرتے۔ آپ فکر نہ کریں میں اس کا کوئی نہ کوئی بندوبست ضرور کر دوں گا، میں نے رچرڈ کو جواب دیا۔

کچھ دیر بیٹھنے کے بعد یہ میٹنگ برخواست ہوئی تو میں ارون اور انکل کے ساتھ رچرڈ کے دفتر سے نکلا۔ انکل میرے اور ارون کے درمیان چلتے ہوئے بولے، رامو بیٹے اگر کبھی کسی چیز کی ضرورت ہو تو بلا جھجک مجھے بتانا۔ پھر اس نے ارون سے کہا، ارون بیٹے تم اس بار بہار کی چھٹیوں میں اپنے دوست کو بمبئی لے آنا۔ اس بار بہار کی چھٹیوں میں مَیں تم دونوں کو کہیں سیر پر بھجوانا چاہتا ہوں۔ باتوں کے دوران ہم سکول کے ہیلی پیڈ کی طرف جانے کے لیے مڑے تو مجھے اندازہ ہوا کہ انکل انیل اپنے ہیلی کاپٹر پر یہاں آئے تھے۔ ہیلی کاپٹر کے باہر باوردی پائلٹ ہمیں اپنی جانب آتا دیکھ کر اور با ادب کھڑا ہو گیا۔ انکل نے ہم دونوں کو ایک ساتھ گلے لگاتے ہوئے کہا، اچھا اب میں چلتا ہوں۔ تم دونوں دوست اکٹھے رہنے کی کوشش کرنا اور ایک دوسرے کا خیال رکھنا۔

ارون کو اسی روز میرے ساتھ والا کمرہ مل گیا۔ کمرہ بدلنے کی وجہ سے ارون کا ڈر بھی جاتا رہا۔ دو روز بعد ہفتے کے دن گھر جانے پر میں نے باپو کو چھنچھنا سانپ دکھایا۔ باپو کے لیے بھی یہ سانپ نیا تھا۔ انہیں اس سانپ کی چھنچھنانے والی دُم پسند آئی۔ کہنے لگے، اسے جھیل کے پاس جا کر چھوڑ دو۔ اگر اس ماحول میں زندہ رہ گیا تو اس کا نصیب اور اگر گزر گیا تو اس کی تقدیر۔ میں نے جھونپڑی سے دور ڈھلوان سے نیچے جا کر سانپ کو چھوڑ دیا۔

جینا اور ٹام نے اس واقعے کے بعد مجھے نہ صرف شکریے کا خط لکھا تھا بلکہ انہوں نے مجھ سے رچرڈ کے دفتر میں ٹیلی فون پر بھی بات کی تھی۔ دونوں نے میرے انگریزی کے لہجے کو بھی سراہا تھا۔ اس واقعے سے کالج میں میری خاصی

پہچان ہوگئی تھی اور اساتذہ میرا خیال رکھتے تھے۔ کئی لڑکوں نے میری طرف دوستی کی پیش قدمی کی۔ میں نے کبھی کسی کے اپنی طرف دوستی کے لیے بڑھے ہوئے ہاتھ کو جھٹکا نہیں تھا اس کے باوجود میں کسی اور سے زیادہ قریب نہ ہوسکا۔ دوستی کے لیے مشترک قدروں کی یا مماثلت کی شرط ہوتی ہے، میری ابھی تک کسی سے کوئی قدر نہیں ملتی تھی۔ موسیقی کا شوق رکھنے والے لڑکے گلوکاروں اور موسیقاروں کے بارے میں گھنٹوں باتیں کرتے تھے اور کھیلوں میں دلچسپی رکھنے والے کھیل اور کھلاڑیوں کی۔ میرے لیے ان کھیلوں میں، یا گانے بجانے میں کوئی کشش نہیں تھی۔ جب لڑکے آپس میں اپنی اپنی دلچسپی کی باتیں کرتے تو میرے لیے وہ سب کچھ اجنبی ہوتا تھا۔ اس کی وجہ کچھ ہو اور نہیں میری گذشتہ زندگی تھی۔ ایک آدھ بار ارون اور امر کے کہنے پر میں نے بیڈمنٹن اور کرکٹ کھیلنے کی ناکام کوشش بھی کی تھی۔ میں کبھی کبھار لائبریری سے ذہنی طور پر تھک جانے کے بعد امر اور ارون کو دوسروں کے ساتھ بیڈمنٹن کھیلتا دیکھ لیا کرتا تھا اور بس۔ امر اور ارون نے مجھے اپنے اپنے پسندیدہ گلوکاروں کے کیسٹ ٹیپ بھی سنوائے تھے۔ لیکن نہ کسی موسیقی نے میرے من کے تاروں کو چھیڑا تھا اور نہ ہی کسی موسیقار کی آواز نے میری روح کو گدگدایا تھا۔ میں نے اپنی موسیقی کو بین کے شوق تک ہی محدود رکھا۔

دوسروں کے ڈرانے اور دوسروں کی نیندیں اُڑانے والے سانپ میرا شوق تھے، میرا کھیل تھے۔ لڑکوں کی سانپوں سے دلچسپی صرف تجسس کی حد تک تھی۔ اسی وجہ سے میں دوستوں کے ہوتے ہوئے بھی اکیلا تھا۔ میری وجہ سے امر بھی ارون کی دوستی کے دائرے میں داخل ہو گیا تھا۔ میں کسی طور بھی ارون کو اپنے احسان تلے دبا کر نہیں رکھنا چاہتا تھا اس لیے امر اور ارون سے دوستی کے ساتھ ساتھ ان سے فاصلہ بھی برقرار رکھا۔ میں ان سے دن میں ایک آدھ بار مل کر تھوڑا سا وقت ضرور گزارتا تھا۔ جبکہ ارون اور امر ایک دوسرے کے ساتھ کافی وقت گزارنے لگے تھے۔ امر اور ارون ایک دو بار میرے ساتھ چند گھنٹوں کے لیے میری جھونپڑی بھی دیکھ آئے تھے۔

بسنت کی چھٹیوں میں دو دن رہتے تھے۔ ارون نے مجھے کتنی مرتبہ اپنے ساتھ کچھ وقت گزارنے کی یاددہانی کروائی تھی۔ امر نے مجھے اپنے ساتھ شملہ لے جانے کا کہا تھا۔ میں نے نہ ہی ابھی تک کسی کے ساتھ جانے کا وعدہ کیا تھا اور نہ ہی مجھے کہیں جانے کا شوق تھا۔ میں اپنے روزانہ کے معمول کو بہت کم تبدیل کیا کرتا تھا، اس لیے مجھے ڈھونڈھنا آسان ہوتا تھا۔

سہ پہر کے چار بجے تھے۔ میں حسبِ معمول لائبریری میں بیٹھا پڑھ رہا تھا کہ رچرڈ، مسٹر والٹن اور اشوک کے ساتھ ایک اور بزرگ لائبریری میں داخل ہو کر سیدھا میری جانب آئے۔ اشوک کے ساتھ میری کئی کلاسیں بھی تھیں اور وہ ارون کا بہت ہی گہرا دوست تھا اور ارون کے ساتھ والے کمرے میں رہتا تھا۔ دوسرے کئی لڑکوں کی طرح وہ بھی سانپ والے واقعے کا عینی شاہد تھا۔ راجہ مان سنگھ کے خاندان سے ہونے کی وجہ سے کافی مغرور تھا اور بولتا بھی بہت تھا۔ راجہ مان سنگھ مغل بادشاہ اکبر کا سالا اور چہیتا جرنیل تھا۔ اس نے سولہویں صدی کے آخر میں بنگال اور کابل کے کئی معرکوں میں مغلوں کو شاندار کامیابیاں دلوائیں اور ان علاقوں کا گورنر بنا دیا گیا تھا۔ جہانگیر کے دور میں اس کا انتقال ہوا تھا۔ اس خاندان کے لوگ اب تک بنگال کے علاوہ، راجستھان، اڑیسہ اور کابل میں موجود ہیں جبکہ اس کے گدی نشین راجستھان ریاست کے شہر جے پور میں ہیں۔ ابتداء میں اشوک مجھ سے دور ہی رہتا تھا لیکن رفتہ رفتہ وہ میرے ساتھ کچھ گھلنے ملنے لگا تھا۔ اشوک زیادہ تر کالج کی لڑکیوں کے ساتھ دیکھا جاتا تھا۔ کبھی کبھار امر کے کمرے میں ہمارے ساتھ چائے پینے کے لیے بھی آجاتا تھا۔ اس کے علاوہ میں اس کو نہیں جانتا تھا۔ ان کو اپنی طرف آتا دیکھ کر میں نے کتاب ایک طرف رکھی اور کھڑا ہو کر ان کا استقبال کیا۔

مسٹر والٹن بولے، میں نے انہیں کہا تھا کہ ہمارا پڑھا کُو لڑکا اس وقت لائبریری میں ہوگا۔ میں نے اپنے ہاتھ جوڑ کر سب سے نمستے کہا تو رچرڈ قریب بیٹھے پڑھتے ہوئے لڑکوں کو دیکھ کر کہنے لگا، لائبریری میں باتیں کرنا اچھا نہیں لگتا۔ میرے دفتر چل کر کچھ باتیں کرتے ہیں۔ لائبریری سے اُٹھ کر میں سب کے ساتھ رچرڈ کے دفتر کی طرف چل پڑا۔ رچرڈ کے دفتر تک جاتے جاتے مجھے اس بات کا علم ہو گیا تھا کہ اشوک کے ساتھ اس کے پتا، مہاراجہ امرناتھ جی مجھ سے ملنا چاہتے ہیں۔ دفتر میں اس وقت ہمارے علاوہ کوئی اور نہیں تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی مہاراجہ نے کہا، اشوک نے مجھے تمہارے بارے میں بہت کچھ بتایا ہے۔ اشوک نے جب مجھے سانپ کو ارون کے کمرے سے نکالنے کی ترکیب کا آنکھوں دیکھا منظر سنایا تو مجھے بالکل یقین نہیں آیا تھا۔ میرے خیال میں بچے بات بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ اس نے مسٹر والٹن اور پرنسپل کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، لیکن جب ان دو گواہوں نے اس بات کی تصدیق کی تو مجھے یقین ہو گیا کہ تم میرے گھر کے ایک پرانے اور سب سے خوفناک مسئلے کا شاید کوئی حل تلاش کرسکو گے۔ میں تم سے اشوک کے توسط سے بھی بات کرسکتا تھا لیکن بچوں کی بات سنجیدگی سے نہ لی جاتی۔ اس لیے میں نے بذاتِ خود یہاں آکر تمہارے کالج کے پرنسپل کی موجودگی میں تم سے بات کرنا مناسب سمجھا اور میں تمہیں اس کام کی کوئی بھی قیمت دینے کو تیار ہوں۔

میں نے انہیں آگے کچھ کہنے سے پہلے روک کر کہا، بات کاٹنے کی معافی چاہتا ہوں۔ اس سے پہلے کہ آپ آگے جائیں، میں یہ بات واضح کردوں کہ میں کوئی پیشہ ور سپیرا نہیں ہوں۔ اس لئے میں اپنے کام کے کسی سے پیسے نہیں لیتا، یہ میرا شوق ہے اور شوق کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ اگر آپ کا کام میرے بس کا ہوا تو میں اس کی حامی بھروں گا۔ ورنہ صاف کہہ دوں گا کہ یہ سب کچھ میری پہنچ سے باہر ہے۔ اگر میں آپ کے کسی کام آسکا تو مجھے خوشی ہوگی۔ اب آپ جو چاہیں مجھے بتائیں، میں ہمہ تن گوش ہوں۔

انہوں نے اپنی بات شروع کرتے ہوئے کہا، کسی خاندانی تمہید میں جانے کی بجائے میں کام کی بات پر آتا ہوں۔ راجہ ہونے کی وجہ سے ایک سے

زیادہ رانیاں رکھنا کوئی عیب کی بات نہیں سمجھی جاتی۔ میرے پتا مہاراج اجیت کی گیارہ رانیاں تھیں۔ ان میں سے پہلی دس رانیوں سے مہاراج کی کوئی اولاد نہیں تھیں۔ میں سب سے چھوٹی رانی کے بطن سے پیدا ہوا تھا۔ میری پیدائش کے بعد میری سوتیلی مائیں میری ماں اور میرے قتل کے درپے ہو گئیں تھیں۔ جب مہاراج کو ان کی سازش کا علم ہوا تو اس نے تمام رانیوں کو ہماری حویلی کے تہ خانے میں کچھ عرصے کے لیے نظر بند کر دیا۔ جہاں سے وہ ہمارے پشتی نوکروں کو اپنے ساتھ ملا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئیں۔ جنہیں میرے والد نے بعد میں گرفتار کروا کر قتل کروا دیا۔ اس دن کے بعد سے ہماری حویلی میں جیسے سانپوں نے ڈیرہ جما لیا ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ میری سوتیلی مائیں فرار ہونے سے پہلے زہریلے سانپوں کی ایک جوڑی ہماری حویلی کے تہ خانے میں چھوڑ گئی تھیں۔ ایک افواہ یہ بھی ہے کہ قتل ہونے سے پہلے سب رانیوں نے ہمارے خاندان پر اور ہماری حویلی پر کوئی منتر پھونکوایا تھا۔ وجہ جو کچھ بھی ہے ایک بات واضح ہے کہ اس واقعے کے بعد ہماری حویلی میں انسان کم اور سانپ زیادہ رہتے ہیں۔

پچھلے پچاس سال سے ہم نے اپنی حویلی میں کئی منتری بلوائے جنہوں نے حویلی میں کئی کئی چلے کاٹے۔ حیرت کی بات یہ ہوتی ہے کہ چلوں کے دوران سانپ آنا بند ہو جاتے ہیں۔ لیکن منتریوں کے جانے کے بعد سانپ واپس آ جاتے ہیں۔ ہم نے کئی بار سپیروں کو، شمانوں کو اور سادھوؤں کو اپنی حویلی میں مہمان رکھا ہے۔ جنہوں نے ہمارے سامنے حویلی سے کئی سانپ بھی پکڑے تھے۔ لیکن ان لوگوں کے حویلی چھوڑتے ہی سانپ واپس آ جاتے ہیں۔ پچھلے پچاس سالوں میں، ہم نے سانپوں سے نجات حاصل کرنے کی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ ان سانپوں نے ہمیں بے گھر اور بے سکون کیا ہوا ہے۔ بسنت سے کاتک کے مہینے ہمارے لیے سب سے زیادہ خوفناک ہوتے ہیں۔ پچھلے پچاس سال میں نہ صرف میرے دس ملازمین، بلکہ میری دو بیٹیاں اور ایک بیٹا بچپن میں سانپوں کا شکار ہو کر سورگباش ہوئے۔ کئی بار میں سانپوں کی کاٹ سے بال بال بچا ہوں، یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ پھر اس نے اشوک کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، میرا یہ بچہ مان سنگھ کے خاندان کی آخری نشانی ہے۔ پچھلے پچاس سال سے ان سانپوں سے لڑتے لڑتے میں تھک گیا ہوں اور میں اب مان سنگھ کے خاندان کو سانپوں کے خوف سے آزاد جیون گزارتے ہوئے دیکھ کر پرلوک سدھارنا چاہتا ہوں۔ اس کی آواز رندھنے لگی تو اس نے جیب سے رومال نکال کر اپنی آنکھیں اور ناک صاف کر کے میری طرف بڑی آشا بھری نظروں سے دیکھا۔

پرسوں ہماری بسنت کی چھٹیاں شروع ہونے والی ہیں۔ اگر آپ کہیں تو میں اشوک کے ساتھ آپ کے ہاں آ جاؤں گا۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ میں آپ کے ہاں جا کر دیکھنے کے بعد یہ فیصلہ کروں گا یہ کام میرے جیسے سپیرے کے بس کا ہے بھی یا نہیں۔ اگر بات منتروں کی ہوئی تو یہ سب کچھ میری حد سے باہر ہوگا کہ میں کوئی منتری نہیں ہوں۔ میرے جواب سے نہ صرف راجہ بلکہ تمام موجود لوگوں کے چہرے کھِل اٹھے۔ رچرڈ نے مجھے کہا، چھٹیوں میں صرف کل کا دن باقی ہے اور بہت سے طلباء اپنے اپنے گھروں کو ایک آدھ دن پہلے ہی چلے جاتے ہیں۔ کل کے دن پڑھائی بھی برائے نام ہوگی۔ مہاراج آج خود جائیں اور پھر تم لوگوں کے لیے کل سواری واپس بھجوائیں تو یہ کچھ اچھا نہیں لگتا۔ میری مانو تو تم مہارج کے ساتھ آج ہی چلے جاؤ۔ میں نے چند لمحے کچھ سوچا اور پھر حامی بھر لی۔ میں نے ان سے اپنے کمرے میں جا کر اپنا سامان سمیٹنے کی اجازت لی اور اُٹھ کر جانے لگا تو اشوک بھی میرے ساتھ اپنا سامان سمیٹنے کے لیے چل پڑا۔ راستے میں مجھے چاچو نظر آئے تو میں نے ان کے ہاتھ باپو کو چھٹیوں میں نہ آنے کی اطلاع کروا دی۔ ٹام کے دئے ہوئے سوٹ کیس میں اپنی سمجھ کے مطابق کپڑے رکھے، منکوں کا جار، بین، رات کی رانی کے جار کو سوٹ کیس میں رکھا اور اس کے ساتھ کالی والا بیگ اپنے ہاتھوں میں لے کر امر کے کمرے میں جا کر اسے نئی صورت حال سے آگاہ کر کے رچرڈ کے دفتر کی طرف چل پڑا۔ اپنی اٹھارہ سالہ زندگی میں آج پہلی بار میں پاہیرالہ سے باہر کہیں جا رہا تھا۔

رچرڈ اور مسٹر والٹن جا چکے تھے۔ اشوک اور مہاراج کالج کے بڑے ہال میں میرے منتظر تھے۔ میرے آتے ہی وہ لوگ ہیلی پیڈ کی طرف بڑھے۔ جہاں ایک باوردی پائلٹ نے مجھ سے سوٹ کیس لے کر باقی سامان کے ساتھ پیچھے رکھ دیا۔ میں مہاراج کے ساتھ ہیلی کاپٹر کی پچھلی نشست پر بیٹھا جبکہ اشوک پائلٹ کے ساتھ آگے بیٹھا۔ دورانِ سفر میں نے مہاراجہ سے سوال کیا، سانپ حویلی میں کسی خاص حصے میں پائے جاتے ہیں یا ہر جگہ؟ مہاراج کہنے لگے زیادہ تر سانپ ہمارے سونے کے کمروں اور غسلخانوں میں پائے جاتے ہیں اور میرے غلسخانے میں تو حد سے زیادہ پائے جاتے ہیں۔ آپ کی حویلی کے جس کمرے میں سانپ سب سے زیادہ نکلتے ہوں آپ مجھے سونے کے لیے وہی کمرہ دیں، میں نے کہا۔ مہاراج بولے میری آرام گاہ سانپوں کا سب سے بڑا مسکن معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے تم رات کو میری آرام گاہ میں رہ سکتے ہو۔ میں کل آپ کی حویلی کے سب سے پرانے ملازم سے بھی بات کرنا چاہوں گا، میں نے کہا۔ ہماری حویلی کا سب سے پرانا خادم دھرم داس ہے وہ ہر رات میرے کمرے کی رکھوالی کرتا ہے۔ اس نے اب تک پچاس سے زیادہ سانپ میرے کمرے کے آس پاس مارے ہیں۔ آپ کی حویلی میں ملنے والے سانپ ایک قسم کے ہیں یا کئی اقسام کے؟ یہ سوال کر کے میں پچھتایا تھا، کیونکہ مجھے اس سوال کا جواب معلوم تھا۔ لوگ صرف سانپ کو جانتے ہیں سانپ کی اقسام کو نہیں جانتے۔ اس لیے مجھے جواب بھی حسبِ توقع ملا۔

ڈھائی گھنٹے کی اڑان کے بعد ہمارا سفر مہاراجہ کی حویلی میں سورج ڈھلنے کے وقت اختتام پذیر ہوا تھا۔ حویلی کیا تھی ایک قلعہ تھا۔ نیچے اترنے پر چند نوکر ہاتھ جوڑے ہمارے منتظر تھے۔ مہاراج نے ان میں سے ایک نوکر سے کہا کہ وہ مجھے مہمان خانے لے جا کر ہاتھ منہ دھلوانے کے بعد کھانے کے لیے لے

آئے۔ باقی لوگ اشوک اور مہاراج کے پیچھے حویلی کی جانب چل پڑے جبکہ میں اپنے اردلی کی معیت میں جس نے میرا سوٹ کیس اٹھا رکھا تھا، حویلی کی دوسری سمت چل دیا۔ ہم ایک عالی شان برآمدے سے ہوتے ہوئے ایک بڑے ہال میں داخل ہوئے جس میں بڑے نفیس صوفے پڑے تھے۔ ہال کے اطراف کمرے تھے۔ کچھ کمرے کھلے تھے جن میں زندگی کے آثار وہاں پر موجود مہمانوں کا پتہ دیتے تھے۔ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر میرے اردلی نے میرا اسامان ایک سمت رکھ کر مجھے بتایا۔ مہاراج ٹھیک نو بجے رات کا کھانا تناول فرماتے ہیں۔ آپ اگر تیار ہو جائیں تو میں آپ کو نو بجنے سے پانچ منٹ پہلے آ کر لے جاؤں گا۔ پھر وہ میرا جواب سنے بغیر اپنے پیچھے کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے باہر نکلا۔ کمرے میں دروازے کے بالکل سامنے ایک بڑا سا گھڑیال آٹھ بجا رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا میرے پاس ابھی پچپن منٹ تھے۔ کمرے کے ایک طرف گاؤ تکیے سے آراستہ صوفے تھے اور دو کرسیاں ایک بڑی سی الماری جس میں ہر ناپ کے نائٹ گاؤن بڑے سلیقے سے ٹنگے تھے۔ کمرے کے درمیان ایک مسہری رکھی تھی۔ میں نے اپنا سوٹ کیس الماری میں رکھ کر اس میں سے اپنے لیے ایک کرتا پاجامہ نکال کر ایک وسیع غسل خانے میں داخل ہوا۔ غسل خانے کے ایک کونے میں چپل کا ایک جوڑا رکھا تھا۔ میں نے اپنے جوتے اتار کر چپل پہنے، غسل کیا اور غسل سے فارغ ہو کر کپڑے پہنے اور مسہری پر آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔

غسل نے سفر کی تھکان خاصی کم کر دی تھی اور مجھے کچھ وقت سوچنے کو ملا تو مجھے خیال ہوا کہ میں یہاں آ تو گیا ہوں لیکن اب اس کے بعد میری کیا ذمہ داری ہوگی؟ جس مسئلے کو اتنے سنت، منتری، جوگی، سپیرے اور شمان پچھلی آدھی صدی سے حل کرنے کی ناکام کوشش کر چکے ہیں، کیا میں اکیلے میں اسے حل کرنے کی قدرت رکھتا ہوں؟ مجھے کم از کم باپو کو اپنے ساتھ لانا چاہیے تھا اور کچھ نہیں تو کم از کم وہ میری رہنمائی ہی کرتے۔ ایک خیال آیا کہ واپس چلا جاؤں۔ انہی سوچوں میں گم تھا کہ میرے رہنما نے دروازے پر لگی ہوئی گھنٹی بجا کر اپنی آمد کے اعلان کے ساتھ مجھے چلنے درخواست کی۔ میں سوچوں میں گم آہستہ آہستہ اس کے پیچھے چلنے لگا۔ ایک لمبے برآمدے کو عبور کر کے میرے رہنما نے میرے لیے دروازہ کھول کر مجھے اندر جانے کو کہا جیسے اسے اس مقام سے آگے جانے کی آ گیا نہیں تھی۔ میں کمرے میں داخل ہوا تو میری آنکھوں کے سامنے کھانے کی ایک لمبی سی میز تھی جس کے گرد اگر زیادہ نہیں تو تقریباً پچاس کرسیاں بچھی تھیں۔ مجھے آتا دیکھ کر ایک باوردی ملازم نے ایک کونے والی کرسی پیچھے سرکائی۔ جیسے بتا رہا ہو کہ میرے بیٹھنے کے لیے یہ کرسی متعین کی گئی ہے اور جیسے اس میز پر تمام لوگوں کو حسب مراتب بٹھایا گیا ہو۔ مہاراج اور اشوک مجھے نظر نہیں آئے تھے۔ کرسی پر بیٹھ کر میں نے آس پاس نظریں دوڑائیں تو مجھے اندازہ ہوا کہ میرے بائیں ہاتھ والی اور میرے سامنے والی کرسیاں خالی پڑی تھیں۔ ایسے میں ہال کی دوسری جانب دروازہ کھلنے کے ساتھ اعلان ہوا کہ مہاراج امرناتھ اپنے پریوار کے ساتھ کھانے پر تشریف لا رہے ہیں۔ تمام لوگ اپنی اپنی کرسیوں سے کھڑے ہو گئے۔ مہاراج اپنے جلال میں ہاتھ ہلاتے ہوئے میرے قریب والے کونے کی نشست پر بیٹھے۔ اشوک میرے بائیں جانب والی خالی کرسی پر بیٹھ گیا اور اس نے مجھے آہستہ سے ہیلو کہا۔ اشوک کے سامنے زرق و برق لباس میں ملبوس درمیانی عمر اور میانہ قامت کی پتلی سی ایک خوبصورت خاتون جو رکھ رکھاؤ سے رانی لگ رہی تھیں آ کر بیٹھیں۔ میرے سامنے کی کرسی پر ایک تیکھے نقوش والی لڑکی بیٹھی تھی۔ مہاراج نے رانی کا تعارف کرواتے ہوئے کہا، یہ اشوک کی ماتا اور ہماری رانی پارو ہیں۔ اور اس کے بعد تیکھے نقوش والی لڑکی کا تعارف کرواتے ہوئے کہا، یہ ہماری لاڈلی راجکماری روپا ہے، دسویں جماعت میں پڑھتی ہے۔ پھر انہوں نے دونوں سے میرا تعارف اشوک کے دوست کے طور پر کراتے ہوئے بتایا کہ میں ایک سپیرا بھی ہوں۔

یہ مجھے نہ تو کہیں سے سپیرا لگتا ہے اور نہ ہی آشی بھیا کا دوست، راجکماری نے بڑی صاف گوئی سے میرے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے کہا۔ یہ تمہیں آشی کا دوست کیوں نہیں لگتا؟ رانی نے حیرت سے اپنی بیٹی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔ آشی بھیا کے دوست ایک تو بولتے بہت ہیں اور دوسرا یہ کبھی شریفانہ انداز میں بھی نہیں بیٹھتے۔ اور یہ سپیرا اس لیے نہیں لگتا کہ نہ اس کے پاس پٹاری اور نہ ہی بین۔ سپیرے صرف لنگی باندھتے ہیں اس نے کرتا پاجامہ پہنا ہے۔ سپیروں کے بال بے ترتیبی سے بکھرے ہوتے ہیں جبکہ اس نے اپنے بال سلیقے سے سنوارے ہوئے ہیں۔ سپیروں سے نہ نہانے کی وجہ سے ہمک آتی ہے جبکہ یہ نہا دھو کر یہاں بیٹھا ہے۔ روپا مجھ میں اور دوسرے سپیروں کے درمیان ابھی کچھ اور فرق بھی گنواتی اگر سب لوگ زور سے ہنس نہ پڑتے۔ مہاراج نے ہنستے ہوئے مجھے کہا، اس کی باتوں کا برا مت ماننا۔ ہماری روپا شریر ضرور ہے لیکن دل کی بری نہیں ہے۔ اشوک نے اس کا منہ چڑھاتے ہوئے کہا۔ تو خواہ مخواہ میرے دوستوں کو بدنام کرتی پھرتی ہو۔ مجھے بھائی بہن کے درمیان یہ نوک جھونک اچھی لگی۔

ایسے میں کھانا لایا جانے لگا۔ کھانے کا ڈونگا سب سے پہلے مہاراج کے سامنے آتا وہ ڈونگے میں جھانکتے اگر کچھ لینا چاہتے تو لیتے ورنہ اپنا سر ہلا کر انکار کر دیتے۔ اس کے بعد وہ ڈونگا رانی جی کے سامنے پیش ہوتا تو وہ بھی کچھ ایسا ہی کرتیں۔ اس کے بعد باقی لوگ لیتے۔ میں نے بھی اپنی سمجھ کے مطابق کچھ لیا۔ تمام لوگوں کے کھانا لینے کے بعد جب تک مہاراج نے پہلا لقمہ منہ میں نہیں ڈالا کسی نے کھانا کھانے کی جسارت نہیں کی۔ کھانے کے دوران کسی نے کوئی بات نہیں کی۔ مہاراج نے یونہی کھانے سے ہاتھ اٹھایا سب نے کھانا بند کر دیا۔ کھانے کے بعد نیم گرم پانی کی تشتریوں میں سب کے ہاتھ دھلوائے گئے اس کے بعد کٹے ہوئے پھل پیش کیے گئے۔

پھلوں کے بعد مہاراج کے اٹھتے ہی تمام لوگ کھڑے ہو گئے۔ مہاراج نے میرا ہاتھ پکڑ کر اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا۔ ہم لوگ اس طرف گئے جہاں سے مہاراج کھانے والے ہال میں آئے تھے۔ ہال سے نکل کر ہم ایک

بڑے برآمدے میں آ گئے۔ مہاراج نے مجھے ایک بڑے دروازے جس کے آگے ایک دربان کھڑا تھا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، یہ ہماری آرام گاہ ہے۔ ہمارے قریب پہنچنے پر دربان نے کمرے کا دروازہ کھولا۔ یہ ایک ہال نما کمرہ تھا جس کے عین وسط ایک بہت بڑی مسہری تھی۔ مسہری کے اطراف پردے تھے جن کے اوپر پھولوں کی جھالریں تھیں۔ مسہری کے چاروں کونوں پر بڑے بڑے گلدان رکھے تھے جن میں تازہ پھول سجائے گئے تھے۔ مہاراج کا غسل خانہ بھی مہمان خانے کے غسل خانوں سے کئی گنا بڑا تھا۔ کمرہ دکھانے کے بعد مہاراج نے کہا، تم اگر چاہو تو آج رات سے یہاں شب بسری کر سکتے ہو۔ یہاں رات گزارنے سے پہلے میں دھرم داس سے باتیں کرنا چاہتا ہوں اور ساری حویلی دیکھنا چاہتا ہوں، میں نے جواب دیا۔ مہاراج نے مجھے اجازت دیتے ہوئے کہا کل ناشتے کے بعد دھرم داس تمہارے ساتھ ہو جائے گا۔ میں واپس جانے کے لیے مڑا تو مہاراج نے اپنے دربان سے مجھے مہمان خانے تک چھوڑ آنے کو کہا۔ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مجھے معلوم ہوا کہ اشوک، رانی اور راجکماری ہمارے ساتھ اندر نہیں آئے تھے۔ مجھے اپنے کمرے میں چھوڑنے سے پہلے، دربان نے مجھے بتایا کہ مہاراج آٹھ بجے صبح ناشتے کی میز پر ہوتے ہیں اس لیے تیار رہوں، خادم مجھے لینے کے لئے آئے گا۔

اپنے کمرے میں کپڑے تبدیل کرنے کے بعد بستر پر لیٹ کر کالی کو بیگ سے نکال کر کچھ دیر تک اس سے باتیں کرتا رہا۔ اسے واپس بیگ میں رکھنے کے بعد کل کے بارے میں سوچنے لگا۔ ایک خیال مجھے بار بار تنگ کر رہا تھا کہ مجھے یہاں آنے کی جلدی نہیں کرنی چاہیے تھی۔ میں سوچ سوچ کو پچھتا رہا تھا کہ میں نے یہاں آنے کی حامی آخر کس بنیاد پر بھری تھی۔ اگر میں اپنی حد تسلیم کرتے ہوئے یہاں آنے سے انکار کر دیتا تو میرے لیے کتنا اچھا ہوتا۔ ایک انکار سو سکھ کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا کہ ان لوگوں کو معلوم ہو جاتا کہ میں ابھی ان جیسا معمولی سا انسان ہوں۔ دوسرا خیال گزرا کہ میں نے اپنے غیر معمولی ہونے کا اعلان بھی تو کبھی نہیں کیا اور نہ ہی میں نے اپنی حد سے بڑھ کر کوئی بڑ ماری تھی۔ پھر میں یہاں بلایا گیا ہوں۔ اگر میں کچھ نہ کر پایا تو صاف بول دوں گا کہ یہ سب کچھ میرے بس میں نہیں ہے، مجھے واپس گھر چھوڑ آؤ۔ ان تانے بانوں کے درمیان مجھے نیند آ گئی۔

دوسری صبح خادم نے مجھے ساڑھے سات بجے اٹھایا۔ منہ ہاتھ دھو کر شیو بنانے کے بعد جین کی پتلون پر آدھے بازوؤں والی شرٹ پہن کر خادم کے ساتھ ناشتا کرنے پہنچا تو راجکماری نے مجھے دیکھتے ہی گرہ لگائی، جین پہننے والا سپیرا میں نے اب سے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ رانی نے اسے ٹہوکا دے کر روکا۔ میں نظریں جھکائے بیٹھا رہا۔ اشوک نے مجھے اپنے ساتھ شکار کو جانے کے لیے کہا تو میں نے اسے بتایا کہ میں آج دھرم داس کے ساتھ حویلی دیکھوں گا۔ کھانے کی میز پر آج دس کے قریب لوگ تھے۔ ناشتے کے بعد مہاراج نے دھرم داس کو بلا کر میرے ساتھ رہنے کی تلقین کی۔ دھرم داس مہاراج کا ہم عمر تھا۔ مجھ سے جلد ہی گھل مل گیا۔ میں نے اسے کہا، اپنی یادداشت کے مطابق مجھے حویلی میں ہر اس کمرے میں لے جاؤ جہاں سانپ دیکھا گیا ہے۔ کہنے لگا سب سے زیادہ سانپ مہاراجہ کی آرام گاہ میں دیکھے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ تقریباً حویلی کے ہر کمرے میں اندر اور باہر دیکھے گئے ہیں۔ وہ سارا دن میں نے دھرم داس کے ساتھ بے مقصد حویلی کے چپے چپے میں پھرتے ہوئے گزارا۔ دھرم داس مجھے بڑی تفصیل سے اس حویلی کے باسیوں پر گزرے سانپ کاٹنے کے واقعات بتاتا رہا۔ رات کے کھانے کے بعد میں نے تھک ہار کر اپنے کمرے میں آ کر ایک بار پھر سوچا کہ میں نے اب تک نہ صرف اپنا بلکہ ان لوگوں کا وقت بھی ضائع کیا ہے۔ میں خواہ مخواہ ان لوگوں کو جھوٹی آس دلا رہا ہوں۔

آج رات مجھے مہاراج کی آرام گاہ میں سونا تھا۔ سوچا کہ کل صبح تڑکے مہاراج سے واپس جانے کی آ گیا لے کر صاف صاف کہہ دوں گا کہ یہ سب کچھ میری حدود سے بہت آگے کا ہے۔ رات کو دس بجے کے قریب خادم مجھے مہمان خانے سے مہاراج کی آرام گاہ میں لے گیا۔ خوابگاہ کے ایک صوفے پر بیٹھ کر میں ایک بار پھر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔ اگر میں ارون کے ساتھ کہیں بہار کی چھٹیاں گزارنے چلا جاتا یا امر کے ساتھ کہیں چلا جاتا تو کتنا اچھا رہتا۔ اگر کسی کے ساتھ نہ بھی جاتا تو کم از کم باپو کے پاس اپنے گھر رہتا۔ سوچوں کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ مجھے مسلسل پریشان کئے جا رہا تھا۔ نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ وقت ٹھہرا ہوا تھا اور رات تھی کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ کبھی اٹھ کر ٹہلنے لگتا تو کبھی ٹہلتے ٹہلتے تھک کر بیٹھ جاتا۔ تقریباً رات کے دو بجے کا عمل ہو گا جب میں نے کسی کے چیخنے کی آواز سنی۔ معلوم نہیں یہ میرا وہم تھا یا حقیقت۔ میں تجسس کے عالم میں آرام گاہ کے دروازے کی طرف بڑھا۔ جوں جوں میں دروازے کی طرف جا رہا تھا آواز تیز اور قریب آتی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔ میں دروازہ کھول کر نیم روشن برآمدے میں آیا۔ دروازہ کھولنے پر چیخوں کی آواز زیادہ واضح ہو گئی تھی۔ یہ نسوانی چیخیں ہال کے بائیں جانب سے آ رہی تھیں۔ میں نے آوازوں کی جانب گردن گھمائی تو مجھے دور سے ایک نسوانی ہیولہ چیختے ہوئے اپنی جانب بھاگتا ہوا نظر آیا۔ وہ ہیولہ ایسے بھاگ رہا تھا جیسے ہرن اپنے پیچھے آنے والے چیتے کے خوف سے بھاگ رہا ہوتا ہے۔ ہیولے کے پیچھے زمین پر ایک نہیں دو سانپ تیز رفتاری سے بھاگنے والی کا پیچھا کرتے ہوئے بھی مجھے نظر آئے۔ چیختا ہوا ہیولہ جونہی میرے قریب آیا تو میں نے بے ساختہ اپنی بانہیں پھیلا دیں۔ پھر وہ ہیولہ جیسے ہی میری بانہوں کے دائرے میں آیا، میں نے اسے اپنی دونوں بانہوں میں بھر کر فرش سے اوپر اٹھا لیا۔ اس کے پیچھے آنے والے سانپوں میں سے ایک کے دانت میری داہنی پنڈلی پر اور دوسرے کے دانت میرے بائیں ٹخنے میں گڑ چکے تھے۔ زندگی میں پہلی بار ایک نہیں دو سانپوں کے دانت میرے بدن میں پیوست ہو چکے تھے۔

# چند سیپیاں سمندروں سے

(سفرنامۂ ساؤتھ امریکہ)

پروین شیر (نیویارک)

قسط......۵

## دھاگوں سے بندھی ہوئی داستان

صبح اُٹھ کر پروین چہل قدمی کے لیے ہوٹل سے باہر نکل کر تنگ راستوں پر جا رہی تھی۔ پہاڑ کی ڈھلوانوں پر یہ راستے صرف پیدل ہی چلنے دیتے ہیں۔ یہاں صرف دو اہم سڑکیں ہیں۔ ایک سڑک پہاڑ کی اونچائی تک جاتی ہے جس کا نام Avenida Pachacutec ہے۔ دوسری سڑک کو سڑک نہیں کہا جا سکتا کیونکہ یہ ٹرین کی پٹریوں کے دونوں طرف کے فٹ پاتھ ہیں۔ جہاں قطاروں میں چھوٹی چھوٹی دوکانیں ہیں۔ مقامی صنعت کاروں کے فنّی نمونوں سے بھرپور۔ دیگر ضروریات کی اشیاء بھی۔ خاص کر سیاحوں کے لیے۔۔۔ اس تنگ راستے کا نام Avenida Imperio de los incas ہے۔ ٹرین کی پٹریوں کے دونوں طرف دور تک۔۔۔ میلوں تک پھیلی ہوئی دوکانوں میں الپاکا اور لاما کے فر سے بنی ہوئی اشیاء، آرٹ اور کرافٹ کے نمونے سجے ہوئے تھے۔ سیاح خریداری میں مصروف تھے۔ امریکن، کینیڈین، یوروپین۔۔۔ سبھی کو مول تول کرنے کا ہنر آ گیا تھا۔

پروین ریل کی پٹریوں کے ساتھ فٹ پاتھ پر چلتی جا رہی تھی۔ دوکانوں میں جا کر وہ ان مقامی فنکاروں کے فن کو دیکھنے میں محو تھی۔ ایک دوکان میں ایک عورت تھی جسے کچھ انگریزی بولنی آتی تھی۔ اس سے گفتگو ہونے لگی تو معلوم ہوا کہ انکا (Inca) تہذیب کے خاص کرافٹ کا نام Quero ہے۔ لکڑی کا بنا ہوا Tumbler جس پر ان کے سب خداؤں اور اہم جانوروں کی تصویریں پینٹ کی ہوئی تھیں۔ ہر طرف سجے ہوئے تھے پتھروں کے مجسمے۔ واٹر کلر اور Oil کی مصوری تھی۔ کپڑوں پر ان کی تہذیب کی کہانیاں بُنی ہوئی تھیں۔ ہر تانے بانے داستان سنا رہے تھے۔ شاید وہ اسی طرح دھاگوں سے کہانیاں بُن کر انہیں پڑھتے تھے۔ کپڑوں کے سب دھاگے ماضی کے قصے کہہ رہے تھے۔ اسکارف اور سویٹر پر ان کے بے حد اہم جانور الپاکا اور لاما کے نقش بنے ہوئے تھے۔ کیونکہ یہ دونوں جانور ان کے وفادار ساتھی ہیں۔ صدیوں سے جو ان کے مذہب کی ضرورت بھی ہیں اور اقتصادی بھی۔ یہ انہیں اون، گوشت اور اپنے چمڑے مہیا کرتے ہیں جس سے ان لوگوں کی بنیادی ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ ان دوکانوں میں (Pre Incas) انکاز سے قبل کی فنکاری اور صنعت کاری بھی بھرپور تھی۔ کپڑوں میں بُنی ہوئی داستان تھی۔۔۔ کہ کس طرح اسپین والوں نے "انکا" بادشاہ کو اغوا کیا تھا اور ان کے ہیرو کو قتل کر دیا تھا۔ ان کے عقیدے کے مطابق کچھ تصویریں ان کے ہیرو کی واپسی کی کہانیاں بھی کہہ رہی تھیں۔ یہ گرافکل زبان Q'ero کپڑوں میں بُنی ہوئی تھی۔ یہ فنکاری انکاز (Incas) اور انکاز سے قبل (Pre Incas) کی پوری تہذیب کی نمائندگی کر رہی تھی۔

## کائناتی زبان

پروین چلتی جا رہی تھی دور پہاڑوں پر جاتی ہوئی سڑک پر جس کے مقابل اور وبامباندی چھنگاڑتی ہوئی تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔ پہاڑوں کی گود میں کچھ فاصلوں پر قطاروں میں کیفے اور ریستوراں ہیں۔ جن میں سے ایک میں سب سیاحوں کو مقررہ وقت پر کیرولینا سے ملنا تھا۔۔۔ وہ مدہوشی میں چلتی جا رہی تھی۔ پہاڑ اور ندی کے ساتھ ساتھ۔ ہواؤں کے بھیگے آنچل اڑتے ہوئے آتے اور اس سے لپٹ لپٹ جاتے تھے۔ سورج نے اپنی زلفیں کھولی تھیں اور فضائیں سنہرے سیال میں غسل کر رہی تھیں۔ پرندے نغمہ سنج تھے۔ اس کے دل کا پرندہ بھی کہیں اڑ جانے کو پر تول رہا تھا۔ پھڑ پھڑاہٹ تیز دھڑکنیں بن گئی تھیں۔ قدرت کے ساتھ عجیب بندھن ہے اُس کا۔ سرور انگیز۔ نگاہوں کے پیالے میں قدرتی حسن کا شہد لبریز تھا۔

مقررہ وقت پر وہ کیرولینا کے بتائے ہوئے ریستوراں پہنچی تھی تو سب سیاح اس کے گروپ کے وہاں موجود تھے۔ طعام سے لطف اندوز ہونے میں مگن تھے۔۔۔ ریل کی پٹریاں درمیاں اور آمنے سامنے ریستوراں ہیں قطاروں میں۔۔۔ ٹریک کی دوسری طرف سامنے چار مقامی موسیقار اپنے ساز و آواز سے سیاحوں کا دل بہلا رہے تھے جو ان کی روزی کا ذریعہ تھا۔ وہ اپنی زبان کیچوا اور آئی مارا میں جو بھی گا رہے تھے پروین کی روح کی غذا تھی۔ اور وبامباندی کی نمی سے بھیگی ہوئی ہوائیں موسیقی سے بھی تر بتر تھیں۔۔۔ قطاروں میں رنگین پھولوں کے گملے سجے ہوئے تھے۔ ہوا خوشبو کی کلائی تھام کر کچھ جھجکتی ہوئی چل رہی تھی۔ وہ نغمے سنا رہے تھے اپنی انجانی زبان میں۔۔۔ نہ سمجھتے ہوئے بھی سب کچھ سمجھ میں آ رہا تھا۔ کیونکہ موسیقی کی زبان کائناتی ہوتی ہے۔ جسے روح سمجھتی ہے۔ یہ سرحدوں میں قید نہیں ہوتی۔۔۔

ان کے ساز کچھ تاروں کے تھے اور کچھ Wind کے۔ جیسے Flute، Trumpet وغیرہ۔ کیرولینا موسیقی سے پروین کا لگاؤ دیکھ کر بتانے لگی تھی کہ ان کے کچھ ساز ہرن اور کتوں کے سر سے بھی بنے ہوتے ہیں جو مذہبی رقص میں استعمال ہوتے ہیں۔ ان کی شاعری کا سب سے بہتر اظہار ان کی اساطیریات میں ہوتا ہے۔

ان فنکاروں کی CD بھی اُن کے قریب زمین پر رکھی ہوئی تھی جسے وہ فروخت کرنا چاہتے تھے۔ پروین نے انہیں اشاروں میں قریب بلایا تھا کہ CD خرید سکے۔ اُن میں سے ایک قریب آ کر انگلش میں باتیں کرنے لگا تھا۔ یہ خوش گوار حیرت کی بات تھی۔۔۔ دوسرے سیاح لذیذ کھانوں میں اور گفتگو میں مشغول

تھے۔ایک ہی نظران موسیقاروں پرڈال کراپنے آپ میں مصروف تھے۔ پروین کو CD فروخت کر کے وہ پھر سے اپنے نغموں سے فضاؤں کو مسحور کن بنا رہے تھے۔حسین سماں تھا۔سامنے اونچے پہاڑ نیلے آسمان کو تکتے ہوئے۔۔۔اور وبامبا ندی سے غسل کر کے آئی ہوئی بھیگی ہواؤں کی لہروں پر تیرتے ہوئے سریلے نغمے۔ وہ دوسروں کو دیکھ کر حیران تھی جو صرف اپنی خریداری کی باتوں میں مگن تھے۔حسین طلسمی فضاؤں سے بے نیاز تھے۔۔۔ وہ سوچ رہی تھی لوگ اس دنیا میں کتنے مختلف ہیں۔ چند ایسے ہیں جو اس دنیا کی بھیڑ میں تنہا تنہا چلتے ہیں۔ قافلوں سے الگ الگ۔۔۔ان سیاحوں کو اس جادو بھری فضا میں کھو جانے کی کوئی خواہش نہ تھی۔

کچھ دیر بعد یہ موسیقار اور گلوکار کچھ دور جا کر دوسرے سیاحوں کا دل بہلا رہے تھے۔ دور سے آتی ہوئی موسیقی کی مدھم آواز فضا کو کچھ اور زیادہ خواب ناک بنا رہی تھی۔

## ایک ہی رنگ

ٹور بس میں سب سیاح واپس ریلوے اسٹیشن کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔حسین Aguas Calientes دور ہوتا جا رہا تھا۔۔۔سولہ سو افراد کا چھوٹا سا، خوابوں جیسا خوبصورت شہر، جس نے اسے Intoxicated کر دیا تھا۔ سمندروں سے سات ہزار فٹ اوپر اور وبامبا ندی کا دوست۔۔۔ وہ سوچ رہی تھی ٹرین میں بیٹھی ہوئی کہ سات سو پچیس میٹر تک بہتی ہوئی اور وبامبا ندی یونہی بہتی رہے گی۔۔۔ جو صدیوں سے بہہ رہی تھی۔ تیز رفتاری سے بے چین۔۔۔ اگواس کلاینٹس شہر سے گزرتی ہوئی۔ پتھروں کے درمیان۔۔۔اس شہر کی شہ رگ ہے وہ۔۔۔

ریلوے اسٹیشن پر وہی گہما گہمی تھی وہی رنگ چہار سو بکھرے ہوئے تھے۔ وہی عورتیں بچے، مرد اپنے روایتی لباس میں اپنے ہنر سے زندگی کی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے کوشاں تھے۔ جیسے ہی کوئی ان کی طرف دیکھتا وہ پوری امید کے ساتھ اس وقت تک ساتھ نہیں چھوڑتے جب تک وہ نظروں سے اوجھل نہ ہو جاتا۔ اگر کسی ایک سے کسی نے خریداری کی تو چار پانچ بچے، عورتیں اور مرد اپنی رنگ برنگی مصنوعات کے ساتھ فوراً اس طرف آ جاتے تھے کہ شاید ان کی قسمت کا ستارہ بھی چمک جائے۔ لیکن ایسا کم ہو رہا تھا۔ جب تک ٹرین چل نہیں دی تھی وہ لوگ آس لگائے کھڑے ہوئے تھے۔ جب ٹرین رینگنے لگی تھی تو ان کے مایوس چہروں نے پروین کو اُداس کر دیا تھا۔ پہلے اُمید کی کرنوں سے چمکتی آنکھیں۔۔۔ پھر مایوسی، ہار اور تھکن سے چور بجھی ہوئی آنکھیں چاروں طرف نظر آ رہی تھیں۔۔۔ یہی تو زندگی ہے۔ ہر محل ایک دن کھنڈر تو بنتا ہی ہے۔ ٹرین کی کھڑکی سے وہ ان کی طرف اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک دیکھ سکتی تھی۔ سوچ رہی تھی۔۔۔ ٹرین پُر پیچ پہاڑی راستوں پر دوڑ رہی تھی اور اس کے ذہن میں کئی پُر پیچ سوالات کی گرہیں تھیں جو کھل نہیں پا رہی تھیں۔ پرانی گرہوں کے ساتھ نئی نئی گرہیں پیدا ہوئی جا رہی تھیں۔

اسی ادھیڑ بُن میں ٹرین واپس کوسکو آ گئی تھی۔ ٹور بس سیاحوں کو واپس ہوٹل Taypikala لے جا رہی تھی۔ دل میں احساسات کی لہریں دماغ کے ساحل سے ٹکرا رہی تھیں۔۔۔ سوالات برقرار تھے۔۔۔ان کی گانٹھیں کھولنے کی کوشش میں ذہن کے بچے کے نازک ناخن ٹوٹ چکے تھے۔

## اسرار و طلسمات

سورج کی زریں کرنوں نے اپنے پروں کو پھیلا دیا تھا۔ ٹور بس سیاحوں کو Incas کے تاریخ اور روحانی مرکز۔۔۔ Lost City (کھویا ہوا شہر) Machu Picchu (ماچوپیچو) لے جا رہی تھی۔ پہاڑوں اور جنگلوں میں چھپا ہوا شہر جو سمندری سطح سے دو ہزار چار سو بتیس میٹر اوپر، دنیا سے دور بسا ہوا تھا جسے دنیا سے کوئی مطلب نہ تھا نہ کوئی رشتہ تھا۔ اپنے آپ میں ایک الگ سیارہ تھا۔۔۔اونچے کوہساروں کی گود میں ماچوپیچو دنیا کے عجائب میں شامل ہے۔ یہ انکا (Inca) تہذیب کے کھنڈرات میں سب سے اہم اور سب سے کم مشہور ہے جو صوبہ اور وبامبا میں ہے۔ یہاں نومبر سے مارچ تک برسات کا موسم ہوتا ہے۔ اس لیے سب سیاحوں کو پوری تیاری سے آنا ہوتا ہے یہاں۔۔۔ قسمت سے اُس دن سنہری دھوپ کی چادر اوڑھے ہوئے ماچوپیچو چمک رہا تھا۔

ہریالی کچھ اور خوش رنگ نظر آ رہی تھی۔ گرچہ کوسکو سے ماچوپیچو بہتر میل دور ہے لیکن پروین اور دیگر سیاحوں کو تھکن کا کوئی احساس نہ تھا دنیا کے اس عجوبے کو دیکھنے کے اشتیاق میں۔ یہ ماچوپیچو کی جادوگری تھی جس کی وجہ سے بس ہشاش بشاش تھے۔ موسم بے حد خوشگوار تھا۔ کیرولینا کا کہنا تھا کہ یہاں کا موسم ہمیشہ ایک جیسا رہتا ہے۔ اکیس ڈگری سینٹی گریڈ جس طرح عورتوں کا موڈ۔۔۔ کیرولینا اپنی پُر مذاق شخصیت کی وجہ سے ہر دل عزیز تھی۔ اس کے علاوہ بہت مددگار اور ہمدرد بھی تھی جو اُس کی ڈیوٹی میں شامل نہ تھا۔ وہ بھی بخوشی کرتی تھی۔ پروین نے جتنے پوسٹ کارڈس دوستوں کو لکھے تھے کیرولینا نے اُنہیں پوسٹ کیا تھا۔

ماچوپیچو کے اطراف سر بلند پہاڑ اس شہر کے مضبوط پہریدار تھے۔ یہاں کیرولینا کے علاوہ ماچوپیچو کا خاص گائڈ بھی ساتھ تھا۔ جو رہبری کر رہا تھا اور کومنٹری بھی کرتا جا رہا تھا۔ کچھ الجھے میں انگریزی بول رہا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا ''یہاں کے پتھریلے کھنڈرات، اونچے پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر بنے ہوئے سینکڑوں چبوترے (Terraces)۔۔۔ جنت نظیر وادی میں دور تک نیچے بہت، بل کھاتی ہوئی اور وبامبا ندی ماچوپیچو کی یہ Mysticism ہی ملک پیرو کی نشانیاں ہیں اور شہ رگ ہے یہی انفرادیت۔'' گائڈ سیاحوں کو خبردار کر رہا تھا کہ اب بہت بڑے چیلنج کا سامنا کرنا تھا انہیں۔ ناہموار اونچی پتھریلی سیڑھیوں کو سر کر کے بارہ سو فٹ اوپر سانس لیتے ہوئے ماضی کو دیکھنے جانا تھا۔ کون اوپر جائے گا اور کون اس کی ہمت نہیں رکھتا یہ فیصلہ سبھی کو خود ہی کرنا تھا۔ سب سیڑھیوں کو طے کرنے میں ایک گھنٹہ لگتا تھا۔ کچھ عمر رسیدہ سیاح نیچے ہی رک گئے تھے کہ وہ زندگی کی بہت کٹھن سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے پہلے ہی نڈھال ہو چکے تھے۔ اور یہ تو جوان عمروں کے

لیے بھی ایک چیلنج تھا۔ پیچ در پیچ پہاڑی راستوں اور بہت اونچی سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے حسین نظاروں میں نظریں بھی کھو رہی تھیں اور سانسیں بھی۔ قدرت کے بھرپور حسن میں لطف بھی آ رہا تھا اور خطرناک راستوں سے خوف بھی۔ تھکن اور سرور دونوں ہم آہنگ تھے۔ جب سیڑھی بہت زیادہ اونچی ملتی تھی تو کیرولینا ہاتھ تھام کر مدد کرتی تھی۔ زندگی کی طرح کٹھن سیڑھیوں کو طے کر کے آخر۔۔۔ جیسے ہی سیاحوں نے بارہ سوفٹ اوپر قدم رکھے گائڈ نے مبارک باد دی تھی۔۔۔ اس کارنامے کے لیے۔۔۔ سخت امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے۔۔۔ تھکے ہوئے سیاحوں کو گائڈ نے کچھ وقفہ دم لینے کو دیا تھا۔

حسین مناظر کی بانہوں نے اسے گھیر لیا تھا۔ دل کے کسی گوشے میں جمی ہوئی برف پگھلنے لگی تھی۔

**بادلوں سے آگے**

ماچوپیچو کو لفظوں میں بیان کرنا مشکل ہے۔۔۔ وہ سمندری سطح سے آٹھ ہزار فٹ اوپر کھڑی ہوئی ایک انوکھے ماضی کو دیکھ رہی تھی۔۔۔ کچھ بادل نیچے چھوٹ گئے تھے کچھ پہاڑوں سے لپٹے ہوئے تھے دنیا سے الگ یہ دنیا۔۔۔ اپنی منفرد پہچان کے ساتھ اپنے شاندار ماضی کو فخر سے تھامے ہوئے کھڑی تھی۔۔۔ اور روبامباوادی کے اوپر۔۔۔ پہاڑوں کے جنگلوں میں چھپی ہوئی۔

گائڈ اور کیرولینا کے پیچھے پیچھے سب سیاح چل رہے تھے وہ کہہ رہا تھا۔۔۔ "ان پہاڑوں کی وجہ سے ماچوپیچو دشمنوں سے محفوظ تھا۔ دورانِ جنگ قدرت نے انہیں یہ حفاظت عطا کی تھی۔" پہاڑوں کی ڈھلوانوں پر کاشت کاری کے لیے چوڑے چبوترے (Terraces) بنائے گئے تھے کہ ہموار زمین پر پانی ٹھہر سکے اور مٹی کا Erosion رک سکے۔ اِنکا (Inca) تہذیب کی سب سے حیرت انگیز نشانی یہی شہر ماچوپیچو ہے۔ دنیا سے الگ زندگی گزارنے کی ساری ضروریات یہاں موجود تھیں۔ یہ ایک Secret City تھا۔ یہاں ایک سو پچاس مکانات، عبادت گاہیں، محل اور پارک بنائے گئے تھے۔ ان کھنڈرات کو دیکھ کر وہ سوچ رہی تھی کہ اس ماضی کا راستہ کس قدر لمبا ہے۔ یہ زمین نہیں بلکہ آسمان کا شہر تھا۔ بادلوں سے آگے۔ دو بہت بلند پہاڑوں کے درمیان جن کے نام Machu Picchu اور Huayna Picchu ہیں۔ اس پراسرار شہر کو 1438 سے 1532 تک اِنکاز نے بسایا تھا۔ سلطنت قائم کی تھی۔

گائڈ نے ہدایت کی تھی کہ یہاں کہیں کوڑا پھینکنے یا سگریٹ پینے کی اجازت نہیں تھی۔ ماچوپیچو جانے کے لیے یہ سب قانون تھے۔ اسی لیے وہ بالکل صاف اور بے داغ ہے۔ دیواروں پر کچھ لکھنا منع ہے۔ اکثر دوسرے ممالک میں پروین نے سیاحت کے مقامات پر بطور یادگار تحریریں چاک سے لکھی ہوئی دیکھی تھیں۔ ٹور سے پہلے گائڈ نے سیاحوں کو ایک گوشے میں پتھروں پر بٹھا دیا تھا اور ماچوپیچو کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔

**پہاڑوں کے جنگل میں**

گائڈ کہہ رہا تھا۔۔۔ "ماچوپیچو دنیا سے الگ پہاڑوں میں چھپا ہوا تھا۔ اس کے وجود کا کسی کو علم نہ تھا۔ ایک امریکی تاریخ دان نے جس کا نام Hiram Bingham تھا۔ 24 جولائی 1911 کو اسے ڈھونڈ نکالا تھا۔ وہ بھی اتفاقاً۔۔۔ دراصل بنگھم یہاں Andean تہذیب کی معلومات کے لیے آیا تھا۔ ہیرم بنگھم Yale یونیورسٹی میں تواریخ کا پروفیسر تھا۔ جو 1875 میں پیدا ہوا تھا اور 1956 میں اس کی وفات ہوئی تھی۔ ہیرم بنگھم نے ماچوپیچو کو جنگلوں اور جھاڑیوں میں چھپا ہوا پایا تھا۔ بہت مشکلوں سے راستہ بنایا گیا تھا انہیں کاٹ کر یہاں آنے کے لیے۔ بنگھم کی ملاقات اورو بامباندی کے قریب ایک کاشت کار سے ہوئی تھی جس کا نام Melchor Arteage تھا۔ اسی نے بنگھم کو پہاڑ کے اوپر کھنڈر کے متعلق بتایا تھا۔ بنگھم نے اس شخص کو ایک Sole کا انعام دیا تھا۔ جب بنگھم پہاڑ کے اوپر پہنچا تو وہاں دو کاشت کار خاندان رہ رہے تھے۔ یہ لوگ پہاڑوں کی ڈھلوان پر بنے ہوئے چبوتروں (Terraces) پر اناج اُگا کر زندگی گزار رہے تھے۔ انہوں نے ایک دس سال کے بچے کو جو پیچھوا تھا اور جس کا نام Pabilto Alvarez تھا بنگھم کا گائڈ بنا کر مدد کی تھی۔ یہ لڑکا بنگھم کو ماچوپیچو لے گیا۔ 1438 میں انکاز کی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ چکی تھی۔ لیکن آج تک کسی کو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ 1572 میں ماچوپیچو کو کیوں ویران کر دیا گیا تھا۔ یہ شہر پہاڑوں پر اتنا چھپا ہوا تھا کہ اسپین نے جب پیرو پر حملہ کیا تھا تو وہ دکھائی نہیں دیا تھا۔ اور اس طرح محفوظ رہ گیا تھا۔ کہا جاتا ہے ماچوپیچو مجرموں کا قید خانہ تھا۔۔۔ بنگھم نے جب ان کھنڈرات کو ڈھونڈ نکالا تھا تو ماچوپیچو سے اس کا نام بدل کر انکاز کا بھولا ہوا شہر Lost City of Incas رکھ دیا تھا۔ بنگھم نے اپنی کتاب کا نام بھی یہی رکھا تھا۔ انکا سلطنت کے نویں بادشاہ نے جس کا نام Pachacuti تھا (پاچا کوٹی) ماچوپیچو میں سلطنت قائم کی تھی۔۔۔ آسمان سے قریب اس شہر میں جب بادشاہ آتا تھا کوسکو سے تو راستے کو پاک کیا جاتا تھا۔ پھول بکھیرے جاتے تھے۔ موسیقی کے ساتھ۔۔۔ پاچا کوٹی کے معنی Transformer of the earth ہے۔ یہاں دس ملین لوگوں کے ساتھ یہ سلطنت قائم تھی۔ بادشاہ سردیوں میں یہاں رہنے آیا کرتا تھا اور تین ماہ رہا کرتا تھا۔ لوگ اس بادشاہ کو سورج کا بیٹا کہتے تھے۔ اسپین سے فران سسکو پیزارو نے 1531 میں اسے فتح کر لیا تھا لیکن انہوں نے کبھی اور کہیں بھی ماچوپیچو کا ذکر نہیں کیا تھا کیونکہ وہ ان کی نظروں سے بچ کر محفوظ تھا۔ یہاں کے کیچوا کسان ماچوپیچو کو صدیوں سے جانتے تھے۔ یہ ایسا پراسرار شہر تھا کہ آج تک اس کے متعلق کئی سوالوں کے جوابات نہیں مل سکے۔ انکاز نے پورا شہر پتھروں سے بنایا تھا۔ جس کی مضبوط دیواریں اسی طرح صدیوں سے قائم ہیں۔ انہوں نے اپنی مملکت 1400 میں قائم کی تھی جو ایک صدی ہی میں ختم ہو گئی تھی۔ اسپین کے ساتھ جنگ کے بعد جو 1530 میں شروع ہوئی تھی۔"

سب سیاح بچوں کی طرح بیٹھے ہوئے گائڈ سے انکاز اور ماچوپیچو کی

سچی کہانیاں سن رہے تھے ۔ درمیان میں سوال بھی کرتے جاتے تھے۔ جس کا جواب وہ تفصیل سے دیتا تھا۔ اب سیاحوں کی تھکن بھی دور ہوگئی تھی۔ سب تازہ دم ہوکر موسم اور گائڈ کی باتوں سے لطف لے رہے تھے۔۔۔اور وہ کہہ رہا تھا۔۔۔ ''انکاز پوری طرح خود مکتفی تھے۔ ڈھلوانوں پر چبوترے بنا کر اناج اگاتے تھے اور چشمے سے پانی حاصل کرتے تھے۔ زمین سے الگ پہاڑوں پر۔۔۔ بادلوں سے آگے یہ چھوٹا سا شہر تھا جہاں کوئی ہموار زمین نہ تھی۔ اس کی آبادی صرف ایک ہزار تھی۔ اس شہر کو صرف انسانی ہاتھوں نے بنایا تھا۔ بغیر کسی مشین اور کسی اوزار کی مدد سے۔''

پروین نے سوال کیا تھا کہ آخر اتنے وزنی پتھر وہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کس طرح لے جاتے تھے گائڈ کا جواب تھا کہ موٹی رسیوں سے باندھ کر۔۔۔سینکڑوں لوگ مل کر یہ کام کرتے تھے۔ پتھر سے ہی پتھر کو تراشتے تھے اور مختلف شکلوں میں ڈھالتے تھے۔ سیمنٹ کے بغیر دیواریں بنائی گئیں تھیں پتھروں کو فٹ کر کے۔ اس طرح کہ درمیان میں ایک سوئی بھی نہیں جاسکتی تھی۔ ایک عقیدہ یہ بھی ہے کہ اتنا پراسرار شہر یقیناً کسی خلائی مخلوق نے آ کر تعمیر کیا ہوگا۔ انسانوں کے بس کی بات نہ تھی۔ انکاز کے انجینئر بلا کے ذہین تھے جس کا ثبوت ان کھنڈرات کی مضبوط دیواریں ہیں۔ کوئی نہیں جان سکا کہ ماچوپیچو اتنی مشکل سے، اتنے تنہا مقام پر، پہاڑوں کے جنگلوں میں بغیر کسی اوزار اور کسی مورتار کے کیسے اور کیوں بنایا گیا تھا؟ اور پھر ویران کیوں کر دیا گیا تھا؟

انکاز کی حکومت 11 ویں صدی میں شروع ہوئی تھی۔ سوسال برقرار رہی تھی کیونکہ بیماری اور جنگ نے اسے کمزور کر دیا تھا۔ اس کا عروج 1438 سے 1533 تک رہا تھا۔ ان کی سرکاری زبان اس وقت کیچوا تھی۔۔۔ کیچوا زبان میں انکا (Inca) کے معنی حکومت کرنے والا یا مالک کے ہیں اور کوسکو کے معنی کائنات کی ناف کے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے اساطیر اور فلکیات ہم آہنگ تھے۔ ان کے حساب اور کیلنڈر بھی فلکیات سے جُڑے تھے۔ سورج کی حرکت سے وقت کا اندازہ لگاتے تھے اور تحریر کی جگہ تصویر تھی۔ لیما شہر کے لارکو میوزیم میں Ceramics پر کندہ تصویروں کے الفاظ پروین نے سنے تھے۔ نمبر یاد رکھنے کو وہ ڈوری میں گرہیں لگاتے تھے۔ پیرو کا مشہور اور کارآمد پورا ''کوکا'' انہوں ہی نے تلاش کیا تھا۔ جب اسپینی یہاں آئے تھے تو اس پورے کا انہوں نے بھی استعمال کیا تھا۔ اور انکاز کو غلام بنالیا تھا۔ ''کوکا'' کے پتوں کو چبانے سے بھوک کم لگتی تھی اور طاقت زیادہ ہوتی تھی تاکہ کم کھائیں اور زیادہ کام کر سکیں۔۔۔ دوران جنگ انکاز ڈھول اور ٹرمپٹ بجایا کرتے تھے۔ سر پر لکڑی اور جانوروں کے چمڑے کا ہیلمٹ پروں کے ساتھ پہنتے تھے۔ گول یا چوکور شیلڈ اور کانسے کے بنے ہوئے تیر استعمال کرتے تھے۔۔۔ ماچوپیچو اتنی اونچائی پر اس لیے بھی بنایا گیا تھا کیونکہ یہ ان لوگوں کا مذہبی مقدس مرکز تھا اور بلندی پر خدا سے قریب تھا۔

- بقیہ -

## سرخ لباس

رقص ختم ہونے کے بعد ریمنڈ مجھے گھر چھوڑنے کے لئے میرے ساتھ ہولیا، ہلکی ہلکی برف پڑ رہی تھی اور میرے بالوں پر اسکے ذرات گر کر پانی کے قطرے بن رہے تھے۔ زمین پر پڑی تازہ تازہ برف کی وجہ سے ماحول پر ایک جادوئی چمک تھی۔ ریمنڈ گزشتہ رات ہاکی کے میچ پر پرجوش تبصرہ کر رہا تھا، مجھے اس کھیل کے بارے میں زیادہ معلومات نہیں تھیں مگر وہ اسکا خیال کئے بغیر جوش سے بولتا جارہا تھا میں بس ''ہاں۔۔۔ہم۔۔۔اوہ۔۔'' کہتی جارہی تھی۔ وہ اچانک رک کر بولا مجھے معلوم نہیں تھا تم اتنی دور رہتی ہو۔ سخت سردی اور یخ ہوا کی وجہ سے میری ناک سرخ تھی اور اس سے پانی بہہ رہا تھا۔ میں نے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈالا کہ کلینکس تلاش کروں۔ ایک مڑا تڑا پرانا کیلنکس میرے ہاتھ میں آ گیا میں نے اسے باہر نکالا۔ ریمنڈ کی ناک بھی سڑ سڑ کر رہی تھی میں نے کہا، ریمنڈ میرے پاس یہی ایک نپکن ہے جو شاید صاف بھی نہیں اس پر تھوڑی سی سیاہی بھی لگی ہے مگر میں اس کو پھاڑ کر آدھا تمہیں دے سکتی ہوں اگر تمہیں برا نہ لگے۔ اس نے سڑ سراتے ہوئے کہا ''اوہ یہ تو بہت اچھا ہوگا مجھے اسکی ضرورت بھی ہے'' میرے گھر کے چھوٹے سے پھاٹک پر اس نے کہا ''شب بخیر'' میں نے بھی کہا ''شب بخیر'' اور پھر یکایک اس نے تھوڑا سا میری طرف جھک کر بہت آہستہ، بہت نرمی سے میرے ہونٹوں کے کناروں پر بوسہ دیا، پلٹا اور اپنے گھر چل دیا۔ میں پچھلے دروازے سے گھر میں داخل ہوئی میرے لئے یہ تصور ایک انجانی مسرت اور توانائی کا باعث تھا کہ آج کی شام میں نے ایک لڑکے کے ساتھ رقص کیا جس نے خود مجھ سے اس رقص کی فرمائش کی تھی، وہ مجھے چھوڑنے گھر تک آیا اور اس نے مجھے شب بخیر کہتے ہوئے ''کِس'' کیا ہے۔ اور یہ سب ایک خواب یا خیالی سراب نہیں حقیقت ہے۔ میری ماں اپنے پرانے، بدرنگ گاؤن میں باورچی خانے میں چھوٹی سی میز پر بیٹھی میرے انتظار میں چائے پی رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھا، اس کی آنکھوں میں سوال تھا، وہ شام کی تمام روداد سننا چاہتی تھی مگر میں۔۔۔ میں مسکراتی ہوئی اپنی خواب کی جانب سیڑھیاں چڑھ گئی۔

# ''حرفِ سخن''

## کرامت بخاری

(لاہور)

جو آنے والے زمانے میں جا نہیں سکتا
میں ایسا حرفِ سخن میں سجا نہیں سکتا

جو میرے عہد کے قصے سُنا نہیں سکتا
میں ایسا شعر زباں پر بھی لا نہیں سکتا

تمام عمر محبت کا بیج بویا ہے
اب اس زمین سے نفرت اُگا نہیں سکتا

حریمِ دِل میں کچھ ایسے چراغ جلتے ہیں
بجھانا چاہے زمانہ بجھا نہیں سکتا

غمِ حیات غمِ عاقبت غمِ فرقت
میں اس سے بڑھ کے کمائی کما نہیں سکتا

یہ معجزہ ہے کرامت ہے یا کہ ہے الہام
یہ رازِ رازِ نہاں ہے بتا نہیں سکتا

## رؤف خیر

(حیدرآباد، دکن)

پڑھتا ہے شعر باسی وہ یوں لہک لہک کے
ترکاری جیسے بیچے پانی چھڑک چھڑک کے

نفرت میں ڈھل گئے ہیں شعلے بھڑک بھڑک کے
پُتلے جلا رہے ہیں بونے اچک اچک کے

تشنہ لبی ہماری ٹھوکر پہ مارتی ہے
ہوتے ہیں پانی پانی ساغر چھلک چھلک کے

تنخواہ سے بھی دُگنا ملنے لگا وظیفہ
کرتے ہیں بیوی بچے خدمت لپک لپک کے

کرنے لگے ہیں بزدل ہم پر ڈرون حملے
شب خون مارتے ہیں یا پھر دبک دبک کے

انعام واپسی سے شہرت تو مل گئی ہے
دامن وہ بھر رہے ہیں دامن جھٹک جھٹک کے

وہ جانتے نہیں ہیں میرا پتا ٹھکانا
مجھ سے ہی پوچھتے ہیں وہ بھی جھجک جھجک کے

مجبور ہو گئے ہیں وہ خیر ماننے پر
رستے پہ آ گئے ہیں آخر بھٹک بھٹک کے

حق گوئی خیرؔ اپنی کھلنے لگی ہے جن کو
آنکھیں نہیں ملاتے ہم سے بدک بدک کے

## شگفتہ نازلی

(لاہور)

بات کرنے کی یہ بھی صورت ہے
پُوچھ لیں! کیا کوئی ضرورت ہے؟

دیپ الفت کے ہم جلاتے چلیں
کس قدر باہمی کدُورت ہے

بے خبر رہنا کچھ کمال نہیں
باخبر رہنے کی ضرورت ہے

ساتھ چلنے کی آپ کو دعوت
غیر معمولی سی مہورت ہے

حُسن فطرت ہے پھیلا چاروں سُو
زندگی کتنی خوب صورت ہے

کیا کریں ذکر، اُس کے کیا کہنے
مورتوں میں وہ ایک مورت ہے

خود کو بھی داوٗ پہ لگا دیکھیں
اَب تو بس صرف یہی صورت ہے!

○

## عرش صہبائی

(جموں، کشمیر)

جب کسی بات کا ارادہ کر — اس پہ فکر و عمل زیادہ کر
اس میں رہنے دے کچھ خلوص ووفا — زندگی کو نہ بے لبادہ کر
کیا کہوں کسقدر ہوں تشنہ لب — ایسے میں اہتمام ِ بادہ کر
خود بخود ہوگا حوصلہ پیدا — اپنے دل میں فقط ارادہ کر
راحتوں کا مقام اپنی جگہ — رنج وغم سے بھی استفادہ کر
مجھ کو رسوا کریں گے مکروفریب — یہ عمارت نہ ایستادہ کر
حال وماضی بھی ذہن ودل میں رہیں — فکرِ فردا مگر زیادہ کر
وہ نوازے گا ہر کرم سے تجھے — دل کا دامن ذرا کشادہ کر
عرشؔ یہ پرسکون گزرے گی — زندگی کو کچھ اور سادہ کر

○

## عارف شفیق

(کراچی)

تیری باتوں سے لگ رہا ہے مجھے — آج تو نے بھی کھو دیا ہے مجھے
یہ جو لفظوں میں ہے مرے تاثیر — ایک درویش کی دعا ہے مجھے
صبر مسلک بنا لیا میں نے — کب کسی سے کوئی گلہ ہے مجھے
میرے اندر کا گہرا سناٹا — کب سے آواز دے رہا ہے مجھے
میں تو پھولوں کے خواب لایا تھا — تو نے پتھر بنا دیا ہے مجھے
مجھ میں آباد ہے جو ویرانی — اک خزاں نے ہرا کیا ہے مجھے
دل میں اترا تھا کوئی آنکھوں سے — یاد اب تک وہ رتجگا ہے مجھے
شاعری کیا ہے عمر بھر کا روگ — روگ کیسا یہ لگ گیا ہے مجھے
میں کیوں عارف اداس پھرتا ہوں — کوئی پوچھے تو کیا ہوا ہے مجھے

○

## تصوراقبال

(اٹک)

دوستی کا دم بھرا تھا راستے میں یوں ہُوا — کچھ نہیں بگڑا ہمارا دوستی کا خُوں ہُوا
پُر خطر صحراؤں کی ویرانیاں اپنی جگہ — اب تو شہروں میں بھی خطرہ پہلے سے افزوں ہُوا
صبح کا سورج جو نکلے گا تو دیکھا جائے گا — رات کا پچھلا پہر میرے لیے افسوں ہُوا
میری ہر تدبیر آخر رائیگاں ایسے ہوئی — چار دن گزرے ہی تھے کہ دردجُوں کا تُوں ہُوا
آسماں کا سرد سناٹا بنا اُس کا گواہ — اک حوا کا رات کے پچھلے پہر جب خُوں ہُوا
مرگیا آخر تصور موت سے کس کا مفر — ''خاک سے پیدا ہوا اور خاک میں مدفوں ہُوا''

○

## اسد عباس خان

(جھنگ)

شور وغُل ہے بہت اس طرف لاتخف — خود ہی میں تیر ہوں خود ہدف لاتخف
نوحہ کرتے ہوئے اور بکھرتے ہوئے — اپنا ماتم کیا صف بہ صف لاتخف
عشق نادِ علیؑ، عشق یادِ علیؑ — میں ہوں بندۂ شاہِ نجف، لاتخف
ہر طرف میں ہی میں ہر طرف تو ہی تو — مجھ میں، مَیں، تُو، کا ہے بس شغف لاتخف
عقلِ بیدار میں عشق بیدار ہے — مجھ کو میں نے دیا یہ شرف لاتخف
اک صدائے دروں میں کہوں عشق ہوں — عشق ہوں اور شعلہ بکف لاتخف
میں ہوں سرحد مجھے قتل کردو اسدؔ — وِرد کرتے ہوئے لاتخف، لاتخف

○

## دُرانجم عارف

(لاہور)

در حقیقت مرا احوال نظر کیا ہوگا — عمر بھر ساتھ میں چلنے کا اثر کیا ہوگا
چند یادیں کہیں احوالِ دلِ زار کی بات — اس سے بڑھ کے میرا اسباب سفر کیا ہوگا
صبح سے شام تلک وقت کی مدت ہی سہی — اس میں لیکن کوئی اوصاف ہنر کیا ہوگا
بے سبب یوں بھی کوئی بات بنانا مشکل — ہاتھ خالی ہوں تو امکانِ گہر کیا ہوگا
ایک رشتہ ہے محبت کا شمن زاروں سے — باغ ہی سارا ہو ویراں تو ثمر کیا ہوگا
کتنا مشکل ہے کہ ہر دل میں رہے عہدِ وفا — جذبۂ دل ہی نہیں حسنِ نظر کیا ہوگا
ساتھ چلتے ہوئے اک عمر گذر جائے مگر — راستے خود ہوں گریزاں تو سفر کیا ہوگا
کوئی آواز کوئی جنبش احساس نہیں — اک محبت ہی نہ ہو جس میں وہ گھر کیا ہوگا

○

## شکیل جمال

(بجنور، یوپی)

اُسی دنیا کے اُسی دور کے ہیں — ہم تو دلّی میں بھی بجنور کے ہیں
آپ انعام کسی اور کو دیں — ہم نمک خوار کسی اور کے ہیں
سرسری طور سے مت لو ہم کو — ہم ذرا فکر ذرا غور کے ہیں
کچھ طریقے بھی پرانے ہیں مرے — کچھ مسائل بھی نئے دور کے ہیں
کوئی اُمید نہ رکھنا ہم سے — اب تو ہم یوں بھی کسی اور کے ہیں

○

**شہزادنیّر** (کراچی)

تجھ کو گلا ہے تیرا مقدر نہیں ہوا — میں اپنے آپ کو بھی میسر نہیں ہوا
ہونا نہ ہونا میں نے رکھا اپنے ہاتھ میں — دم بھر جہاں میں ہوگیا، دم بھر نہیں ہوا
پہلے تو قیل وقال میں ہوتا نہیں تھا میں — پھر یوں ہوا کہ حرف سے باہر نہیں ہوا
سوچا کہ اپنے جسم سے باہر بھی ہو رہوں — میں اُٹھ کے خاک سے بھی ہوا، پر نہیں ہوا
آخر مجھے سراب نے سیراب کر دیا — میں جو سمندروں سے کبھی تر نہیں ہوا
ہوتا رہا وہی جو نہیں ہونا چاہیے — ہونا جو چاہیے تھا وہ اکثر نہیں ہوا
سب کو دکھائی دے گیا وہ حسنِ بے ظہور — سب پر یہ لطف ہوگیا، مجھ پر نہیں ہوا
غارت گری کو دیکھ کے اہلِ یقیں کی — میں دیکھتا ہوں اُس کو جو کافر نہیں ہوا
پہلی نظر کو اُس نے بھی دیکھا نہ غور سے — ہم سے بھی التفات مکرر نہیں ہوا
پتھر مزاج ہے تو میاں سنگِ میل بن — جو راستے میں ہو کے بھی ٹھوکر نہیں ہوا
آہستہ رَو وہ آج بھی اپنی روش پہ ہے — سب یار تیز ہو گئے، نیّر نہیں ہوا

**نویدسروش** (میرپورخاص)

لگی ہوئی گھروں پہ ہیں جو تختیاں عجیب سی — اسی سبب دلوں میں ہیں یہ تلخیاں عجیب سی
خلوص و مہر کے سبھی دیے بجھا رہی ہیں اب — چلی ہیں نفرتوں کی جو یہ آندھیاں عجیب سی
گھروں کے ساتھ ساتھ ہی دماغ و دل اُجڑ گئے — ہیں آنسوؤں کے ساتھ ساتھ سسکیاں عجیب سی
چمن تو ہر طرح سے اب خزاں کی دسترس میں ہے — گلوں کی جستجو میں ہیں یہ تتلیاں عجیب سی
بنے ہوئے ہیں سرتاپا غم و الم کی داستاں — ہمارے زندہ لوگوں کی ہیں بستیاں عجیب سی
جو قامتیں بلند ہیں مگر ہیں پست نیتیں — گناہ بھی عجیب سے ہیں، نیکیاں عجیب سی
بھلائے بھولتا نہیں میں اُن کی دل کشی سروشؔ — ملوں میں کام کرتی ہیں جو لڑکیاں عجیب سی

**دیپک آرسی** (جانی پور، بھارت)

راکھ ہو جاتا ہے جب بستی کا اک گھر اور بھی — ڈر کوئی پیوست ہو جاتا ہے اندر اور بھی
جس میں کھارا پن نہیں ہے اور نہ تلچھٹ کا وجود — اُس نے رکھا ہے مِری خاطر سمندر اور بھی
جو ملا اونچا بہت اونچا ملا مجھ سے دراز — ڈھونڈنے نکلا تھا میں اپنے برابر اور بھی
بھول کر بیٹھے ہوئے ہَیں دنیا بھر کے سنگ تراش — جس نے سب کو ہی تراشا ہے اِک آذر اور بھی
الوداع کہنا پڑا ہے عمر بھر جس میں رہا — جب ازل بتلا گئی ہے تیرا اک گھر اور بھی
ایک راون کا پتہ تھا ہے نیا راون عجب — دس اُتارے تو اُگ آئے سنکڑوں سر اور بھی
کاٹ کر نِکلا ہی تھا وہ پنکھ میرے آرسیؔ — جانے پھر کیسے نکل آئے مِرے پر اور بھی

# حرفِ خیر

پروفیسرڈاکٹررؤف خیر
(حیدرآباد، دکن)

**اردو** ادب کا ایک بے حد رومانی دور خط کتابت سے وابستہ رہا ہے۔ آدمی خط لکھتے ہوئے اپنا کلیجہ نکال کر کاغذ پر رکھا دیا کرتا تھا۔ ایسا ہر خط مکتوب الیہ کے لیے سرمایۂ دل نواز ہوتا تھا جسے وہ حرزِ جاں بنائے رکھتا تھا۔ محبوب کا خط محبوب کے دیدار سے کم لذت بخش نہیں ہوتا۔ خط لکھنے والی ہستی اگر فکر وفن کے اعتبار سے معزز و مستند ہو تو اس کی تحریر بلند اقبالی کا عطیہ شمار ہوتی ہے۔ خط کی رومانی حیثیت اس قدر مسلمہ ہے کہ ایک شاعرِ اختر شمار (اختر شیرانی) سلمٰی وعذرا کو نہ صرف خطوط لکھتا ہے بلکہ ان کی طرف سے جوابی مراسلت بھی خود ہی کر کے رومانیت میں سانس لیتا ہے۔

''غبارِ خاطر'' جب خود کلامی کا روپ دھارتا ہے تو شاہ کار ٹھہرتا ہے۔ ایسی تنہائی، تنہائی نہیں رہ جاتی۔ خلوت میں جلوت کے مزے آنے لگتے ہیں۔ فکرو فلسفہ کی ایک دنیا آباد ہو جاتی ہے اور ''غبارِ خاطر'' مکتوباتی ادب اور انشائیے کی ایک منفرد مثال قرار پاتا ہے۔ خطوط کی ایک دستاویزی حیثیت ہوتی ہے۔ آدمی سے بھول چوک ہوسکتی ہے مگر اس کی تحریر اُسے آئینہ دکھاتی ہے۔

غالب تو خطوط کے معاملے میں منفرد ہیں۔ انہوں نے قاصد، خط، خامہ خوں چکاں کے حوالے سے انوکھے تجربات سے اردو شعر وادب کو آشنا کیا اور پھر دوستوں اور شاگردوں کو لکھے ہوئے ان کے بے شمار خطوط سرمایۂ زرتاب ہیں۔

اقبال کو سمجھنے میں ان کے خطوط ممد ومعاون ثابت ہوتے ہیں مگر پتا نہیں کیا سوچ کر اقبال نے اپنے نام آئے ہوئے تمام مکتوبات اپنے سامنے نذرِ آتش کروا ڈالے ورنہ اُن مشاہیر کو بھی سمجھنے کا موقع ملتا جنہوں نے اقبال کے آگے اپنا حالِ دل رکھا۔

بڑے آدمی ہر کس و ناکس سے بے تکلف گفتگو پسند نہیں کرتے۔ اسی طرح جس کو اپنی سطح کا خیال کرتے ہیں اسی کو خط لکھتے ہیں۔ ایک گستاخِ رسول ﷺ راج پال نامی کو کیفر کردار تک پہنچانے والے محبِ رسول ﷺ کو علامہ اقبال نے بھی خراجِ عقیدت پیش کیا تھا۔ ایسے جیالے کے نام کو نئی زندگی بخشنے والے غازی علم الدین اسم با مسمیٰ ہیں۔ آپ نے ادب اور مذہب کے معاملے میں کبھی مصلحت سے کام نہیں لیا۔ حق گوئی و بے باکی آپ کا شناس نامہ ہے۔ ہندو پاک سے لے کر لندن امریکہ تک آپ کے چاہنے والے پھیلے ہوئے ہیں۔ اس میں آپ کی شخصیت، علم وانکسار، علمی متانت ووقار کو دخل ہے۔ ''سروش'' اور ''سیماب'' کی ادارت فرما کر آپ نے ان مجلّوں کو اعتبار بخشا۔ آپ کی شناخت ماہرِ لسانیات، بے باک نقاد اور مستند محقق کی حیثیت سے ہے۔ آپ کے نام جن اہلِ قلم نے مکاتیب تحریر فرمائے ہیں وہ بھی بجائے خود معتبر وممتاز ہیں۔ ۱۹۹۶ء سے ۲۰۱۶ء تک بیس برسوں کے دورانیے میں کئی مشاہیر نے آپ سے تحریری رابطہ قائم کیا۔

بعض خطوط ''سروش'' اور ''سیماب'' کے مشمولات پر رائے پر مشتمل ہیں مگر بیش تر خطوط بیحد علمی بھی ہیں اور بین السطور بہت ساری اہم معلومات منظرِ عام پر آتی ہیں۔ جس سے پتا چلتا ہے کہ شیخ محمود صاحب نے علامہ اقبال کے ''جاوید نامہ'' کا منظوم انگریزی ترجمہ بعنوان ''Pilgrimage to Eternity'' کیا ہے۔ اقبال کے فارسی کلام کا اردو میں منظوم ترجمہ کرنے والے ہندو پاک میں پھیلے ہوئے ہیں۔ انڈیا کے شہر بنگلور میں بیٹھے ہوئے ایک بزرگ سید احمد ایثار ہیں جنہوں نے اقبال کے تمام فارسی کلام کا منظوم ترجمہ کر ڈالا جن کی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی۔ تعلّی نہیں بلکہ تحدیثِ نعمت کے طور پر عرض کرتا ہوں کہ میں نے بھی پیامِ مشرق میں شامل ۱۶۳ قطعات پر مشتمل ''لالۂ طور'' کا منظوم ترجمہ کیا ہے جو ''قنطار'' کے نام سے ۲۰۰۰ء میں شائع ہوا جسے اربابِ نظر نے سراہا۔

پروفیسر قاضی ظفر اقبال کے خط سے اردو املا کے لسانی پسِ منظر پر روشنی پڑتی ہے۔ تسہیلِ املا کے نام پر جو اختراعات کی جا رہی ہیں ان سے قاضی صاحب متفق نہیں۔ وہ رشید حسن خان کے املا سے بھی اتفاق نہیں کرتے۔ اس پر مشتاق احمد یوسفی کا لطیفہ یاد آتا ہے کہ طوطا تو (ط) ہی لکھا جانا چاہیے بلکہ (ط) کو سلیقے سے لکھا جائے تو نہ صرف اس سے طوطے کی چونچ کا اظہار ہوگا بلکہ اس کے گہرے رنگ کا بھی اظہار ہوگا۔ پروفیسر قاضی ظفر اقبال بعض محاورات کو قبول کر لینے کا مشورہ دیتے ہیں جیسے ''جنم جنم کا ساتھی'' اسے آواگون سے جوڑنے کی ضرورت نہیں بلکہ یہ بے انتہا وفاداری پر دال ہے۔ قاضی صاحب کے خط میں اور بھی بہت سی باتیں ہیں جو سوچنے پر مائل کرتی ہیں۔ رد و قبول کا قاری کو اختیار ہے بشرطیکہ اس کے پاس پکی دلیل ہو۔

پروفیسر غازی علم الدین کی شاہ کار کتاب ''لسانی مطالعے'' کو انڈیا کے مناظر عاشق ہرگانوی نے لفظ بہ لفظ اپنے نام سے چھپوالیا۔ البتہ کتاب کا نام بدل کر ''لسانی لغت'' کر دیا اور اسے ''اردو میں اپنی پہلی پیش کش'' قرار دیا جب کہ پروفیسر غازی علم الدین کی کتاب مقتدرہ قومی زبان پاکستان سے ایک سال پہلے ۲۰۱۲ء میں شائع ہو چکی تھی۔ مناظر عاشق نے بس اتنا کرم کیا کہ قوسین میں خطِ نفی میں یہ لکھا کہ (غازی علم الدین کے حوالے سے) مگر ٹائٹل پر اپنا نام ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی خط جلی میں لکھ لیا۔

''اہل قلم کے مکاتیب بہ نام غازی علم الدین'' نامی زیرِ نظر کتاب میں مناظر عاشق ہرگانوی کے دو خط بھی شامل ہیں جو یکم جولائی ۲۰۱۴ء اور ۲۵۔ مئی ۲۰۱۶ء کو لکھے گئے ہیں۔ گویا غازی علم الدین صاحب کی کتاب اپنے نام سے چھاپنے کی انہوں نے اجازت ہی نہیں لی۔ اس سلسلے میں ہزارہ یونیورسٹی کے پروفیسر ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان کا خط مورخہ ۲۰۔ جون ۲۰۱۴ء بڑا دلچسپ ہے۔ لکھتے ہیں:

''لیکن بھیا کیا کہوں۔ اگلے ہی لمحے ''لسانی لغت'' نے ساری مسرتیں لوٹ لیں کیوں کہ وہی کتاب جس میں میرا تبصرہ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی سے چھپا اسی

ادارے نے بغیر سوچے سمجھے غازی علم الدین کی بجائے ہو بہو، کسی بھی قابلِ ذکر تبدیلی کے بغیر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کے نام سے (اسے) چھاپ دیا یاللعجب !! اگر آپ نے خود اپنی یہ لغت ہرگانوی صاحب کو ہبہ کر دی اور اپنے نام سے شائع کرنے کی اجازت دے دی ہے تو آپ کی اس عنایت خسروانہ کو شاباش اور اگر بالفرض ہرگانوی صاحب نے آپ کی اجازت کے بغیر ہر چرن داس ہونے کی یہ نازیبا حرکت کی تو اُن کی علمی دیانت پر حیف۔ دوسروں کی سال ہا سال کی محنت اور کاوش پر اس طرح ہاتھ صاف کرنا کیا شوقِ تصنیف پورا کرنے کا جائز عمل ہے:

آفریں بر مکر خوش پوش شما۔''

خود اپنے ساتھ بھی اسی قسم کی ایک دھاندلی کا ذکر کرتے ہوئے پروفیسر ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان اسی خط میں مزید لکھتے ہیں:

''ہرگانوی صاحب نے آپ کا بچہ چھین کر جو صدمہ پہنچایا ہے وہ اغوا برائے تاوان کے ارتکاب سے زیادہ مجرمانہ ہے۔ وہاں تو تاوان کی ادائیگی سے ازالہ ہو جاتا ہے (بقدرِ توفیق) لیکن اس صدمے سے آپ تادمِ مرگ جان بر نہ ہو پائیں گے۔ ایسا بکف چراغ لے کر سرقہ بازی کا کاروبار اہلِ علم کو تو زیب نہیں دیتا۔ یہ کتاب مقتدرہ قومی زبان پاکستان جیسے عالمی شہرت کے حامل ادارے نے بہت پہلے چھاپ دی تھی۔ اسی کتاب کا دہلی سے اب کسی اور نام (غازی علم الدین کے حوالے سے) لکھ دینے کی سخاوت کے ساتھ چھپنا سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کتاب پر ادب پروری کے عالمی ادارے کا (SSB) نمبر درج ہے۔ اس کی طرف رجوع کر کے صورتِ حال سمجھائیں۔ میں سمجھتا ہوں آئندہ ایسی حرکت کے سدِ باب کے لیے یہ ضروری ہے۔ ایسا نہ کرنا رواداری نہیں بلکہ ایسے جرائم کی پردہ داری اور شریکِ جرم ہونے کی غلطی ہوگی۔''

اس میں شک نہیں پروفیسر غازی علم الدین بڑی مروتوں کے آدمی ہیں مگر پروفیسر ڈاکٹر ارشاد شاکر اعوان کا نیک نیتی سے دیا ہوا مشورہ بھی یقیناً قابلِ غور ہے۔

تمام اہلِ قلم کے مکاتیب بہ نام غازی علم الدین قلم برداشتہ لکھے گئے ہیں۔ لکھنے والوں کو یہ معلوم ہی نہیں تھا کہ ان کے خطوط کتابی صورت میں شائع بھی ہوں گے البتہ محترم شمس الرحمٰن فاروقی نے لکھا کہ وہ اپنا خط مقتدرہ کے ''اخبار اردو'' میں چھپنے کے لیے انوار احمد صاحب کو بھی بھیج رہے ہیں۔

فاروقی صاحب دو ٹوک انداز میں فرماتے ہیں کہ ''زبان۔۔۔رواجِ عام سے بنتی ہے'' وہ پروفیسر غازی علم الدین کی علمیت پر حرف رکھتے ہوئے فرماتے ہیں:

''آپ کے بارے میں میری حقیر رائے یہ ہے کہ آپ عربی اور اسلامیات کے عالم ہیں۔ فارسی بھی آپ بقدرِ ضرورت جانتے ہیں لیکن اردو کی رائج زبان سے آپ کی واقفیت کم ہے۔ آپ مسلسل اس اصول کو نظر انداز کرتے ہیں کہ زبان رواجِ عام سے بنتی ہے اور جو کچھ بھی زبان میں رائج ہے وہی درست ہے۔ زبان کے اعتبار سے ''رواجِ عام'' سے میری مراد ہے وہ زبان جو کسی معاشرے میں رائج ہو۔''

پروفیسر غازی علم الدین کا جہاد اسی رواجِ عام کے خلاف ہے جو زبان کو بگاڑنے کے درپے ہے۔ بازاروں کے علاوہ ذمہ دار اداروں جیسے ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر بھی جو غلط زبان رواج پا رہی ہے اس کے خلاف احتجاج ضروری ہے تاکہ زبان کی ادبیت اور اس کی اصلیت مجروح نہ ہو۔ ہندی کے اثر کی وجہ سے ہندو پاک میں ''قلم کار'' جیسے خوب صورت لفظ کی جگہ ''لکھاری'' جیسا بھدا شبد، ''قابلِ اعتماد'' کی بجائے ''بھروسا مند'' اور ''میرا خیال ہے'' کو ''میرا ماننا ہے'' کہنے والے پیدا ہو رہے ہیں۔ اخبارات لکھ رہے ہیں ''پرانا شہر میں فساد ہو گیا۔''

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب کے بعض مشوروں پر عمل کیا جا سکتا ہے مگر سب مشورے قابلِ قبول نہیں۔ بعض الفاظ کے احترام میں ان سے اجتناب ضروری ہے جیسے قبلے کی جانب تھوکنے کو مسلمان غلط سمجھتے ہیں اسی طرح بسم اللہ ہی غلط ہو گئی، کہنا ہی غلط ہے بھلے ہی بعض نام نہاد مسلمان اسے بولتے ہوں۔ ایسے مسلمان تو سیدھے ہاتھ سے ناک میں انگلیاں کرتے ہیں اور بائیں ہاتھ سے کھاتے پیتے ہیں۔

فاروقی کہتے ہیں کہ دستر خوان پر مہمان سے جب کہا جاتا ہے کہ بسم اللہ کیجیے تو مطلب ہوتا ہے شروع کیجیے۔ معاف کرنا! اس کا مطلب ہوتا ہے اللہ کے نام سے کھانا شروع کیجیے۔ یہ ہماری اسلامی تہذیب ہے، اس کی پاس داری ضروری ہے۔

شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے بجا فرمایا کہ عربی فارسی الفاظ کو ملا کر ہم نے لفظ بنا لیے جیسے گل بدن، قمر چہرہ، مزاج دان، خوف ناک وغیرہ۔۔۔ اس مرحلے پر ہمیں یاد آیا کہ مولانا ابوالکلام آزاد نے کبھی فرمایا تھا کہ وہ کیا شاعری کرے گا جس کا نام ہی غلط ہے یعنی اختر الایمان۔۔۔اس کا کام جیسا بھی تھا کم از کم نام غلط نہیں ٹھہرا۔

خطوط میں آدمی ایسا ہی کھل کر سامنے آتے ہیں جیسے سفر میں آ جاتا ہے۔ انڈیا کے نذیر فتح پوری آزاد کشمیر پاکستان کے پروفیسر غازی علم الدین سے اپنے خط میں فرمائش کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ ''ان کی توضیحات والی کتاب دہلی کے ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس سے شائع کرا دیں تو ایک یادگار کام ہو سکتا ہے۔'' کسی پاکستانی ادارے سے چھپوانے کی گزارش کرتے تو کوئی بات بھی تھی۔

کچھ لوگوں کی گفتگو قائم بالذات ہوتی ہے یا پھر وہ غیر متعلقہ گفتگو سے اپنے مخاطب کو الجھائے رکھتے ہیں۔ اسی طرح بعض لوگ خط بھی لکھتے ہیں۔ اسی طرح کے بعض خطوط زیرِ نظر کتاب میں بھی شامل ہیں جو غالباً عبرت کے لیے شائع کیے گئے ہیں۔ یوں بھی پروفیسر غازی علم الدین مروّتوں کے آدمی ہیں لیکن جب معاملہ زبان وادب، تہذیب وثقافت اور مذہب کا درپیش ہو تو پھر وہ رورعایت سے کام نہیں لیتے۔

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم — رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مومن

بقول رؤف خیر:

کتنے کھرے حوالے نہ حیلے کے لوگ ہیں
واللہ یہ تو اپنے قبیلے کے لوگ ہیں

# حالیؔ کی قلبی واردات۔سرسیّد کا مرثیہ

سید تقی عابدی
(کینیڈا)

سچ ہے ع: دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے۔ یہ مرثیہ حالیؔ کے فن اوران کا سرسید سے خلوص کا شاہکار ہے۔ حالیؔ نے سرسید کے مرثیہ کو فارسی میں ترکیب بند کے سات بندوں میں تخلیق کیا جس کے ہر بند میں دس شعر ہیں یہ مرثیہ ایرانی شاعر محتشم کاشی کے مرثیے کی بحر میں ہے۔ یہ فارسی کا مرثیہ مئی ۱۸۹۸ء میں مطبع مجتبائی دہلی سے شائع ہوا۔ مرثیہ کے پہلے حصّے میں سرسید کے انتقال سے جو رنج وغم کی لہر برصغیر میں پھیلی اوران کی کمی سے جو شدید نقصان قوم کو ہوا اس کو بڑے ہی خوبصورت اور پرتاثیر انداز میں بیان کیا ہے جو ان کی قلبی واردات اورفن پرمہارت کی دستاویز بھی ہے۔

اے عجب کز مُردنِ یک پیر مردِ سال خورد
تاب وتب در کودک و پیر و جواں انداختند
اے عجب کز سوزِ اندوہِ وفاتِ مسلمے
مردمِ ہر کیش را آتش بجاں انداختند
سید اندر قوم نقدے بد اندر کیسۂ ای
کیسہ خالی ماندہ و نقد از میاں انداختند
قوم را سرمایۂ مجد و علا از دست رفت
بعد ازاں کایں گنج را در خاکداں انداختند

یعنی تعجب ہے کہ ایک بڈھے کے مرنے سے اضطراب اور بے چینی بچوں جوانوں اور بزرگوں میں پھیل گئی ہے۔ عجیب بات ہے کہ ایک مسلمان کی موت نے ہر قوم وملت کے لوگوں کے دلوں کو جلا دیا ہے۔ سرسید قوم کی تھیلی کی نقدی تھے چنان چہ نقدی گرگئی اوراب تھیلی خالی ہے۔

قوم کی تعمیر اور عظمت کی دولت ہاتھ سے نکل گئی اور بعد میں اُسے خاک میں دفن کر دیا گیا۔ سرسید نے تمام عمر ملت اور دین کی حفاظت کی یہی ان کا حج تھا یہی روزہ اور یہی ان کی نماز وہی قوم کا سید اور سردار ہے جو قوم کا خدمت گزار ہے یقیناً سرسید کی سیادت اس کی گواہی بھی دے رہی ہے۔

در مصافِ دہر بودن دین و ملّت را سپر
حج اوایں بود اینش صوم وایں بودش صلوٰۃ
سیدالقوم ست ہر کس قوم را خدمت کند
قدمت او بر سیادت بس بود او را گواہ

حالیؔ مرثیے کے تیسرے بند میں انسان بننے کی اہمیت کو بہت خوب صورت تمثیلوں اور تلمیحوں سے مضمون باندھ کر ظاہر کرتے ہیں۔ حالیؔ کہتے ہیں کوئی فضل وعلم میں نابغۂ روز ہوسکتا ہے کوئی فصاحت میں مثل سحبان یا عقل وحکمت میں لقمان جیسا بن سکتا ہے، دولت میں قارون کو پیچھے کرسکتا ہے سلطنت اور ثروت میں خسرواور پرویز بن سکتا ہے کہیں بہادری میں رستم تو کبھی قطب اور غوث سب کچھ ہوسکتا ہے مگر انسان ہونا دوسری چیز ہے۔

انسان وہ ہے جو ہمسائے کے رنج و درد سے بے تاب رہتا ہے وہ جنت کی ہوا میں بھی محروموں کی زندگی سے افسردہ رہتا ہے وہ دوسروں کے مقابل خود کو خوار و ذلیل محسوس کرتا ہے اس کا دل دکھ سے بھرا رہتا ہے اگر چہ شبستان ہی میں کیوں نہ ہو کیونکہ وہ محنت کشوں کی زحمتوں کا احساس رکھتا ہے۔

می تواں در فضل و دانش شہرۂ دوراں شدن
در فصاحت ہمچوں سحبان، در خرد لقماں شدن
می تواں در جاہ و ثروت گوے از قاروں ببرد
می تواں در زہد و طاعت غیرتِ صنعاں شدن
می تواں در ملک و دولت خسروِ پرویز گشت
می تواں در زور و طاقت رستمِ دستاں شدن
میں تواں قطب زماں شد، می تواں شد غوثِ وقت
ہر چہ خواہی می توانی شد بجز انساں شدن
چیست انسانی؟ تپیدن از تپ ہمسایگاں
از سمومِ نجد در باغِ عدن پژماں شدن
خوار دیدن خویش را از خوارئ ابنائے جنس
در شبستاں تنگ دل از محنت زنداں شدن

پھر اس مضمون کو خوب صورت گریز سے دو آتشہ بنا دیتے ہیں قوم کی فکر میں زندگی گزارنا اور قوم ہی کے زندان میں گھٹ کر مرجانا اگر کوئی کرسکتا ہے تو وہ سرسید احمد خان بن سکتا ہے۔

زیستن در فکر و مردن اندر بند قوم
گر توانی می توانی سید احمد خاں شدن

حالیؔ نے مرثیے کے چوتھے بند میں بتایا کہ سرسید کے راستے میں ہر قسم کی رکاوٹیں ڈالی گئیں۔ سرسید کو ہر طرح سے بُرا کہا گیا۔ سرسید پر کفر کا فتویٰ لگایا گیا یعنی ایک پورا محاذ سرسید کے خلاف کھڑا کیا گیا لیکن سرسید کے پائے استقلال میں جنبش نہ ہوئی وہ شیر مردوں کی طرح اپنی داخلی روشنی اور حرارت سے کام کرتا رہا وہ محفل کو روشن رکھنے کے لئے شمع کی طرح خود پگھلتا رہا لیکن اپنے گھوڑے کی مہار آخری وقت تک منزل مقصود کے پہنچنے تک تھامارہا اگر چہ راستہ کانٹوں بھرا تھا حیف کہ نادانوں میں جو دانا تھا چلا گیا جو بنجر زمین میں میوہ دار درخت تھا اکھڑ گیا۔

بود در امت بہ بدعت متہم از راستی
ارے ایں باشد دریں عالم سزائے راستاں

یار جز علمش نہ بود و علم دانی نا درست
ایں چنیں بے کس سزد کز جہل پرداز د جہاں
بود یاراں را سپر تا بود در ہر شور و شر
لیک یاراں بر سرش تیغ جفا می آختند
خواجہ در فکرِ صلاحِ دین و ملت در گزشت
لیک اہلِ دین و ملت قدرِ اُو نشناختند
کار کارِ شیر مردان است کز سوزِ دروں
بزم را افروختند و شمع ساں بگداختند
سید از رہ تا دمِ آخر عناں را بر نتافت
گرچہ در راہش بسے خار و خسک انداختند
حیف کاندر جمعِ مستاں ہوشیارے بود، رفت
در زمینِ شور نخلے بار دارے بود، رفت

اے علی گڑھ ذرا تو ہی بتا کس نے تجھے شہروں میں شہرت یافتہ کیا کس نے تیری خاک کو آسمان پر پہنچادی۔

اے علی گڑھ آں کہ کردت شہرت در امصار، کو؟
آں کہ از خاکت بہ گردوں برد آں معمار کو؟

حالؔی مصلح بھی ہیں مجدد بھی ہیں۔ وہ سب سے زیادہ قوم کی فکر میں ہیں انھیں معلوم ہے کہ ہمارے قدم رکنے نہ پائیں یہ تعلیمی تربیتی ادارے اِسی طرح سے ترقی کے راستے پر گامزن رہیں۔ وہ مرثیہ کے آخری بند میں اپنا فریضہ ادا کرتے ہیں جس کے لیے یہ سارا مرثیہ کہا گیا۔ وہ ملّت سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں سرسید نے دارالعلوم تمہارے لئے بنایا ہے تا کہ نسل در نسل دولت علم سے مالا مال رہے انھوں نے پہاڑ کاٹ کر جوئے شیر نکالی ہے جو پانی نالے میں بہہ چکا تھا اُسے واپس لوٹا دیا ہے مجھے خوف یہ ہے کہ مخالفت کے زور سے یہ چشمہ کا پانی استعمال کے قابل نہ رہے ہاں یہی اور صرف یہی وقت ہے کہ ہم سب باہم متفق ہو جائیں۔ عزم و استقلال کے ساتھ کھڑے ہوں ہاتھوں میں ہاتھ ہو اور ہماری کمریں کام کرنے کے لیے کسی ہوئیں ہوں۔

خواجہ دار العلمے از بہرِ شما بگزاشت است
تا بود نسلِ شما از علم و دولت بہرہ ور
کوہ با کندہ است تا ایں جوے شیر آوردہ است
بو کہ آبِ رفتہ در جوے شما آید ز سر
ترسم ایں سر چشمہ گردد تیرہ از سنگِ خَاف
ہان و ہاں وقت است، وقتِ اتفاقِ ہم دگر
عزمِ جزم آرید و بر خیزید و ہم دستاں شوید
دست بکشائید و بر بندید دامن بر کمر

جہاں تک زبان و بیان سوز و تاثیر زور و جذبات کا تعلق ہے یہ فارسی کا مرثیہ حالؔی کی فارسی تصانیف کا گل سر سبد ہے۔ یہاں تشبیہات کی ندرت استعارات کی لطافت ترکیبوں کی بلاغت اور لفظوں کی فصاحت حالی کی فارسی شاعری کا سکہ منوا رہی ہے۔

! بلاعنوان !

پاکستان میں پیدا ہونے والا ہر بچہ جب شعور کی منازل طے کر لیتا ھے تو اس کے ذہن میں حرام اور حلال کا تصور اتنا واضح نہیں ہوتا جتنا واضح انڈیا اور اسرائیل سے دشمنی کا تصور ہوتا ھے اگر آپ اسرائیل کی آبادی دیکھیں تو وہ 8 ملین کے قریب ھے، یعنی پنجاب کے شہر فیصل آباد جتنی آبادی۔ اگر آپ دائیں بازو سے تعلق رکھنے والوں سے ایک سادہ سوال ہو چھیں کہ 80 لاکھ کی آبادی والا ملک اسرائیل، ڈیڑھ ارب آبادی کے مسلمانوں کو اپنے جوتے کی نوک پر کیوں رکھے ہوئے ھے، تو یہ سب لوگ یا تو پتلی گلی سے نکل جائیں گے، یا پھر آپ کو بھی یہودی ایجنٹ کا لقب دے کر بھاگ جائیں گے۔ یہ رائٹسٹ آپ کو کبھی نہیں بتائیں گے کہ گوجرانوالہ سے بھی چھوٹے سائز کا ملک ہونے کے باوجود اسرائیل دنیا کا طاقتور ترین ملک کیسے بن گیا۔ اس کی وجہ آج کے اخبارات میں شائع ہونے والی ایک چھوٹی سی خبر میں پوشیدہ ھے۔ خبر کے مطابق اسرائیل کے موجودہ وزیر اعظم نتن یاھو کے خلاف آج سے 9 ماہ پہلے اسرائیل کی خفیہ ایجنسی کو کرپشن کی شکایات موصول ہوئیں۔ خفیہ ایجنسی اتنی با اختیار ھے کہ اس نے فوری نوٹس لے کر نتن یاھو کے خلاف تحقیقات شروع کر دیں۔ یہ معاملہ آج سے کئی سال قبل کا تھا جب نتن یاھو وزیر خزانہ ہوا کرتا تھا اور اس وقت اسرائیل نے فرانس سے آبدوز خریدی تھیں۔ الزامات کے مطابق نتین یاھو نے اس سودے میں ایک ملین یوروز رشوت لے کر مہنگے داموں سودا کیا تھا۔ پچھلے ہفتے جب اس کے خلاف ابتدائی تحقیقات مکمل ہو گئیں اور رپورٹ اسرائیل کے اٹارنی جنرل کو ارسال ہوئی تو اس نے معاملے کا جائزہ لینے کے بعد آج پولیس کو حکم دیا کے وہ موجودہ وزیر اعظم کے خلاف کرپشن کا مقدمہ درج کر کے اگلے چند روز کے اندر اندر اسے تحقیقات کیلئے تھانے بلائے۔ اٹارنی جنرل کا یہ اقدام اسرائیل میں بالکل نارمل انداز میں لیا گیا، کسی نے یہ نہیں کہا کہ وہ جمہوریت کو نقصان پہنچانا چاہتا ہے، نتین یاھو نے اسمبلی میں کھڑے ہو کر یہ نہیں کہا کہ یہ رقم تو اس نے فلاں فیکٹری بیچ کر اکٹھی کی تھی، وہاں کوئی فضل الرحمان نہیں تھا جس نے یہ بیان دیا ہو کہ آبدوز کا معاملہ مسلمانوں کی سازش ھے، وہاں کوئی زرداری نہیں تھا جو اس معاملے کی آڑ لے کر اپنے کام سیدھے کروانے آ گیا، وہاں کوئی سراج الحق نہیں تھا جس نے اٹارنی جنرل کو یہ کہا ھو کہ نتن یاھو کے خلاف تحقیقات کرنے سے پہلے 1947 سے لے کر اب تک سب کا احتساب کیا جائے، وہاں کی سپریم کورٹ نے یہ نہیں کہا کہ فرانس سے رشوت لینے کی خبر جس اخبار میں چھپی تھی، اس میں تو پکوڑے بکتے ہیں۔

# ''مارچ''

## آپا جمیلہ شبنم

(اسلام آباد)

مارچ۔۔۔م۔محبت، الف۔اُلفت، ر۔رحمت، چ۔چاہت۔ماہِ مارچ محبتوں کا مہینہ۔نادرہ مرزا کے لیے خالق اکبر کا حسین انتخاب۔اللہ اکبر۔ اللہ اکبر۔

دل نشین دوست۔۔۔دو مارچ میری شادی ہوئی تھی۔رخصتی کا گانا آج بھی میرے بیقرار دل پر دکھ بھری چوٹیں لگا رہا ہے۔

چھوڑ بابل کا گھر، موہے پی کے نگر آج جانا پڑا

۱۰۔مارچ بروز جمعرات میری تم سے آخری ملاقات ہسپتال میں ہوئی۔میں اپنی بیٹی فرح علی کی صدق دل سے شکر گزار ہوں کہ اس نے دو محبت بھرے دلوں کو ملاقات کا موقع فراہم کیا۔مگر یہ کیسی انوکھی، دل گداز ملاقات ہے۔تمہارا تنِ بوسیدہ سفید چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ذہین اور خوب صورت آنکھیں بند۔تکلم سے محروم ہونٹ۔مخروطی انگلیوں والے بے جان ہاتھ۔محبت بھری صدائیں دینے والا پاکیزہ دل خاموش، دم بخود۔آہنی پلنگ پر سفید چادر میں لپٹی میری ہمدم دیرینہ۔نادرہ مرزا۔

آج تم نے ایک بار بھی پلٹ کر مجھے نہیں دیکھا۔میں موت کے سناٹے میں کھڑی پرنم آنکھوں سے تمہارے محبت بھرے وجود کو دیکھتی رہی۔فرح نے بڑی مضبوطی سے میرے ریزہ ریزہ وجود کو سنبھالا دے رکھا تھا۔پیکرِ مہر و وفا۔ بستر مرگ پہ بھی تم نے میرا کتنا خیال رکھا جان لیوا بیماری کے ہاتھوں کراہتے، تڑپتے، سسکتے وجود کے ساتھ مجھے ملنا منظور نہ تھا۔تم نے مجھے گلے لگانے کی بجائے موت کو گلے لگا لیا۔تمہارے چاروں طرف آسودگی ہی آسودگی تھی۔ایک فاتحانہ آسودگی۔۔۔میری غم گسار دوست میں تمہاری انسان دوستی کو سلام پیش کرتی ہوں۔

ہسپتال سے تمہارے تن بوسیدہ کو گھر لایا گیا۔وسیع ڈرائنگ روم میں ایک چارپائی پر تمہیں لٹایا گیا۔میں کرسی میں تمہاری چارپائی کے ساتھ بیٹھ گئی۔ لوہے کی بنی چارپائی نے مجھے ماضی کی یادوں میں ڈبو دیا۔موسم سرما کی حدّت بھری دھوپ سینکنے ہم دونوں ٹیرس میں آ کر گھنٹوں اس چارپائی پر بیٹھ کر کائنات کے حسن سے لطف اندوز ہوا کرتی تھیں۔فیض احمد فیض۔ناصر کاظمی۔ساحر لدھیانی اور احمد فراز کی چیدہ چیدہ غزلیں، نظمیں جب میں تمہیں سنایا کرتی تھی تو تمہاری آنکھیں جگمگا اٹھتی تھیں۔

پھول، کتابیں، پرندے اور مخلص دوست تمہارا سرمایہ زیست ٹیرس کے ایک کونے میں مٹی کی ایک پرات تم نے پرندوں کے چوگے کے لیے رکھی ہوئی تھی۔ دوپہر کے کھانے سے ایک چپاتی پرندوں کے لیے رکھ لیتی اور پھر بڑی باقاعدگی سے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے بنا کر پرات میں ڈال دیتیں۔پرندوں کے خاص کر لالیوں اور فاختاؤں کے جھنڈ کے جھنڈ کھانے کے لیے لپکتے اور پیٹ بھر کر اُڑ جاتے تھے۔

علی گڑھ یونیورسٹی نے تمہیں علم کی دولت سے مالا مال کیا۔تم درس و تدریس کے پیشے سے بھی منسلک رہیں۔لکھنا، پڑھنا، دوسروں کی شکل میں کام آنا تمہارا محبوب مشغلہ تھا۔ریاست بھوپال کی پروردہ پاکستان آ بسی۔

شوہر کی محبت بھری رفاقت۔تحفظ اور قدر دانی کا انمول سائبان۔ دونوں کی بے لوث محبت کا شریں ثمر اکلوتی فوزیہ۔۔۔قدرت کی صناعی کا حسین شاہکار۔سیرت وصورت کا بے مثال امتزاج۔لوگ اکثر فوزیہ کو ''بچوں کی خوبصورت ماں'' کہتے تھے۔تمہاری ازدواجی زندگی بہار آفریں تھی۔شوہر کی محبت بھری رفاقت میں پُرسکون زندگی۔۔۔

بیٹی کو بیاہ کر ہر طرف طمانیت ہی طمانیت تھی۔نسیم برنی بیٹے کے روپ میں داماد مل گیا۔۔۔سبحان اللہ

نواسے، نواسیوں سے مہکتا گھر۔بچوں کی شوخیاں، رنگینیاں، ہر طرف محبت کی فراوانیاں، بے لوث جذبوں کی تابانیاں، دل نوازیاں، اللہ کی شکر گزاریاں، مفاداریاں اور ایمان کی استواریاں۔

''ہر ذی روح نے موت کا ذائقہ چکھنا ہے''

اللہ پاک کا یہ فرمان مقدس تمہارے ہنستے بستے گھر لاگو ہو گیا۔''میر کارواں'' نے خاموشی سے سر جھکا کر اپنا راستہ بدل لیا۔تمہارے نصیب میں دائمی جدائیاں ہی جدائیاں۔بیوگی کی کربناک دشواریاں، محرومیاں، تنہائیاں، شب و روز کی آہ وزاریاں۔۔۔

تمہاری زندگی کا چلن یکسر بدل گیا۔تم بے بسی، بے کسی کی زندہ تصویر بن گئی۔بیوگی آکاس بیل کی طرح تم پر چھا گئی۔۔۔حواس باختہ دل گیر و دل گرفتہ۔۔۔نادرہ مرزا

جون کا تپتا ہوا دن تھا جب تم سے میری پہلی ملاقات ہوئی گھنٹی کی آواز پر میں نے دروازہ کھولا۔تم نے نہایت شائستہ لہجے میں پانی طلب کیا۔میں نے آہستگی سے تمہارا پسینے سے تر ہاتھ تھاما اور اپنے کمرے میں لا بٹھایا۔

یہ تھی تپتے جون کی دوپہر تم سے میری پہلی ملاقات۔۔۔پھر جون کی تپش محبت کی دل گداز تپش میں ڈھل گئی اور دو ہم عمر، ہم خیال، ہم درد اور غمگسار ہستیاں۔۔۔ایک جان۔۔۔دو قالب۔۔۔ہماری روح فرسا تنہائی اور اُداسی حسین مشاغل میں سما گئی۔

تمہارے قلم میں بلا کی تاثیر تھی۔۔۔تمہاری دل گیر، دل پذیر اور دلکش تحریریں۔۔۔تمہارے خوبصورت لب ولہجہ میں گھنٹوں سنا کرتی تھی اور آنسو بہایا کرتی تھی خاص کر یہ طویل نظم (اپنے رفیق زندگی کی یاد میں) میرا چندا روٹھ گیا۔ میرا کاجل چھوٹ گیا۔

میری دوست عذرا اصغر کے گھر ایک ادبی محفل میں تم نے اپنی دلکش آواز میں جب یہ نظم پڑھی تو میری آنکھ اشک بار تھی۔ امریکہ سے ستیہ پال آنند، یو کے سے مقصود الٰہی شیخ، بشیر سیفی، گلزار جاوید، رشید اشک، اکبر حمیدی اور بشیر ناظم کے علاوہ دیگر حاضرین مجلس نے بھی دل کھول کر داد دی اور تم سادگی، درویشی کا مرقع بنی دھیمی دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ بے لوث داد سمیٹ رہی تھیں اور میں ''دستورِ وفا کی آئینہ دار'' دوست کی دوستی پر شاداں و نازاں تھی۔

پیکر صبر و رضا۔۔۔ اکادمی ادبیات، ایوان اردو ادب، حلقہ ارباب ذوق کی ادبی محفلیں، کالجوں کے مشاعرے اور مباحثے ہائے ہائے کیسے سہانے اور پُر بہار دن، ہم نے اکٹھے گزارے تھے۔ اور اب:

دل کو تمہارے قدموں کی آہٹ پہ رکھ دیا
آنکھوں کو انتظار کی چوکھٹ پہ رکھ دیا

آج ۱۱۔ مارچ ۲۰۱۶ء جمعتہ المبارک مارچ کی اس پُر بہار صبح کا استقبال تم شہر خموشاں میں کر رہی ہو۔ پرندوں کی رسیلی آوازیں اور پھولوں کی بھینی بھینی خوشبو تمہارے آس پاس بکھری ہوتی ہے۔ رات بھر بارش برستی رہی۔ گرد و غبار سے دھلی دھلائی حسین کائنات ہے۔ میں اپنی بیٹی فرح کے گھر ہوں۔ کھڑکی سے باہر کا حسین منظر دیکھ رہی ہوں۔ تمہاری میٹھی میٹھی حسین یادیں اُمڈ اُمڈ کر آ رہی ہیں اور میں دھیمے دھیمے آنسو بہا رہی ہوں۔ بچھڑنے والوں کے لیے رونا بھی آسودگی اور طمانیت بخشتا ہے۔

جانے والے کبھی نہیں آتے     جانے والوں کی یاد آتی ہے

اس وقت میرے کانوں سے تمہاری مانوس آواز ٹکرا رہی ہے ''فوزیہ۔۔۔ فوزیہ۔۔۔ اِدھر آؤ۔۔۔ دیکھو تو یہ میری دوست لدی پھندی آ جاتی ہے ہر بار۔۔۔ ایسا نہ کیا کرو۔ یہ سراسر تکلف ہے۔''

تو میں ہنس کر کہتی۔۔۔ مسز مرزا یہ ریت بھی ہے اور پریت بھی۔ پھر فوزیہ چائے بھرے مگ ہمارے بوڑھے ہاتھوں میں تھما دیتی تو میں بے ساختہ کہہ اٹھتی ''خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔'' واہ۔۔۔ میرا اور تمہارا پسندیدہ علاقہ۔۔۔ تمہارے بھتیجے عزیز کا گھر ہمارا ٹھکانہ۔۔۔ اسلام آباد سے واہ بذریعہ کار آنا جانا ان کے ذمہ تھا۔ عارفہ اور عزیز کی مہمان نوازی آج بھی دل پر مہکتے گلستان میں گھومتے پھرتے رہنا۔ مشرق سے ابھرتے سورج کی پہلی کرنوں میں چاشنی ایک شخص کی مخصوص ورزش دیکھتے ہم دونوں رک جاتیں اور خوب لطف اندوز ہوتیں۔ ہم دونوں بھی گہرے گہرے سانس لیتیں آگے نکل جاتیں۔ سیر سے واپس آتیں تو عارفہ توانائی سے بھرپور ناشتہ پیش کرتی اور ہم دونوں خوب رغبت سے کھاتیں۔ بے فکری کے سہانے دن

گلشن کی بہاروں میں۔ رنگین نظاروں میں
جب تم مجھے ڈھونڈو گے آنکھوں میں نمی ہوگی

تمہاری شخصیت میں بے باک صداقت تھی جو مصلحت سے مبرّا تھی بصیرت کا سرچشمہ تھی۔ اور آج یہ کیسا تجربہ ہے۔ دیکھتے دیکھتے بصیرت سے پُر ایک آواز کا رنگ خاموشی کے رنگ میں تحلیل ہو گیا۔

ہاں تمہارے ایک خاص شغل کا تو میں ذکر کرنا ہی بھول گئی۔ دھجیوں (کپڑے کی کترنیں) کو مشین سے جوڑ جوڑ کر مختلف کارآمد چیزیں بنانا۔ تمہارا من پسند کام۔

کون کہتا ہے فرشتہ ہوں میں     آدمیت میرا حوصلہ ہے

خلد آشیاں دوست۔۔۔ تم نے صاف ستھری زندگی گزاری۔ بلکہ ہمیشہ سادہ قناعت پسندانہ زندگی گزاری۔۔۔ مشکل تو ہر کام ہے لیکن کرنے والے کر جاتے ہیں۔ تمہیں اسلامی تہذیب اور مسلم ثقافت سے بڑا پیار تھا تمہارے سوچنے کا انداز، بات کرنے کا طریقہ اور زیست کرنے کا قرینہ بالکل اسلامی تہذیب کا علم بردار ہوتا تھا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

## ''پاپل بُل''

برطانیہ کے قریب پانچ لاکھ شہری 2 ستمبر کو نیند کی آغوش میں جانے کے بعد 14 ستمبر کی صبح بیدار ہوئے۔ دراصل 1582 میں پوپ گریگوری دہم جب اپنے عہدے کی جانشینی کے بعد دسویں برس میں تھے تو انہیں ایسٹر کے تعین میں دشواری کا سامنا تھا۔ اُس وقت ایک برس 365 دن اور 6 گھنٹے کا ہوتا تھا جبکہ اصل میں ایک سال 365 دن 5 گھنٹے اور 49 منٹ کا ہوتا ہے۔ ایک ہزار تین سو برس میں یہ اضافی وقت کافی بڑھ گیا چنانچہ 24 فروری 1582 میں پوپ گریگوری نے ایک حکم نامہ جاری کیا جسے تاریخ میں ''پاپل بُل'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی کی رو سے چرچ کی عملداری میں آنے والے تمام علاقوں میں قریب بارہ دن تاریخ سے حذف کر دیئے گئے چنانچہ اسپین، اٹلی کے بڑے حصے نیدر لینڈ، فرانس، پرتگال، لکسمبرگ، پولینڈ اور لتھوانیا نے گریگوری کا پاپل بُل تسلیم کر لیا۔ آسٹریا، سوئٹزر لینڈ، جرمنی، ہنگری اور پروشیا (جرمن ایمپائر میں شامل دیگر ممالک) نے 50 برس میں گریگورین کیلنڈر کو اپنا لیا ہے۔

## ''عمر قید''

افریقی ملک اریٹیریا میں مردوں کی تعداد کم ہونے کے سبب بیک وقت دو شادیاں کرنے کا سرکاری فرمان جاری کر دیا گیا ہے۔ ذرائع کے مطابق اریٹیریا کی حکومت کی طرف سے ہر مرد کو کم سے کم دو شادیاں کرنے کا پابند کیا گیا ہے اور جو مرد اس پابندی کی خلاف ورزی کرے گا اسے عمر قید کی سزا دی جائے گی۔

# ''نوعِ بشر''

## یاسیّدِ اُمّ القریٰ
(بعداز خدابزرگ توئی قصہ مختصر)

شاہین
(کینیڈا)

نہیں تجھ سے بڑا
بعداز خدا
یاسیدِام القریٰ

ناظر،نظارہ اورنظر
ہرایک اپنے اوج پر
بامِ ثریا سے پرے
کس والہانہ شوق سے
منزل تھی تیری منتظر
ایسی کشش!ایسا سفر!
اے عارفِ غارِ حرا...
کوئی نہیں تجھ سے بڑا
بعداز خدا
یاسیدِام القریٰ

تو رحمت اللعالمیں
تو قاطعِ تشکیک وظن
نوعِ بشر کا بانکپن
وہ تیری چپ ہو یا سخن
تیرا پیامِ جاوداں
یہ احترامِ جان وتن

ہرقول لاثانی ترا...
کوئی نہیں تجھ سے بڑا
بعداز خدا
یاسیدِام القریٰ

حد سے بڑی میری انا
ہرسانس میری اک خطا
میرے گنہ بے انتہا
حالات جب بھی سخت تھے
کوئی نہ تھا جب آسرا
دیوانہ میں ہشیار میں
تیرے ہی در پر آ گرا...
کوئی نہیں تجھ سے بڑا
بعداز خدا
یاسیدِام القریٰ

اقرا سے تیری ابتدا
اورتو مدینہ علم کا
اک آرزو بس اک دعا
روشن رکھے میرا دیا
تیرے مدینے کی ہوا
اُمی لقب،خیرالوریٰ...
کوئی نہیں تجھ سے بڑا
بعداز خدا
یاسیدِام القریٰ

# ''میرے پُرکھے''

ڈاکٹر دُشینت (بھارت)

ہندی سے ترجمہ: رینو بہل

میرے پُرکھے رہتے تھے سرحد کے اُس پار کہیں
میرے بچے رہتے ہیں سرحد کے اِس پار کہیں
تیرے پُرکھے رہتے تھے سرحد کے اِس پار کہیں
تیرے بچے رہتے ہیں سرحد کے اُس پار کہیں

تُم جیتو یا ہم جیتیں جنگ میں نسلیں ہار گئیں
بارودوں سے کھیتوں کی پکتی فصلیں ہار گئیں

یاد نہیں کیا سرحد پر سپنے ہوتے ہیں چھلنی
بھول گئے کیا پھر نسلیں صدیوں رہتی ہے روتی

ریڈ کلف نے خنجر سے کی ایسی دیوار کھڑی
دیکھو تو پھر سرحد پر فوجیں ہیں تیار کھڑی
تُم جیتو یا ہم جیتیں جنگ میں نسلیں ہار گئیں

جنگ کہیں بھی جنگ کبھی بات کا حل دیتی ہیں کیا؟
توپوں کی آواز بھی بہتر کل دیتی ہیں کیا؟

منظر چاروں اور ملے اپنوں کی خوں ریزی کا
ہتھیاروں کی منڈی میں کھیل ہے ضدی تیزی کا
تم جیتو یا ہم جیتیں جنگ میں نسلیں ہار گئیں

نفرت پالی اور پھینکے یادوں کے صندوق کہیں
تب جا کر آئی ہے ان ہاتھوں میں بندوق کہیں
آنے والی نسلوں کو دینگے کیا سوغات یہاں؟
اُجلے اُجلے سے دن یا کالی کالی رات یہاں
تُم جیتو یا ہم جیتیں جنگ میں نسلیں ہار گئیں

میرے پُرکھے رہتے تھے سرحد کے اُس پار کہیں
میرے بچے رہتے ہیں سرحد کے اِس پار کہیں
تیرے پُرکھے رہتے تھے سرحد کے اِس پار کہیں
تیرے بچے رہتے ہیں سرحد کے اُس پار کہیں

## ایک واقعہ

یوگیندر بہل تشنہ
(دہلی، بھارت)

صبح تڑکے سیر کو جاتا ہوں بلاناغہ کیے
صحت کی دولت ملے، طبیعت بھی خورشید رہے
ایک معززاک بہی خواہ نے کہاجب سیرکوجایا کریں
تشنہ صاحب اک چھڑی بھی ہاتھ میں رکھا کریں
احتیاط لازم ہے عمر کے اس دور میں
ناگہاں آوارہ سنگ گھیرلے تو دھمکا سکیں
معالج کا کہنا تھا کہ ایک آوارہ کتیا نے میرا
دبے پاؤں تعاقب کیا، اور ٹخنے پر مجھے کاٹا
میں نے اُس کا کچھ زیاں تو نہ تھا کیا البتہ
پچھلے کسی غم کے گلے شکوے کا لیا ہوگا بدلہ
مجھکو اُس کے کاٹنے پر انجکشن تو لگوانا پڑا
مزید دس دن تک اُس کا خیال رکھنا تھا
اس دوران وہ پاگل ہوئی یا اگر مر گئی
مجھکو لگوانے پڑیں گے اور بھی انجکشن کئی
تشنہؔ تم تو چست و ہوشیار تھے ہر طرح
پھر آوارہ کتیا سے کھائی مات کس طرح

○

## اوصافِ حمیدہ

ڈاکٹر ریاض احمد
(پشاور)

اک ولولۂ تازہ دیا اُس نے دلوں کو
اقبال جو رہتا تھا کبھی اپنے وطن میں
گو اس سے ملا قوم کو اک دیس سہانا
پر قائد اعظم نہ رہے پاک وطن میں
پھر قائد ملت نے بھی اک مدّا دکھا کر
اک جوش وجنوں پیدا کیا سارے وطن میں
جب قائد ملت نے بھی خوں اپنا بہایا
اک اور خلا پیدا ہوا اپنے وطن میں

صد حیف کہ جو قائد امت تھے وطن میں
سب چھوڑ گئے قوم کو لاچار وطن میں
اغیار کے ہاتھوں میں ہے ملت کا مقدر
اک خالد وقاسم کہیں آجائیں چمن میں
پھر غیرتِ ملی کو جگا دے کوئی غوری
جذباتِ شجاعت ہی نظر آئیں وطن میں
لوٹ آئے پھراک دورِ عمرؓ۔شان ہوجس میں
اسلاف کی روح جاگ اُٹھے پھر سے چمن میں

گم گشتہ دیانت و صداقت جو کبھی تھی
وہ عظمتِ رفتہ بھی پلٹ آئے وطن میں
رہبر بھی ہوں درویش۔ مگن قوم کے غم میں
اوصافِ حمیدہ بھی سما جائیں وطن میں
ہر فرد ہو ملت کے مقدر کا محافظ
پھر قوم پہ دائم رہے اک سایہ امن میں
تنظیم ہو۔ وحدت ہو۔ اصولوں پر عمل ہو
ہر فرد سنور جائے ریاضؔ۔ اپنے وطن میں

# میرے لوگ تابوتوں میں گھر لوٹتے ہیں

ڈاکٹر جواز جعفری
(لاہور)

شہر میں
نفرت سے بھرا ایک جسم گھومتا ہے
جس کی موجودگی سے
لشکر دہل رہے ہیں
وہ جنّت کی تمنا میں
میرے شہر کو دوزخ بنانا چاہتا ہے
پیغمبروں کی سرزمین
پوری دُنیا میں کھنڈر تقسیم کر رہی ہے!
میں خواب میں
اپنے بچوں کی لاشوں کے پُرزے چُنتا ہوں
میرے لوگ
اپنے قدموں پر چل کر گھروں سے نکلتے ہیں
اور اوندھے تابوتوں میں واپس لوٹتے ہیں
شہر میں گورکنی کا موسم عروج پر ہے!
میرے پاس ایک قلم ہے
جس کی روشنائی سے
میں زخموں کے لیے مرہم تیار کر سکتا تھا
مگر میں اپنے قلم سے
دوسروں کے دل چھیدتا ہوں!
میرے شہر میں
آسمان سے خوف برستا ہے
(یہ آلودگی کی ایک نئی قسم ہے)
میری گلیاں
خوف اور رنج سے اَٹ گئی ہیں!

❍

# اے فقیہِ شہر!

ڈاکٹر انیس الرحمٰن
(سکھر)

اے فقیہِ شہر تیری علمیت کی خیر ہو!
تیرے فتووں نے سجائی ہے عداوت کی بہار!
تیری تقریروں سے چاہت کا جہاں ہے شعلہ بار!
تیرے نعروں نے دلوں میں نفرتوں کے بیج بوئے،
تیرے پیغامِ بقا نے پھونک ڈالا ہے جہاں،
تیری آوازوں پہ لپکے جاں نثار و باوفا!
تیرے ابروؤں کی جنبش نے انہیں راغب کیا،
تیری تحریروں نے چمکائے مقدر شوق کے،
تیری صحبت نے انہیں سمجھایا جینے کا طریق،
تیری نسبت نے انہیں جذبہ شہادت کا دیا،
تیری تسکیں کے لیے جھپٹے وہ اپنے لوگوں پر،
تیرے وعظوں نے انہیں اس بات پر مائل کیا،
روند ڈالیں اس وطن کو طاقتوں کے زعم میں!
چھین لیں جینے کا حق اہلِ زمیں کے ہاتھ سے!
ہے یہی سچائی لیکن!
اب سے پہلے دور کی
کس قدر دلکش تھی دنیا!
کتنے تھے خوش حال لوگ!
لیکن اب ہر گام ہیں آنسو،
ہر طرف ہے سوگ ہی سوگ!
تیرے فتوے مستقل ہیں!
اس جہاں کا ایک روگ!!
اے فقیہِ شہر! تیری علمیت کی خیر ہو!

❍

## کل کی کھیتی

فیصل عظیم
(کینیڈا)

بے شجر میدان میں آنکھیں سکوڑے
چلچلاتی دھوپ میں جھلسا بدن'
خود رو لکیریں چہرے پہ' ماتھے پہ بنتی اور سمٹتی'
دھول سر میں'
زیرِلب اک مسکراہٹ کی طرح سارے بدن کو گدگداتا'
طنز کرتا' پانی سا بہتا پسینہ۔۔۔۔
دور تک اک کھیت' عریانی سے بوجھل'
ڈھیر ہے بے پیرہن مٹی سے چمٹا۔۔۔۔
سرسراہٹ میں ہوا کی
تھوڑی سے حجّت ملا کر
پوچھتا ہے
کیا سواری آرہی ہے؟
ساری فصلیں کب کی کاٹی جا چکی ہیں
اک تھکے ہارے مسافر کی طرح
گندم کی بالیں
ہانپ کر بے سُدھ پڑی ہیں۔۔۔۔

سائل اور مسئول اک چہرے میں گم ہیں
اور وہ مجرم بنا اُس ڈھیر پہ گندم کے بیٹھا
راستے کو تک رہا ہے
انگلیوں سے اُس کے دانوں کو مسل کر
جانے کس سے پوچھتا ہے۔۔۔
کیا یہ کھیتی آخری ہے؟
سال بھر کی ہے کمائی۔۔۔
موسموں سے چھینا جھپٹی چھوڑ کر
اس آخری کھیتی کو پونجی جان لے'
یا ہل سنبھالے؟
جیتے رہنے کے لیے پھر
خود کو اس مٹی میں بوئے
اور سحر کو شام کرنے میں جو باقی عمر ہے
وہ بھی گنوا دے؟

چلچلاتی دھوپ ماتھے کی لکیروں
کو بدلتا دیکھ کر آنکھوں میں کچھ کرنوں کے نشتر
بھونک کر کہتی ہے اُٹھ جا۔۔۔۔۔۔۔
جا سواری آگئی ہے!

○

## خواب

شگفتہ نازلی
(لاہور)

کبھی کبھی ہم اپنے خواب۔۔۔
جن کو بُنتے جگ بیتیں۔۔۔
ہاتھ اٹھالیں اُن سے یُوں۔۔۔
جیسے کوئی حق ہی نہ تھا۔۔۔
اور اُن کو ورثے کی طرح۔۔۔
آنے والوں کے دیں سونپ۔۔۔
گویا اس ہی دن کے لیے۔۔۔
جذبوں کی خوشبوؤں سے۔۔۔
ہم نے انہیں مہکایا تھا۔۔۔
اور سوچوں کی وادی میں۔۔۔
پگ پگ پہ بکھرایا تھا۔۔۔!

## نیست ساز

وشال کھلر
(لدھیانہ، بھارت)

دبے کچلے ہوئے ہم لوگ
جب بھی تیر خنجر ہو نکلتے ہیں
تماشا عام کرتے ہیں
ہماری کانپتی آواز
سینوں پر برستی ہے
سناں بن کر
اجالے ریشمی چادر کو تانے
آ الجھتے ہیں ہواؤں سے
فضا میں ایک مدّھم لَو تھرکتی ہے
مگر کچھ دور
سائے پھیل جاتے ہیں
نظاریں جگمگاتے ہیں
دھواں ہو کر
مجالس دھوپ بُنتی ہیں

(۲)

دبے کچلے ہوئے ہم لوگ
جب بھی تیر خنجر ہو نکلتے ہیں
تماشا عام کرتے ہیں
سرابوں سے فضائیں
اپنا دامن چاک کرتی ہیں
سنہری دھوپ کا منظر
کلیجا چیر کر اپنا
دکھاتا ہے اُبلتا روپ سا اپنا
گلابی شام کے رخسار پہ
لالی تھرکتی ہے
پرندے موجزن ہو کر
بھٹکتے ہیں اڑانوں میں
اجالے دیر تک
اپنی قبائیں رنگ بھرتی ہیں
کسی اک موڑ پر ٹھہرا ہوا نغمہ
سُروں میں گنگناتا ہے
قلندر پھول چُنتا ہے
تو ٹہنی مسکراتی ہے

○

## نیا سال آ گیا ہے

ابراہیم عدیل (جھنگ)

خوشی کے ولولے لے کر نیا سال آ گیا ہے
بہاروں کے سمے لے کر نیا سال آ گیا ہے

گیا موسمِ عداوت کا کھلے غنچے وفا کے
چمکتے حوصلے لے کر نیا سال آ گیا ہے

ستاروں کے یہ جھرمٹ چاند سورج کی ادائیں
ہمارے واسطے لے کر نیا سال آ گیا ہے

دکھوں کی داستانیں چھیڑنا اچھا نہیں ہے
سہانے تذکرے لے کر نیا سال آ گیا ہے

حسیں کلیوں نئے پھولوں ہواؤں بادلوں کے
جلو میں قافلے لے کر نیا سال آ گیا ہے

عدیل اب شہر سے یہ خوف کے سائے ڈھلیں گے
کہ روشن سلسلے لے کر نیا سال آ گیا ہے

○

# ایک صدی کا قصّہ

## راجندر کمار

دیپک کنول (ممبئی، بھارت)

**سن** 1960 میں جب اپنے زمانے کے مشہور فلمساز اور ہدایت کار ایچ ایس رویل نے سادھنا کو اپنی اگلی فلم ''میرے محبوب'' میں کام کرنے کی پیشکش کی تو وہ پس وپیش میں پڑگئی کہ آیا وہ یہ فلم کرے یا نہ کرے۔ اسکی وجہ یہ تھی کہ ایچ ایس رویل کی گزشتہ فلم ''روپ کی رانی چوروں کا راجہ'' جس کے کلیدی رول میں دیو آنند اور وحیدہ رحمان تھے، بری طرح ناکام رہی تھی۔ بمبئی فلم کی یہ روایت رہی ہے کہ یہاں چڑھتے سورج کی پوجا کی جاتی ہے۔ ڈوبتے سورج سے سبھی بچ کے رہتے ہیں۔ ان حالات میں اُسکا فیصلہ لینا مشکل ہو رہا تھا۔ اُس نے اپنے دوست اور صلاح کار ہدایت کار رشی کیش مکھر جی سے صلاح مانگی۔ رشی مکھر جی نے اُسے یہ فلم کرنے کا یہ کہہ کر مشورہ دیا کہ اس فلم میں راجندر کمار کام کر رہا ہے اسلئے اُسے یہ فلم کرنی چاہیے۔ یہ تھا راجندر کمار کا جادو۔

راجندر کمار نے سیالکوٹ (پاکستان) کے ایک کاروباری شری لبھا رام تلی کے پریوار میں 12 جولائی 1929 کو جنم لیا۔ اُسکے دادا ملٹری کنٹریکٹر تھے جب کہ والد کپڑے کے کاروبار سے وابستہ تھے۔ 1947 میں جب ملک کا بٹوارہ ہوا تو راجندر کمار سب کچھ چھوڑ چھاڑ کے اپنے پریوار کے ساتھ انڈیا چلا آیا۔ اُسوقت اُسکی عمر اٹھارہ سال تھی۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ وہ بمبئی چلا آیا اور یہاں اُسنے گیت کار راجندر کشن کی وساطت سے ایچ۔ ایس۔ رویل کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرنا شروع کیا۔ وہ پانچ سال تلک ایچ۔ ایس۔ رویل کے ساتھ کام کرتا رہا۔ فلم ''پتنگا''، ''سگائی'' اور ''پاکٹ مار'' میں اُسنے معاون ہدایت کار کے طور کام کیا۔ ''پتنگا'' میں اُسنے چھوٹا سا کردار بھی ادا کیا۔ اسکے ادا کار نگار سلطانہ اور شیام تھے۔ اسی بیچ اُسنے کسی دوست کی وساطت سے کیدار شرما تک رسائی پائی جو اُسوقت فلم ''جوگن'' کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ اس فلم کے مرکزی کرداروں میں دلیپ کمار اور نرگس تھے جو اُس زمانے کے درخشاں ستارے تھے اور جن کا نام فلم کی کامیابی کی ضمانت سمجھا جاتا تھا۔ وہ بھی لاکھوں کروڑوں مداحوں کی طرح دلیپ کمار کا دیوانہ تھا۔ اُسنے دلیپ کمار کو اپنا آئیڈیل بنا رکھا تھا۔ وہ اپنے آدرش دلیپ کمار صاحب کے ساتھ کام کرنا چاہتا تھا۔ کیدار شرما نے اُسے فلم ''جوگن'' میں ایک چھوٹا سا رول دیا۔ وہ اس چھوٹے سے رول سے مطمئن تھا کیونکہ اُسے اپنے محبوب اداکار دلیپ کمار کو دیکھنے اور ملنے کا موقع ملا تھا۔ یہ فلم 1950 میں ریلیز ہوئی اور بہت کامیاب رہی۔

یہ فلمساز اور ہدایت کار دیوندر گوئل تھے جنھوں نے راجندر کمار میں چھپی ہوئی صلاحیتوں کو پہچانا اور اُنہوں نے اُسے اپنی اگلی فلم ''وچن'' میں بطور ہیرو سائن کیا۔ اس فلم میں کام کرنے کے لئے راجندر کمار کو پندرہ سو روپے بطور معاوضہ ملے۔ یہ فلم 1955 میں ریلیز ہوئی اور زبردست ہٹ ہوئی۔ وہ اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو اپنی فلم دکھانا چاہتا تھا۔ اُن دنوں تھیٹر کے سوا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا فلم دیکھنے کا۔ اُس نے پرڈیوسر سے بات کی۔ پرڈیوسر نے پوچھا کتنی ٹکٹیں چاہئیں۔ اُسنے سوچا ٹکٹیں مفت میں مل رہی ہیں سو اُس نے دس ٹکٹوں کی فرمائش کی۔ اُسے دس ٹکٹیں دی گئیں۔ اُسنے اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کو مفت میں اپنی فلم دکھائی۔ جب وہ اپنے معاوضہ لینے گیا تو پرڈیوسر نے دس ٹکٹوں کی قیمت اُسکے معاوضے کی رقم سے کاٹ لی۔ وہ پرڈیوسر کا منہ دیکھتا رہ گیا۔

''وچن'' کی کامیابی کو دیکھ کر فلمی پنڈتوں نے پیش گوئی کر دی کہ ایک ستارے کا جنم ہوا ہے۔ ''وچن'' کی کامیابی کے بعد راجندر کمار کو فلمیں ملنے لگیں۔ ''طوفان اور دیا'' (1956) ''آواز'' (1956) ''ایک جھلک'' (1957) میں ریلیز ہوئیں مگر یہ تینوں فلمیں راجندر کمار کو مقبولیت نہ دلا سکیں۔ یہ فلم ''مدر انڈیا'' تھی جس نے راجندر کمار کو شہرت بخشی۔ محبوب خان نے اس سے پہلے اُسے اپنی فلم ''آواز'' میں کاسٹ کیا تھا۔ راجندر کمار جو ''مدر انڈیا'' سے پہلے کم کم اور شیاما جیسی اداکاراؤں کے ساتھ کام کر چکا تھا، پہلی بار ہندی فلموں کی بلند و بالا اداکارہ نرگس کے بیٹے کا رول ادا کر رہا تھا۔ یہ فلم 1957 میں ریلیز ہوئی اور اس نے باکس آفس پر تہلکہ مچا دیا۔ اس فلم کی کامیابی کے بعد راجندر کمار نے فلم انڈسٹری میں اپنے پاوں پوری طرح جما لئے۔

یہ دور تین اداکاروں کا تھا۔ دلیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند کا۔ بیشتر فلم سازوں کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ دلیپ کمار کو اپنی فلم کے لئے سائن کر سکیں۔ بہت کم ایسے خوش قسمت تھے جن کی فلموں میں دلیپ کمار نے کام کرنے کی حامی بھرتے۔ اُن دنوں وہ بہت زیادہ مصروف تھے اور چنیندہ فلمیں ہی سائن کرتے تھے۔ ایسے میں راجندر کمار اُن فلمسازوں کے لئے ایک وردان ثابت ہوا جو اپنی حسرت پوری نہ کر سکے۔ وہ راجندر کمار میں ہی دلیپ کمار کی جھلک پانے لگے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ بیشتر اداکار دلیپ کمار کی نقل کر کے زندہ رہے۔ اُن میں ایک راجندر کمار بھی تھا۔ راجندر کمار کو دھڑا دھڑ فلمیں ملنے لگیں۔ اپنی الگ پہچان بنانے کے لئے اُسے نو سال تک انتظار کرنا پڑا۔ 1959 میں وجے بھٹ کی فلم ''گونج اُٹھی شہنائی'' نے راجندر کمار کی شہرت میں چار چاند لگا دئے۔ فلم نے ریکارڑ توڑ بزنس کیا۔ اس فلم میں راجندر کمار کی ہیروئن امیتا تھی۔

1960 سے راجندر کمار کے عروج کا دور شروع ہوا۔ بڑی بڑی ہیروئنیں جو راجندر کمار کے ساتھ کام کرنے پر تیار نہیں تھیں اب وہی ہیروئنیں اسکے ساتھ کام کرنے کے لئے اُتاولی ہوئی جا رہی تھیں۔ بڑے بینر جو راجندر کمار سے غافل تھے وہ بھی اب اُسے سائن کرنے لگے۔ سب سے پہلے بی آر چوپڑہ نے اُسے اپنی فلم ''دھول کا پھول'' کے لئے سائن کیا۔ اس فلم میں اُسکی ہیروئن مالا سنہا

تھی اور ساتھ میں جید اداکار اشوک کمار تھے۔ یہ فلم یش چوپڑہ کی ہدایت میں بنی تھی اور 1959 میں ریلیز ہوئی۔ فلم نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ ساحر لدھیانوی کا لکھا گانا ''تو ہندو بنے گا نہ مسلمان بنے گا'' ایک قومی ترانے کی طرح گایا جاتا ہے اور صدابہار گانوں کی فہرست میں صف اول پر شامل ہے۔ اس فلم نے سلور جوبلی منائی اور راجندر کمار کی کامیابی میں چار چاند لگادیئے۔ اسی سال راجندر کمار کی ایک اور فلم ریلیز ہوئی جس کا نام ''چراغ کہاں روشنی کہاں'' تھا۔ اسمیں مینا کماری اُسکی ہیروئن تھی۔ یہ ایک جذباتی فلم تھی جسمیں مینا کماری نے ناظرین کو خوب رلایا تھا۔ راجندر کمار اب بڑی بڑی ہیروئنوں کی پسند بنتا جا رہا تھا۔ بمبئی فلم انڈسٹری کا یہ چلن رہا ہے کہ اگر کوئی فلم کامیاب ہو جاتی ہے تو پھر اسی طرز کی فلمیں بننی شروع ہو جاتی ہیں۔ فلم ''چراغ کہاں روشنی کہاں'' کی کامیابی کے بعد راجندر کمار کی جھولی میں ایک کے بعد ایک گھریلو اور جذباتی فلمیں آنے لگیں۔ ''سنتان''، ''دو بہنیں''، ''پتنگا''، ''مہندی رنگ لائے گی''، ''ماں باپ'' اور ''دیور بھابی''۔ یہ فلمیں ساٹھ کی دہائی میں ریلیز ہوئیں اور خوب چلیں۔ 1960 میں ریلیز ہونے والی فلم ''قانون'' میں اُسکی اداکاری کو بیحد سراہا گیا، یہ ایک عدالتی ڈرامہ تھا جسے بی آر چوپڑہ نے ڈائرکٹ کیا تھا۔ اسمیں اُسکے معاون کلاکاروں میں اشوک کمار اور نندہ تھے۔ بی آر چوپڑہ نے اس فلم کو کافی محنت سے بنایا تھا۔ یہ فلم بنا گانے کے تھی۔ اسمیں نہ ہی کوئی رومانس تھا اور نہ ہی کوئی گانا پھر بھی یہ فلم دیکھنے والوں کو آخیر تک باندھ کر رکھتی تھی۔ اصل میں اس کا منظرنامہ کافی دمدار تھا۔

''قانون'' کے بعد راجندر کمار ساوتھ کے ہدایت کاروں کی نظر میں آگیا۔ مدراس کے جانے مانے فلم ساز ایل۔ وی۔ پرساد ہندی میں ایک فلم بنانے جا رہے تھے۔ جس کا نام ''سسرال'' تھا۔ اس فلم کے ہدایت کار ٹی۔ پرکاش راو تھے۔ موسیقی کی ذمہ داری شنکر جے کشن کو سونپی گئی تھی۔ ہیروئن کے لئے ساوتھ کی ہی ایک نامی ہیروئن بی سروجا دیوی کا انتخاب کیا گیا۔ فلم بنی اور 1961 میں ریلیز ہوئی۔ فلم نے ملک بھر میں دھوم مچائی۔ راجندر کمار لاکھوں کروڑوں دلوں کی دھڑکن بن گیا۔ فلم کی کامیابی دیکھ کر ساوتھ کے ہی مشہور فلمساز اور ہدایت کار اور جمنی فلمز کے بانی ایس۔ ایس۔ واسن نے اُسے اپنی تامل میں بنی فلم ''ماتھر کلامنی چکنم'' کو ہندی میں بنانے کا فیصلہ کیا۔ اس فلم کا نام ''گھرانہ'' رکھا گیا۔ اس فلم کے لئے راجندر کمار ،آشا پاریکھ اور راجکمار کو سائن کیا گیا۔ اسکا سنگیت روی نے ترتیب دیا۔ ''حسن والے تیرا جواب نہیں'' اسی فلم کا صدابہار گانا ہے۔ یہ فلم بھی کامیابی کی مثال بنی۔ یہ فلم بھی 1961 میں ریلیز ہوئی۔ 1961 کا سال راجندر کمار کے لئے ظفریابی کا سال تھا اُسکی ایک نہیں چھ فلمیں ایک ساتھ ریلیز ہوئیں۔ یہ فلمیں تھیں ''زندگی اور خواب''، ''پیار کا ساگر''، ''امر رہے یہ پیار'' ''سسرال'' ''گھرانہ'' اور ''آس کا پنچھی''۔ ایک آدھ فلم کو چھوڑ کے باقی سب فلموں نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیئے۔ اُسکی فلموں کی کامیابی دیکھ کر راجندر کمار کا نام جوبلی کمار پڑ گیا۔

سن 1963 میں اُسکی دو فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''میرے محبوب'' اور ''دل ایک مندر''۔ ایک مسلم سوشل ڈرامہ تھا اور دوسری فلم ایک جذباتی تکونی پریم کہانی تھی جسمیں راج کمار اور مینا کماری نے اپنی دمدار اداکاری سے جان ڈال دی تھی۔ ''میرے محبوب'' نے تو بزنس کے اگلے پچھلے سارے ریکارڈ توڑ ڈالے۔ اس فلم میں فلمی ساحرہ سادھنا نے ناظرین کو اپنے حسن و شباب سے مسحور کر کے رکھ دیا تھا۔

راج کپور ایک تکونی پریم کہانی پر فلم بنانا چاہتے تھے۔ اس فلم کی تحریک راج کپور کو فلم ''انداز'' میں کام کرتے ہوئے ملی تھی۔ کاسٹ پہلے سے طے تھی۔ دلیپ کمار۔ راج کپور اور نرگس۔ کہانی کا عنوان ''سنگم'' رکھا گیا۔ جب وہ فلم پر کام کرنے لگے تو راج کپور نے دلیپ صاحب سے ملاقات کر کے اُنہیں فلم میں کام کرنے کی پیشکش کی۔ دلیپ صاحب نے کام کرنے پر رضامندی تو ظاہر کی البتہ شرط یہ رکھی کہ ہدایت کاری وہ نہیں کریں گے بلکہ کوئی اور کرے گا۔ راج کپور کو دلیپ کمار کی یہ شرط پسند نہیں آئی۔ راج صاحب نے دلیپ کمار کی جگہ راجندر کمار کو اس فلم میں کاسٹ کیا۔ نرگس کی جگہ اُنہوں نے وجینتی مالا کو لے لیا۔ فلم بڑے پیمانے پر بنائی گئی۔ یہ فلم بیحد کامیاب رہی۔ اسی سال راجندر کمار کی دو اور فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ایک تھی موہن کمار کی ''آئی ملن کی بیلا'' اور دوسری فلم تھی ''جمنی فلمز کی ''زندگی'' جسے رامانند ساگر نے لکھا تھا اور وہی اسے ڈائرکٹ بھی کر رہے تھے۔

موہن کمار راجندر کمار ''آس کا پنچھی'' میں ایک ساتھ کام کر چکے تھے۔ یہ جے اوم پرکاش کی فلم تھی جسکے ہدایت کار موہن کمار تھے۔ اس فلم نے راجندر کمار کی مقبولیت میں چار چاند لگائے تھے۔ دونوں بڑے اچھے دوست بن چکے تھے۔ ''آئی ملن کی بیلا'' اُنکی دوسری فلم تھی جو وہ ساتھ میں کر رہے تھے۔ اس فلم کے لئے سائرہ بانو کو ہیروئن کے رول کے لئے چنا گیا۔ فلم کی شوٹنگ جوں جوں بڑھتی گئی دونوں ایک دوسرے کے عشق میں مبتلا ہونے لگے۔ سائرہ کو ملکہ حسن کہا جاتا تھا۔ الہڑ، چلبلی نازک اندام سائرہ بانو، لاکھوں کروڑوں دلوں کی دھڑکن بن چکی تھی۔ راجندر کمار بھی کافی خوبصورت تھا۔ اُسکی مسکراہٹ دیکھنے والے کا کلیجہ نکال کے رکھ دیتی تھی۔ یہ وہ دور تھا جب راجندر کمار بلندیوں کے ساتویں آسمان پر تھا۔ اُسکی خوش نصیبی کا یہ عالم تھا کہ وہ جس چیز کو چھوتا تھا وہ سونا ہو جاتا تھا۔ سائرہ بانو بھی راجندر کمار کی شخصیت سے متاثر ہوئے بنا نہ رہ سکی۔ وہ یہ بات اچھی طرح جانتی تھی کہ راجندر کمار شادی شدہ ہے۔ اُسنے فلساز ہدایت کار اور اداکار راو۔ پی۔ رلہن کی بہن شکلا دیوی سے برسوں پہلے بیاہ رچایا تھا۔ اُنکے تین بچے تھے۔ دو لڑکیاں اور ایک لڑکا۔ وہ کہتے ہیں نا کہ عشق نہ جانے جات کجات۔ یہ سب جاننے کے باوجود سائرہ بانو راجندر کمار کو دیوانگی کی حد تک چاہنے لگی۔ یہی حال راجندر کمار کا تھا۔ وہ بھی اپنے بال بچوں کو سائرہ بانو کے لئے چھوڑنے کو تیار تھا۔ دونوں چپ چاپ ملتے رہے اور پیار کی پینگیں بڑھاتے رہے۔ فلم ''آئی ملن کی بیلا'' نے زبردست کامیابی حاصل کی۔

راجندر کمار نے سائرہ بانو کے ساتھ کل ملا کر تین فلمیں کیں۔'' آئی ملن کی بیلا''،'' جھک گیا آسمان'' اور'' امن''۔ یہ تینوں فلمیں موہن کمار کے بینر تلے بنی تھیں۔ کہتے ہیں عشق اور مشک چھپائے نہیں چھپتے۔ جب یہ خبر فلمی حلقوں میں گشت کرنے لگی کہ سائرہ بانو راجندر کمار سے شادی کرنے والی ہے تو سائرہ بانو کی ماں کے کان کھڑے ہو گئے۔ ایک مسلم لڑکی کا ایک ہندو لڑکے سے شادی کرنا اُسے کسی قیمت پر بھی گوارہ نہ تھا۔ وہ بھی ایک شادی شدہ مرد کے ساتھ۔ اُسنے فوراً اس سلسلے پر قدغن لگانے کا فیصلہ کیا۔ اُسنے سائرہ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ مگر نتیجہ ڈھاک کے تین پات نکلا۔ راجندر کمار کا پیار اُسکے سر چڑھ کے بول رہا تھا۔ نسیم بانو کو ایک ترکیب سوجھی۔ سائرہ بانو دلیپ کمار کی زبردست مداح تھی۔ جب ''مغلِ اعظم'' کے پریمیر پر وہ اپنی ماں کے ساتھ میٹرو ٹاکیز چلی گئی تو وہ دلیپ کمار کو ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی۔ اُسکی خوشی اسوقت مایوسی میں بدل گئی جب دلیپ کمار پریمئر پر نہیں آئے۔ نسیم بانو نے سوچا کی اگر دلیپ کمار سائرہ سے نکاح کرنا مان لے تو سائرہ بانو کے سر سے عشق کا بھوت خود بخود اُتر جائے گا۔ اُسنے دلیپ کمار سے رابطہ کیا اور اُسکے سامنے سائرہ سے شادی کرنے کی پیشکش رکھ دی۔ نسیم بانو اور دلیپ کمار کے تعلقات بڑے دوستانہ تھے۔ نسیم بانو دلیپ کمار کے ساتھ ایک فلم میں کام کر چکی تھی اسلئے وہ دلیپ کمار سے کافی مانوس تھی۔ وہ فوراً تیار ہو گئے۔ دونوں کا نکاح ہو گیا۔ اُنکا فارمولہ کامیاب رہا۔ شادی کے ساتھ ہی سائرہ بانو نے راجندر کمار کو اپنے دل سے نکال کر پھینک دیا۔

رامانند ساگر ایک اچھے فلم ساز اور ہدایت کار ہی نہیں اچھے لیکھک بھی تھے۔ اُنہوں نے کئی کامیاب فلمیں لکھیں۔ فلم ''برسات'' سے اُنہوں نے اپنا فلمی سفر شروع کیا۔ جمنا فلمز کی'' زندگی'' کی کامیابی کے بعد اُنکے حوصلے کافی بلند تھے۔ اس فلم میں راجندر کمار کے علاوہ پرتھوی راج کپور اور جینتی مالا نے اپنی دم دار اداکاری سے ناظرین کو مسحور کر کے رکھ دیا تھا۔ جیسے کہ ہر ہدایت کار کی یہ آرزو ہوتی ہے کہ اُسکا اپنا فلمی بینر ہو جسکے تحت وہ اپنی من پسند فلمیں بنا سکے۔ رامانند ساگر کے دل میں بھی برسوں سے یہ تمنا انگڑائیاں لے رہیں تھیں کہ وہ اپنا پروڈکشن کھولیں اور اپنے بینر تلے اپنی پسند کی فلمیں بنائے۔ ایک دن اُنکی یہ حسرت پوری ہو گئی۔ اُنہوں نے ایک فلم بنانے کا فیصلہ کیا۔ فلم کا نام'' آرزو'' تھا۔ یہ کشمیر کے پس منظر میں لکھی گئی ایک پریم کہانی تھی۔ راجندر کمار کے ساتھ وہ کام کر چکے تھے اور ایک کامیاب فلم دے چکے تھے اسلئے راجندر کمار اُن کی جھولی میں تھا۔ راجندر کمار کی معرفت سادھنا کو سائن کیا گیا۔ ساتھ میں ایک منفی کردار کے لئے فیروز خان کا چناو کیا گیا۔ اس فلم کو اپنی سحر انگیز دھنوں سے شنکر جے کشن نے آراستہ کیا۔ کشمیر کی خوبصورتی۔ شنکر جے کشن کی موسیقی اور راجندر کمار اور سادھنا کی دم دار اداکاری نے فلم میں چار چاند لگا دئے۔ فلم نے بے پناہ کامیابی حاصل کی۔ رامانند ساگر کے گھر میں ہن برسنے لگا۔ یہ فلم 1965 میں ریلیز ہوئی۔ ہند و پاک جنگ چھڑنے کے باوجود اس فلم کے بزنس پر کوئی خاصا اثر نہیں پڑا۔ ایسا جادو تھا راجندر کمار کا۔

راجندر کمار اُس شان کو واپس لانا چاہتا تھا جو وہ پاکستان میں چھوڑ کے آیا تھا۔ وہ ایسا ہی بنگلہ بمبئی میں خریدنا چاہتا تھا جیسا بنگلہ اُنکے پاس پاکستان میں تھا۔ راجندر کمار نے پالی ہل (باندرہ) پر ایک بنگلہ دیکھا۔ بنگلہ خوب پسند آیا پر دوستوں نے اُسے یہ کہہ کے ڈرایا کہ یہ بھوت بنگلہ ہے۔ یہاں کوئی ٹھہر نہیں پاتا ہے۔ راجندر کمار نے ٹھان لی تھی کہ کچھ بھی ہو وہ اس بنگلے کو خرید کے رہے گا۔ سب سے بڑا مسلہ یہ تھا کہ اسے خریدنے کے لئے اُسکے پاس پورے پیسے نہیں تھے۔ یہ بات جب بی۔ آر۔ چوپڑہ کو معلوم پڑ گئی تو وہ فوراً مدد کے لئے آگے بڑھے۔ اُنہوں نے راجندر کمار کو پیشگی رقم دے کر اُسکی مشکل آسان کر دی۔ اُسوقت راجندر کمار چوپڑہ صاحب کی فلم'' قانون'' میں کام کر رہا تھا۔ راجندر کمار نے اس بنگلے میں پوجا پاٹھ کروا کے اسکا نام اپنی بیٹی ڈمپل کے نام پر رکھ دیا اور پھر وہ یار دوستوں کے منع کرنے کے باوجود اس بنگلے میں منتقل ہو گئے۔ بنگلے میں منتقل ہونے کے بعد راجندر کمار کے دن پھر گئے۔ وہ بلندیوں کو چھونے لگا۔ برسوں بعد یہ بنگلہ جب بکا تو اسے راجیش کھنہ نے خریدا۔ اُس نے اس بنگلے کا نام ڈمپل سے بدل کر آشیرواد رکھ دیا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ اس بنگلے میں منتقل ہونے کے بعد راجیش کھنہ کے نصیب نے ایسی کروٹ لی کہ وہ شہرت کی معراج کو چھو گیا۔

''سورج'' ساوتھ کی ہندی فلم تھی جسکے ہدایت کار ٹی پرکاش راو تھے اور جسکی ہیروئن وجینتی مالا تھی اور موہن کمار کی ہدایت میں بننے والی فلم ''انجانا'' جسکی ہیروئن ببیتا تھی، یہ دو فلمیں ہیں جو کامیاب رہی جب کہ بیشتر فلمیں اتنی کامیاب نہ رہ سکیں، جیسے'' تلاش''،'' شطرنج''،'' پالکی''،'' ساتھی''،'' میرا نام جوکر''۔ راجندر کمار کا جادو ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔ رامانند ساگر اور موہن کمار کو ابھی بھی اُس کی مقبولیت کا احساس تھا، رامانند ساگر نے اسکے لئے فلم'' گیت'' بنائی جو کامیاب رہی۔ اسی موہن کمار نے فلم'' آپ آئے بہار آئی'' سادھنا کے ساتھ بنائی جو بیحد کامیاب رہی۔'' گیت'' 1970 میں اور'' آپ آئے بہار آئی'' 1971 میں ریلیز ہوئی۔ ایک طرف اُسکی چمک ماند پڑتی جا رہی تھی تو دوسری طرف ایک نئے ستارے کا ظہور ہو رہا تھا جس کا نام راجیش کھنہ تھا۔

1972 سے راجندر کمار کی چمک دمک پھیکی پڑنے لگی۔ اُسکا جادو ٹوٹ گیا۔ اُسکی فلمیں ایک کے بعد ایک ناکامی کا منہ دیکھنے لگیں۔'' تانگے والا''،'' گورا اور کالا''،'' گاوں ہمارا شہر تمہارا''،'' آن بان'' اور'' للکار''۔ یہ سبھی فلمیں اس سال ریلیز ہوئیں۔ ان میں'' للکار'' کو چھوڑ کے ایک بھی فلم نہیں چلی۔ راجندر کمار کا جادو اُتر چکا تھا۔ اُسکی جگہ راجیش کھنہ نے لی تھی۔ 1972 سے لے کے 1978 راجندر کمار کی درجنوں فلمیں ریلیز ہوئیں مگر ان میں سے ایک بھی نہیں چلی۔ وہ وقت کی آہٹ کو پہچان چکے تھے۔ 1978 کو ساون کمار کی فلم'' ساجن بنا سہاگن'' ایک ایسی فلم تھی جو کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔ اسمیں وہ ہیرو کے رول میں نہیں بلکہ ایک اہم کردار میں تھے اور اُنکے مد مقابل نوتن تھی۔ اسی بینر تلے بننے والی ایک اور فلم'' او بے وفا'' بھی بیحد کامیاب

رہی۔اس فلم کا ہیرو سلمان خان تھا جب کہ راجندر کمار ایک کلیدی رول میں تھا۔

راجندر کمار کا بیٹا کمار گورو جوان ہو چکا تھا۔راجندر کمار کے نرگس اور راج کپور کے ساتھ بڑے نزدیکی تعلقات تھے۔مدر انڈیا میں وہ نرگس کا بیٹا بنا تھا جب کہ ''سنگم'' میں اُس نے راج کپور کے ساتھ کام کیا تھا۔راج کپور اس دوستی کو رشتہ داری میں بدل دینا چاہتے تھے۔وہ اپنی بیٹی ریما کا رشتہ راجندر کمار کے بیٹے کمار گورو سے کرنا چاہتے تھے۔یہاں تک کہ دونوں کی منگنی بھی ہوئی۔تقدیر کو کچھ اور ہی منظور تھا۔کمار گورو اور سنجے دت بڑے گہرے دوست تھے۔دونوں ایک دوسرے کے گھر بلا تکلف آیا جایا کرتے تھے۔اسی بیچ راجندر کمار کے بیٹے کمار گورو اور سنیل دت کی بیٹی نمرتا کی آنکھیں چار ہوئیں اور دونوں ایک دوسرے کو دل دے بیٹھے۔معاملہ اتنا آگے بڑھا کہ دونوں نے شادی کرنے کا فیصلہ کیا۔یہ خبر راج کپور کے لئے کسی صدمے سے کم نہ تھی۔راجندر کمار اور راج کپور کے رشتوں میں دراڑ پڑ گئی۔راجندر کمار نے اپنے بیٹے کو ہیرو بنانے کے لئے ایک فلم بنانے کا فیصلہ کیا جس کا نام ''لو اسٹوری'' رکھا گیا۔ایچ ایس رویل کی ہدایت میں بننے والی یہ فلم جسکی ہیروئن وجیتا پنڈت تھی اور موسیقی راہول دیو برمن نے دی تھی۔فلم کی شوٹنگ جب چل رہی تھی تو ہدایت کار اور فلم ساز کے بیچ کچھ غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں۔بات اتنی بڑھ گئی کہ راہول رویل کو فلم چھوڑنی پڑی۔باقی کی فلم راجندر کمار نے اپنی ہدایت میں پوری کی۔فلم بیحد کامیاب رہی۔کمار گورو کو خوب فلمیں ملنے لگیں مگر ''لو اسٹوری'' کو چھوڑ کے اُسکی ایک بھی فلم نہیں چلی۔ایک بار پھر باپ کو میدان میں اُترنا پڑا۔اُسنے مہیش بھٹ کو لے کے ایک اور فلم بنانے کا فیصلہ کیا جس کی کہانی سلیم جاوید نے لکھی تھی۔فلم کا نام ''نام'' رکھا گیا۔اسمیں کمار گورو کے علاوہ اُسکے سالے سنجے دت اور امرتا سنگھ کو بھی لیا گیا۔فلم جب بن کے تیار ہوئی تو سبھی نے سنجے دت کے رول کی خوب تعریف کی۔باپ نے جس مقصد سے فلم بنائی تھی اُس کا فائدہ اُسکے بیٹے کو نہیں بلکہ سنجے دت کو مل رہا تھا۔وہ یہ بات کیسے ہضم کر پاتے۔کہا جاتا ہے کہ راجندر کمار نے مہیش بھٹ سے کہا کہ وہ سنجے دت کے بیشتر سین کاٹ کے پھینک دے۔جب یہ بات کمار گورو کے کانوں تک پہونچی تو اُسنے احتجاج کیا۔یہاں تک کہ اُسنے اس فیصلے کے خلاف جان دینے کی بھی کوشش کی۔باپ کو بالآخر بیٹے کے آگے جھکنا پڑا اور فلم ریلیز ہوگئی۔فلم بے حد کامیاب رہی اور سب سے زیادہ کامیابی سنجے دت کی جھولی میں گئی۔

راجندر کمار پیسے کے معاملے میں بڑے کنجوس تھے۔جب ''نام'' کی شوٹنگ ہانگ کانگ میں چل رہی تھی تو امرتا سنگھ گھنٹوں اپنے رشتہ داروں کے ساتھ فون پر باتیں کیا کرتی تھیں۔یہ سارے بل پروڈکشن کے کھاتے میں جاتے تھے۔بقول شخصے جب امرتا سنگھ کا معاوضہ ادا کیا گیا تو اُسمیں سے ٹیلفون کے سارے بل کاٹ لئے گئے۔وہ فلم ''وچن'' کے واقعے کو بھولا نہ تھا۔

راجندر کمار کی بیٹی ڈمپل کی شادی ہالی وڈ کے فلمساز راجیو پٹیل کے ساتھ ہوئی ہے۔اُنکا بیٹا کرم پٹیل ایک ایکٹر ہے۔اُسنے ہالی وڈ کی فلم ''ڈرٹی گرم'' میں کام کیا ہے۔راجیو پٹیل کے والد شرد پٹیل ہالی وڈ کے ایک جانے مانے فلمساز اور ہدایت کار رہ چکے ہیں۔راجندر کمار نے ٹیلی ویژن سیریلوں میں بھی کام کیا۔ڈمپل تھیٹر کو بھی وہ تادم حیات چلاتے رہے۔اُسنے سو سے زیادہ فلمیں کیں جن میں سے پچیس سلور جوبلی ہٹ رہیں۔بطور فلمساز راجندر کمار نے چھ فلمیں بنائیں۔''لو اسٹوری''''لورس''''نام''''جرات''''پھول'' اور ''جنگل بک''۔''لو اسٹوری'' اور ''نام'' کو چھوڑ کے باقی سب فلمیں باکس آفس پر ناکام رہیں۔ٹی وی سیریل ''انداز'' اُنکا آخری پروگرام تھا جسمیں اُنہوں نے کام کیا۔1969 کو اُنہیں پدم شری کے اعزاز سے نوازا گیا۔اُنہوں نے پی ایچ ڈی کر کے ڈاکٹری کی ڈگری بھی حاصل کی تھی۔یہ بات کم لوگوں کو معلوم تھی کہ وہ کینسر کے موذی مرض میں مبتلا تھے۔وہ کوئی بھی دوائی لینے کے خلاف تھے۔وہ زندگی کے آخری لمحے تک جئے۔سگریٹ نوشی کے بڑے شوقین تھے۔جب بھی اُن سے ملاقات ہوتی تھی سگریٹ اُن کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔اپنے بچوں کو وہ دیوانگی کی حد تک چاہتے تھے۔12 جولائی 1999 کو راجندر کمار نے اس دنیا کو الوداع کہہ دیا۔

## ''کارخانۂ قدرت''

برطانوی میڈیا کے مطابق انڈونیشیا سے تعلق رکھنے والے شمس مہایا گوٹھو نامی شخص کو انڈونیشیا کی حکومت نے دنیا کا طویل العمر شخص تسلیم کر لیا ہے۔مہایا گوٹھو 31 دسمبر 1870ء کو پیدا ہوا جس کی تصدیق انڈونیشیا کی حکومت نے کر دی ہے۔مہابا گوٹھو کی چار بیویاں دس بیٹے اور سات بیٹیاں انتقال کر چکی ہیں۔جب اخباری نمائندوں نے مہابا گوٹھو سے اُس کی طویل العمری کا راز دریافت کیا تو اُس نے صبر اور برداشت بتلایا ہے۔یاد رہے مہابا گوٹھو نے 1992ء میں اپنی قبر کا کتبہ تیار کرا لیا تھا اُس وقت مہابا گوٹھو کی عمر 122 سال تھی گذشتہ تیئیس سال سے وہ اپنی موت کا منتظر ہے مگر کارخانۂ قدرت میں ابھی اُس کی زندگی باقی ہے۔

☆

## ''گلیکسی 710''

امریکی سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ دہکتا ہوا مدار ستارہ گلیکسی 710 تیزی سے ہماری دنیا کی جانب بڑھ رہا ہے جو نظام شمسی کے پہلے لگائے گئے اندازے سے کہیں زیادہ قریب آ جائے گا۔ایسٹرونامی جرنل میں شائع ہونے والی جدید تحقیق میں بتایا گیا کہ گلیکسی 710 اس وقت چونسٹھ لائٹ ایئرز کی دوری پر ہے۔ستارے کی سمت دنیا کی جانب ہے مذکورہ ستارہ دنیا سے ایک پوائنٹ دو ٹریلین مائلز کے فاصلے تک پہنچنے کے امکانات ہیں۔

# ''کھایا پیا کچھ نہیں''

**شوکت جمال**

(سعودی عرب)

ہوٹل میں کل گئے تو یہ سوچا کہ کھائیں کیا
بیگم سے ہم نے پوچھا کہ بولیں منگائیں کیا

بولیں سِکھانے کے لیے کیا یہ کنیز ہے؟
ہوٹل میں آگئے ہیں مگر کچھ تمیز ہے؟

ہوٹل کا احترام کریں، کچھ ادب کریں
لازم ہے سب سے پہلے تو مینو طلب کریں

انگلی کے اک اشارے سے ویٹر بھی آگیا
مینو جو ہاتھ میں تھا وہ مجھ کو تھما گیا

مینو کو اپنے سامنے پھر میں نے رکھ لیا
بیگم نے اتنی دیر میں کچپ ہڑپ کیا

چشمہ لگا کے مینو کو جب غور سے پڑھا
ہر ایک شے کا دام مجھے تو لگا چڑھا

بیگم کو پڑھ کے مینو سنانا تھا لازمی
یہ سلسلہ چلانا تھا آگے ہنسی خوشی

پوچھا شروع سلاد سے ہم کرلیں بھاگوان؟
بولیں ''کچر کچر'' سے پکائیں گے میرے کان

میں نے کیا جو دال فرائی کا کچھ بیاں
بولیں کہ میں تو آپ سے خاصی تھی خوش گماں!

تھوڑی بہت کریلے سے رغبت ہے آپ کو؟
کہنے لگیں کہ سوجھی شرارت ہے آپ کو

جب یہ کہا کہ بھنڈی یہاں کی لذیذ ہے
بولیں بھلا بتاؤ وہ کھانے کی چیز ہے؟

پھر میں نے ذکر چھیڑا جو پالک پنیر کا
تڑپیں وہ جیسے شعر پڑھا میں نے میرؔ کا

بولیں کہ جانتے نہیں طبّی معاملات
پتھری کا خوف رہتا ہے کھانے سے ساگ پات

میں نے کہا کہ گوبھی مٹر کھا کے دیکھ لیں
بولیں کہ ایسی چیزوں سے پرہیز ہی کریں

بریانی کا جو ذکر کیا اہتمام سے
تن من میں اُن کے آگ لگی اس کلام سے

فرمایا، ہو چکن کی، مٹن کی یا بیف کی
تعریف مت کرو کسی جنسِ لطیف کی

میں نے کہا یہاں ہے بہاری کباب بھی
بولیں کہ بیف کرتا ہے معدہ خراب بھی

بولیں نلی نہاری کا سن کر، ہے لاجواب
کولیسٹرول بڑھتا ہے لیکن مرے جناب

میں نے کہا کڑاہی مٹن اور چکن کی ہے
خوراک آج کل یہی ہر مرد و زن کی ہے

بولیں کہ مرچ تیز نہ ہو تو مزہ نہیں
اور تیز مرچ کھانے کا اب حوصلہ نہیں

پوچھا بتایئے تو سہی دونوں کھائیں کیا؟
مینو پڑا ہے سامنے، بولیں منگائیں کیا؟

بولیں، اُٹھیں یہاں سے، مرا ہے یہ مشورہ
چلتے ہیں، چل کے کھاتے ہیں برگر کسی جگہ!

○

# رس رابطے

جستجو، ترتیب، تدوین

**وجیہہ الوقار** (راولپنڈی)

عزیزِ گرامی قدر گلزار جاوید صاحب، تسلیمات۔

آپ نے ناچیز کے فن و شخصیت پر چہارسو کی ایک اشاعت مخصوص کر کے ادب دوستی کا ثبوت دیا ہے جس کے لیے دعائیں قبول کیجیے۔ آپ کے ہاں ترتیب اور پیشکش کا جو منفرد انداز ہے اُس کا میں دل سے قائل ہوں مگر شمارہ دیکھ کر کسی قدر تعجب بھی ہوا کہ آپ نے صرف ایک افسانہ شامل اشاعت کرنا کیوں ضروری سمجھا۔

**اقبال مجید** (بھوپال، بھارت)

عزیزِ محترم گلزار جاوید، سلام مسنون۔

تازہ چہارسو دستیاب ہوا۔ اس میں تو دو رائے نہیں کہ اقبال مجید ہمارے عصر کے ایک بڑے اور اہم افسانہ نگار ہیں۔ آپ نے اُن کی نسبت جو کاوش کی ہے اُس کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے مگر یہ بھی سچ ہے کہ اقبال مجید صاحب کی نسبت جتنا کچھ بھی کیا جائے وہ بھی کم ہی تصور کیا جائے گا۔ چہارسو کو قطرہ قطرہ یا کہہ لیجیے گھونٹ گھونٹ پڑھتا ہوں کیونکہ یہ میری دو ماہ کی فکری غذا ہے۔ اقبال مجید صاحب کے رشحاتِ قلم کے علاوہ آپ کا انٹرویو بھی پڑھ رہا ہوں البتہ آپ کا افسانہ ''بریکنگ نیوز'' پڑھ کر آپ کی جرأت اور بہادری کی داد دینا ضروری ہو گیا ہے۔ اتنے حساس موضوع پر قلم اٹھانا اور پھر اپنے ہی رسالے میں شائع کرنا بڑے دل گردے کا کام ہے۔ جمیل نقش صاحب کا ''نقش'' آپ نے جس طور ابھارا ہے وہ خاکے کا مزہ بھی دے رہا ہے۔

**حسن منظر** (کراچی)

میرے گلزار، سدا بہار رہو۔

تم نے چہارسو کو صحیح معنوں میں چہارسو کر دیا ہے۔ اقبال مجید صاحب کا انتخاب نہ صرف قابلِ داد قابلِ تحسین بھی ہے۔ نوجوانی سے بڑھاپے تک اُن کے افسانے پڑھے اور حظ اٹھانے کا موقع میسر رہا ہے۔ چہارسو کی زیرِ نظر اشاعت نے تمام پرانی یادوں کو یکجا کر کے احساسات میں نیا رنگ بھر دیا ہے جس کے لیے آپ اور اقبال مجید صاحب کے لیے بے شمار دعائیں۔

ہر بار کی طرح اس بار بھی افسانے بہت جاندار ہیں۔ بھائی نند کشور وکرم، جناب وقار بن الٰہی، محترمہ سلمٰی اعوان اور محترمہ سیمیں کرن کے افسانوں نے خاص طور پر متاثر کیا۔ آپ کا افسانہ ''بریکنگ نیوز'' ایک سے زائد بار پڑھنے کے باوجود انجام سمجھنے سے قاصر ہوں لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ آپ نے دہشت گردی کے موضوع کو ایک نئے انداز اور نئی تکنیک میں برت کر اپنے جذبات و احساسات کا خوب اظہار کیا ہے۔

ڈاکٹر فیروز عالم نے ترجمے میں جو رنگ باندھا ہوا ہے اُس کے لیے اُن کا منہ چومنے کو دل کرتا ہے۔ اسی طرح عزیزہ پروین شیر بھی چہارسو کو جس طرح اپنے تجربات اور منفرد طرزِ تحریر سے رونق بخش رہی ہیں وہ بھی لائق تحسین ہے۔ یہ تابش خانزادہ صاحب کی مثال تو وہی ہوئی کہ وہ آیا اُس نے دیکھا اور چھا گیا۔ سو میرے عزیز آج کل تو چہارسو میں تابش صاحب چھائے ہوئے ہیں میری طرف سے مبارک باد پہنچایئے۔ دیپک کنول صاحب نے تو میری عمر کے لوگوں کا دل نکال کے رکھ دیا۔ بھئی ساری جوانی نرگس اور اُن کی فلموں کے فراق میں گزری اب اُن کی بابت تفصیل سے پڑھا تو بہت ساری نئی معلومات مطالعے میں آئیں۔

آپ تو جانتے ہیں کہ نوشہرہ میرا دل میں بستا ہے اسی طرح ڈاکٹر ریاض احمد نے بھی میرے دل میں ایک گوشہ محبت بنا لیا ہے۔ شاعری میں سب سے پہلے اُن کی نظم پڑھ کر پہلے پشاور کی یادوں کو گرماتا ہوں پھر ڈاکٹر ریاض صاحب کے لیے دعا کرتا ہوں۔ اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ۔

**یوگیندر بہل تشنہ** (دہلی، بھارت)

کبھی ہنساتے ہو کبھی رلاتے ہو (دیدار) پیارے گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

آپ نے مہربانی کی ''چہارسو'' کے دیدار کرائے۔ اس کا پچھلا شمارہ جانے کیوں ''اوجھل'' میں پڑ گیا ہے۔ پروفیسر غازی علم الدین سے ''عندالملاقات'' معلوم ہوا کہ بڑے معرکے کا تھا۔ ادھر تو بس انتظار رہا۔ چہارسو کی خوبیاں محبوبیاں کوئی دل والا ہی جانے اس کا حسن نوع بہ نوع اظہارات اور مضمرات ہیں۔ نئی نئی باتیں نئی نئی گھاتیں گلزارِ جاوید ہیں۔ ایسی ہیں کہ دیکھا چاہیے۔

تصور اقبال صاحب کا مضمون بطور خاص پڑھا آپ جانیں ان سے اپنا پرانا واسطہ ہے۔ خط باقاعدہ لکھتے تھے اب کچھ بیمار شیمار رہنے لگے ہیں ان کے ممدوح نوید سروش صاحب سے میرا بھی محبت کا رشتہ ہے۔ خطوط میں ہم ایک دوسرے کی خبر لیتے رہتے ہیں۔ اس خبر میں اخلاص مندی کا شائبہ ہوتا ہے۔ چہارسو کا قرطاسِ اعزاز دیکھنے پڑھنے جوگا ہے۔ ''جوگا'' ہماری ہندکو میں ایک اختصاص رکھتا ہے جو خاصا ''حب آمیز'' ہے۔ ایک صدی کا قصہ معاف کیجیے گا یہ قصہ نہیں ''امرِ واقعہ'' ہے۔ جو بڑے چاؤ سے بیان ہوتا ہے۔ اصل میں اداکار (مونث و مذکر) فن کی عظمت کی بدولت ایک دوسرے کو چاہتے تھے۔ یہ قدردانی کسی اور رنگ میں پیش کی جاتی ہے۔ ''چاہِ باہم'' سے عشقیہ اداکاری میں جان پیدا ہوتی ہے۔ یہ دونوں فریقوں کو بخوبی معلوم ہوتا ہے۔

**آصف ثاقب** (بوئی، ہزارہ)

محترمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چند روز قبل ''چہارسو'' کا تازہ شمارہ نظر نواز ہوا تو مسرت ہوئی یہ دیکھ کر کہ مشہور افسانہ نگار ''اقبال مجید'' سرورق سے لے کر اندر کے ۴۸ صفحات پر

براجمان تھے۔ چند سال قبل وہ کراچی بھی تشریف لائے تھے تو اکادمی ادبیات نے اُن کے اعزاز میں ایک محفل منعقد کی تھی۔ اُن سے ملنے اور اُن کو سننے کا حسن اتفاق بھی ہوا۔ نہ صرف اُن کے منفرد افسانے فکر کا سامان مہیا کرتے ہیں بلکہ اُن اُن کا مکالمہ بھی قابل غور ہے۔ اللہ انہیں ایک لمبی اور صحت مند زندگی عطا کرے۔ گذشتہ دنوں میں آنکھوں کے عارضے میں مبتلا تھا جس کے نتیجے میں داہنی آنکھ کی بینائی میں فرق آ گیا ہے۔ علاج جاری ہے۔ دعا کیجیے۔

تازہ شمارے میں میرے پسندیدہ افسانہ نگار یسٰین احمد کا افسانہ ''فریبِ سود وزیاں'' پڑھا تو دلچسپ لگا۔ موصوف نے ابتدا سے اختتام تک تحیّر (سسپنس) کا ذائقہ برقرار رکھا ہے موضوع اگرچہ آج کا سلگتا ہوا مسئلہ ہے پھر بھی کہانی کی روانی میں ایک الگ ذائقے کا لطف دے رہا ہے لیکن کئی جگہ موصوف کی زبان وبیان کی غلطیاں بری طرح کھٹکتی ہیں انہیں ایسی غلطیوں پر قابو پانے کی ضرورت پہلے سے زیادہ اب ہے۔ حالی پر سید تقی عابدی کا مضمون مختصر مگر جامع رہا پسند آیا۔ ''ایک صدی کا قصہ'' میں اس بار دیپک کنول نے مشہور پدما شعری نرگس کی یادیں بکھیری ہیں بلاشبہ اُن کی اداکاری ''مدر انڈیا'' میں نہ صرف ناقابل فراموش رہی بلکہ فلم انڈسٹری پر ان مٹ نقوش چھوڑ گئی۔ آخر وقت تک انہوں نے سنیل دت سے وفاداری نبھائی تھی۔ مرحوم تشنہ بریلوی پر میرے خراج عقیدت پر محترمہ رینو بہل اور جناب نوید سروش کی تعریف کا شکر گزار ہوں یہی نہیں جناب مہندر پرتاپ چاند کے خط میں بھی میری شاعری اور تحریر کی انفرادیت کو یاد کیا گیا ہے میں اُن کا بھی ممنون ہوں۔

**غالب عرفان** (کراچی)

مکرمی گلزار جاوید صاحب، السلام علیکم۔

چہار سو شمارہ نومبر دسمبر ۲۰۱۶ء ایک اعلیٰ درجہ کے افسانہ نگار اقبال مجید سے منسوب کرنا آپ کی مردم شناسی، سخن فہمی اور اردو ادب کے ایک قدر دان ہونے کا واضح اور قابل ستائش ثبوت ہے۔ اقبال مجید کہانی کے بنیادی خاکے اور ہمہ جہت بیانیہ پر نہ صرف پوری گرفت رکھتے ہیں بلکہ موضوع کی گہرائی کی آخری حدوں کو بھی ڈھونڈ کر سطح پر لانے کا ہنر رکھتے ہیں۔ ان کے افسانے اور ناول افسانے مثلاً ''کسی دن'' ادبی دنیا میں شہرت رکھتے ہیں۔ سماجی اور عصری مسائل پر اُن کا مخصوص انداز ان کی پہچان بن گیا ہے۔

موجودہ شمارہ دلچسپ افسانوں، مضامین، نظموں اور غزلیات سے مزین قارئین کے لیے ایک ایسا تحفہ ہے جسے مختلف پھولوں کے خوبصورت گلدستہ سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے۔ آپ کا افسانہ ''بریکنگ نیوز'' آپ کے دلچسپ اور مخصوص انداز میں اتار چڑھاؤ کے بعد ایک ایسے دل ہلا دینے والے انجام پر اختتام پذیر ہوتا ہے جو حقیقت سے قریب تر ہونے کے باعث نظروں کے سامنے حقیقی منظر اور کانوں میں آتی ہوئی بلند آوازوں اور شور وغوغا کا نظارہ پیش کرتا ہے۔ سچ سننا اور دوسروں کی رائے کا احترام اور برداشت موجودہ معاشرے میں کم ترین سطح پر دکھائی دیتے ہیں۔ منیرہ شمیم کی تحریر ''بے امانت رفاقتیں'' دل کی گہرائی سے لکھی گئی ہے جو سچے جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے دل اداس کر دیتی ہے۔

''واہ صفوت واہ'' صفوت علی مرحوم کی پہلی برسی پر مامون ایمن صاحب نے بہت خوب جذباتی اور معلوماتی تحریر لکھی ہے۔ مرحوم بڑی خوبیوں کے مالک تھے۔ مجھے ان کی کتاب ''مثنوی وقت'' کی عرصہ سے تلاش ہے جو مجھے یہاں دستیاب نہیں ہو سکی۔ دیگر افسانوں میں نند کشور وکرم کا ''چھجو بھگت''۔ سیمیں کرن کا ''طاہرہ سنو'' ڈاکٹر ایس معین قریشی کا ''صبح دم جو میں نے دیکھا'' بہت اچھے لگے۔ دیگر افسانے بھی خوب ہیں۔

نظمیں، غزلیات، حمد، نعت بھی اپنے اپنے انداز سے قاری کو متاثر کرتی ہیں۔ جو شاعری قاری کو ایک پیغام دیتے ہوئے مثبت سوچ اور عمل کی طرف راغب کر دے اور جس میں صحیح جذبات اور مشاہدات کی عکاسی بھی شامل ہو تو وہ اپنا ایک بلند مقام رکھتی ہے جیسے مشتاق کشتوری کی نظم ''جنگ آخر جنگ ہے'' اسی طرح حفیظ انجم، سبیلہ انعام صدیقی کا کلام عقیدت، شگفتہ نازلی کی ''دسمبر لوٹ کر آنا'' یوگیندر بہل تشنہ کا ''وطن میں اجنبی'' ایسے ہی ذاتی، جذبات محسوسات اور پیغام لیے ہوئے ہیں۔ پھر محمود الحسن، غالب عرفان اور حسن عسکری کاظمی نے بھی خوب لکھا ہے۔ آخر میں اس خوبصورت اور کامیاب ادبی کاوش پر شکریہ اور مبارک باد وصول کیجیے۔

**ڈاکٹر ریاض احمد** (پشاور)

مدیر محترم، سلام ورحمت۔

ربیع الاول کی مقدس، متبرک اور پُرنور ساعتوں کے دوران محترم اقبال مجید سے موسوم قرطاس اعزاز ملا۔ بلاشبہ کئی ادیبوں وقلمکاروں کے نام وکام سے متعارف وشناسا کرانے کا کریڈیٹ ادارہ چہارسو کو جاتا ہے جو ادبی قارئین کے لیے تو ادب نوازی وعلم شناسی ہے ہی مگر حقوق العباد کے حوالے سے بھی کارِ ثواب سے کم نہیں۔ جزائے خیر۔

جناب مامون ایمن نے جس اخلاص واپنائیت سے صفوت صاحب کو برسی کے موقع پہ یاد کیا ہے وہ سراہنے کے لائق ہے اس یادنگاری سے اُن کی اُردو وانگریزی میں تخلیقی وتحقیقی جہات کا تذکرہ ہوا، مذہبی شغف نشر واشاعت اور فنِ تقریر سے متعلق آگہی پائی۔ علاوہ ازیں اولڈ ہومز کے لیے شبانہ روز ان تھک محنت اور کوشش انسانیت کی خدمت کے ارفع مقام پہ انہیں فائز کرتی ہے جس سے اُن کی دردمندی، قلب ونظر کی کشادگی، سچائی اور بھلائی کی تشبیہہ کے لیے فعال و متحرک کردار کو اجاگر کرتی ہے۔

حالی ''حیاتِ جاوید'' سرسید احمد خاں کی شخصیت کے بعض متنازع و معترضانہ پہلوؤں کے ساتھ اُن کے غیر معمولی اقدامات وکمالات کا بھی معتدلانہ تجزیہ ومدبرانہ استدلال پیش کرتی ہے۔ شجر کے طیور میں ''ہم نشین'' کے ریفرنس سے نوید سروش کے کلام کا انتخاب شعری وفنی خصائص کے ساتھ خوب کرایا گیا جس میں

عصری آ گہی وسماجی شعور کی ہم آہنگی مزید لائق مطالعہ بناتی ہے۔صبح دم میں نے جو دیکھا، اسلوبِ خاص میں متجسس کرنے والا مزاحیہ وطنزیہ ہے کہ مزاح کے بین السطور زیریں طنزیہ لہروں میں مناسبت ومطابقت کامیاب عکاسی گردانی جاتی ہے۔

گذشتہ شمارے میں ٹالسٹائی کی کہانی ''خدا دیکھتا ہے مگر دیر سے'' کو میں نے ''طویل جلاوطنی'' (The Long Exile) کے عنوان سے پڑھا ہوا ہے۔ یہ شہرہ آفاق کہانی ہمیشہ خصوصی تناظر میں دیر پا تاثر کے ساتھ ذہن کو محیط کیے رہتی ہے۔ ''کھلی کھڑکی'' میں مستعمل تکنیک ذہنی رویے کے اعتبار سے Hallucination کے زمرے میں آتی ہے جس میں عدم وجود بھی وجود میں اور غیر حقیقی بھی حقیقی روپ دھار کے سامنے آتا ہے اس کیفیت کے نقطۂ عروج نے غیر متزلزل اختتامیہ قاری کو دیا۔

''فرحت باجی'' تو آپ کی کہانیوں میں کلاسیک کا درجہ پا گئی ہے گذشتہ رس رابطے اس کے شاہد ہیں ۔ بریکنگ نیوز افسانوی بیانیے میں خاکہ نگاری کی خصوصیات ولوازمات لیے ہوئے ہے۔سوانحی پیرائے میں مرکزی کردار جمیل نقش کو بالترتیب تعلیم وتربیت، مطالعہ ومشاہدہ، گردوپیش کے سیاسی وتہذیبی اثرات کے ساتھ تدریجی ارتقاء کی جانب گامزن دکھایا گیا ہے۔ بنیادی طور پر وہ ایسے طالبعلموں میں سے بتلایا گیا ہے جو اپنی ذہنی استعداد وقابلیت کے حوالے سے وقت سے بہت آگے ہوتے ہیں اور ان کے لیے روایتی ونصابی تدریسی سطح کے ساتھ ایڈجسٹ ہونا ناممکن ہوا کرتا ہے اس لیے ان کا مرکزِ انتہا کی جانب بڑھتے چلے جانا انتہائی غیر متوقع بھی اور باعثِ بریکنگ نیوز بھی بن سکتا ہے۔

رومانہ رومی اب روبصحت افسانوی مجموعے کے مطالعے سے لطف اندوز ہو رہی ہوں گی۔ ڈاکٹر رینو بہل کی کردہ ناکردہ کے لیے پسندیدگی نے مجھے دیر تک خوشگوار حیرت سے دوچار بلکہ یوں کہیے کہ مبتلا کئے رکھا۔ بہت شکریہ، کمپوزنگ کی کچھ بے ترتیبی کے باوجود ''نوحۂ دنداں'' فکاہی زاویے سے اچھا رہا۔ ''آسماں زیرِ زمیں'' منتخب کلام سے تعارف کے ساتھ شخصی خاکے کا رنگ بھی لیے ہوئے ہے۔ انسانیت کی لاج لمحہ فکریہ اور ''نوبل ۲۰۱۶ء'' انسانیت خوب رہے۔

**شگفتہ نازلی** (لاہور)

محترمی گلزار جاوید صاحب، سلام ورحمت۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ از اول تا آخر پڑھ لیا ہے اس بار قرطاسِ اعزاز جناب اقبال مجید کے نام موسوم ہے۔ آپ جانیں مجھ ایسے گوشہ نشین اور انٹرنیٹ کی دنیا سے دور، بہت دور اس نام سے ناآشنا تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ جتنی حیرت یہ نام پڑھ کر ہوئی اس سے کہیں زیادہ مسرت اور تسکین موصوف کا کام دیکھ کر ہوئی۔ اقبال مجید جیسے تخلیق کار کو تلاش کرنا اور ''قرطاس اعزاز'' کے ذیل میں اردو ادب کا ''سرخیل'' بنا دینا صرف اور صرف آپ ہی کو زیب دیتا ہے کسی اور کے حصے میں یہ دولت اور رفعت نہیں آسکتی۔ براہِ راست کے آغاز میں آپ کو جو وضاحت بسلسلہ قرطاس اعزاز کرنا پڑی میں اپنے تئیں اس کی تائید وحمایت کرتا ہوں میں بنفسِ نفیس آپ کی شخصیت اور آپ کے مزاج سے واقف ہوں۔ آپ کا مشن اور کام ادب کی خدمت ہے جس کا صلہ کوئی فرد یا ادارہ نہیں دے سکتا اور آپ کا مقصود بھی یہ نہیں۔ حسبِ سابق آپ کے سوالات دلچسپی اور جان کاری کے سارے تقاضے پورے کرتے ہیں اور سوال کی مناسبت سے اقبال مجید صاحب کے برمحل جوابات ان کے حقیقت پسندانہ طرزِ تکلم کے آئینہ دار ہیں۔ ایک دو جگہ لفظ ''خاموشی'' تجسس پیدا کرتا ہے اور مجھ ایسا قاری بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ افسانوی باب خاصا جاندار اور زوردار ہے۔ آپ کا انتخاب لائقِ ستائش اور قابل داد ہے۔ ''بریکنگ نیوز'' میں نے بوجوہ دوبار پڑھا۔ غزلیات کا اپنا الگ مزہ ہے۔ بعض حضرات کے اشعار براہِ راست دل میں گھر کر گئے۔ ایک اچھے شعر کی خوبی اور خوبصورتی یہ ہے کہ اس پر نظر ٹھہر جائے اور وہ دل میں رچ بس جائے۔ اسی بات کی حقیقی عکاسی جناب پروفیسر خیال آفاقی، نسیم سحر، وشال کھُلر، شائستہ سحر اور دیپک آرسی کے اشعار میں بطورِ خاص نظر آئی۔ احباب کے خطوط شوق، توجہ اور دلجمعی سے پڑھے کہ ان میں احساسات وجذبات اور تاثرات کا اک جہاں آباد ہے۔ تنقید وتنقیص اور نقد ونظر کے جملہ پہلوؤں سے عبارت خطوط جہاں اپنی اہمیت ثابت کرتے ہیں وہیں دلچسپی کے سارے تقاضے بھی پورے کرتے ہیں اور مکتوب نگار اس حقیقت سے بخوبی آگاہ ہیں۔

**تصور اقبال** (اٹک)

برادرم گلزار جاوید، محبت۔

تازہ چہارسو موصول ہوا۔ جناب غالب عرفان اور ان کے ایک چیلے کا مکتوب دلچسپ ہے، میں محظوظ ہوا، کہانی سنگاردان کی نہیں ہے، کہانی وراثت کی ہے جو لوٹی جاتی ہے، اس لئے دوچشمی ھ سے سنگھاردان لکھا اور آپ سنگار میز سنگار میز کی رٹ لگا رہے ہیں، ہنسی بھی نہیں آتی، افسوس ہوتا ہے، جب اتنی بھی سمجھ نہیں ہے تو شاعری بے تکی کرینگے ہی، اسی لیے کہتا ہوں کچھ دن آرام فرمائیں۔ لیکن اتنی ایمان داری تو ان میں ہے کہ خود اپنے لئے جو شعر کوٹ کیا ہے وہ ان پر صارق آتا ہے، بڑے تو بڑے چھوٹے سبحان اللہ، چیلے کو سیاست کہاں سے نظر آ گئی، کوئی تخلیق پسند نہیں آئی تو سیاست اور پسند آئی تو واہ واہ واہ، چیلے کو مشورہ ہے کہ گیدڑ کی دم بنے رہنے سے اچھا ہے بلی کا منہ بن کر رہیں۔

اقبال مجید کا گوشہ کچھ پھیکا لگا۔ اگرچہ تخلیقی سفر کا بیان ایک حد تک تشنگی کو دور کرتا ہے۔ ایک نمائندہ کہانی کا بھی انتخاب ہونا چاہیے تھا۔ پھر بھی افسانہ زہر پاش طیارے میں اقبال مجید نظر آئے۔ ان کے تعلق سے جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان پر محمد حسن کا مکتوب بھاری پڑتا ہے میں نے خود محسوس کیا ہے کہ آخری دہائی میں اقبال مجید کچھ گم سے ہوتے نظر آتے ہیں لیکن اسی دور میں انہوں نے ایک بے مثال کہانی لکھی دو بھیگے ہوئے لوگ۔ افسانے بھی پڑھے۔ خوشی ہوئی کہ آج پریم کہانیاں لکھی جا رہی ہیں۔ دہشتگردی کے اس دور میں ایسی کہانیوں کی ضرورت ہے۔ آپ کا افسانہ ہمیشہ کی طرح دلچسپ ہے۔ میں اس کی تکنیک پر غور کر رہا ہوں یہ میٹا فکشن والا اسلوب ہے آپ کردار کے ساتھ حقیقی واقعات کو اس طرح مربوط

کرتے ہیں کہ کردار بھی گوشت پوست کے حقیقی کردار معلوم ہوتے ہیں۔

**شموئل احمد** (پٹنہ، بھارت)

بھائی گلزار جاوید صاحب!

تسلیمات!

'چہارسوٗ' کا 'اقبال مجید' نمبر وصول پایا، آن لائن پڑھا اور دل خوش ہوا، حسب معمول صورت اور سیرت دونوں اعتبار سے قابلِ رشک اور دل آویز! اقبال مجید صاحب کی فنی خوبیوں اور تخلیقی فتوحات کی تحسین اور پزیرائی ضروری تھی اور آپنے یہ کام بڑی کامیابی سے انجام دیا۔ جہاں ان کے افسانوں کے بارے میں مہدی جعفر، سید خالد قادری اور الیاس شوقی نے اپنے مضامین میں انکے موضوعات اور طرزِ تحریر کی تشریح اور توضیح کی ہے وہاں وارث علوی اور شمیم حنفی نے ان کے ناولوں کے فنی محاسن کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ اقبال مجید کے بارے میں الیاس شوقی کے مضمون کا عنوان 'ایک روایت پسند جدید افسانہ نگار' ان کے سارے تخلیقی نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتا ہے۔ الیاس شوقی نے اپنے مضمون میں ان کے بارے میں ایک کلیدی جملہ لکھا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ روایت سے وابستہ رہتے ہوئے بھی نئے دور کی تبدیلیوں سے بے نیاز نہیں رہے۔ ''یہ تو اچھی علامت ہے کہ تمھارے احساسات زندہ ہیں اور تبدیلیوں کو محسوس کرتے ورنہ یہ تو بے حسی ہوتی کہ سارے موسم گزر جائیں اور کچھ پتہ ہی نہ چلے۔'' اقبال مجید کا انٹرویو بھی پسند آیا۔ مجھے خوشی ہوئی کہ انھوں ایک ایسے افسانہ نگار کا بھی ذکر کیا جن سے انھیں شاہجہاں پور کے اپنے اسکول کی نویں جماعت میں افسانہ لکھنے کی ترغیب ملی۔ یہ افسانہ نگار اقبال فرحت اعجازی تھے جو خود رام لعل اور ستیہ پال آنند کے ہم عصر اور شمع، آئنہ اور بیسویں صدی، دہلی کے مقبول لکھنے والوں میں شمار ہوتے تھے۔ ان کا ذکر ستیہ پال نے اپنی خودنوشت 'سات جنموں کی کتھا' میں بھی کیا ہے۔ مجھے یہ افتخار حاصل ہے کہ مجھے بھی ان کے تخلیقی توانائی سے فیضاب ہونے کا موقع ملا۔ وہ پچاس کی دہائی کے آخری سالوں پاکستان آئے مگر لاہور سے سندھ کے شہر سکھر آتے ہوئے ان کی ٹرین کو ایک ہول ناک حادثہ پیش آیا جس میں ان کی والدہ جو ان کے ساتھ آرہی تھیں جاں بحق ہوگئیں جس کے بعد کچھ عرصے تک وہ اس غم سے نڈھال رہے پھر جب ٹھیک ہوئے تو اسلامیہ ہائی اسکول میں درس وتدریس کا سلسلہ شروع کیا جہاں وہ ساتویں سے دسویں تک میرے استاد رہے۔ اقبال صاحب نے پاکستان آکے شروع شروع میں افسانہ نگاری سے بھی رشتہ جوڑا مگر پھر گوشہ نشینی اختیار کی لیکن اسی زمانے میں ملک میں اچانک ڈائجسٹوں کا سیلابِ بلا نازل ہوا جس نے سنجیدہ لکھنے والوں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ اقبال صاحب کے کہانی کے کارخانے کو بھی ڈائجسٹ والے لوٹ کے لے گئے مگر وہ شکیل عادل زادہ کے سب رنگ جیسے رسالے نہ تھے۔

'چہارسوٗ' کے اس شمارے کے دیگر مندرجات بھی متاثر کرتے ہیں۔ شاعری ہو یا افسانہ، سبھی قاتلانِ شہر آپ کے حلقۂ اثر میں شامل ہیں، آپ کا افسانہ 'بریکنگ نیوز' اور یٰسین احمد کا 'فریبِ زود وزیاں' خاص طور پر پسند آیا۔ ڈاکٹر ایس معین قریشی اپنی تحریروں میں زعفران کے کھیت بھی دکھاتے ہیں اور ناگ پھنی کی کشتِ خارزار بھی۔ ان کی تازہ کاوش بھی ایسی ہی ہے۔ شادی کے حوالے سے ان کی اصطلاح 'ازدواجی زراعت' بھی جی کو لگی، اللہ انھیں خوش رکھے۔ اپنا خیال رکھئے تا کہ 'چہارسوٗ' کے ذریعے ادب میں بین الاقوامی یگانگت کو فروغ دینے کا سلسلہ جاری رہ سکے۔

**نجم الحسن رضوی** (کراچی)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

لکھنا ضروری یہ ہے کہ آپ کا رسالہ ''چہارسوٗ'' کے برقی ایڈیشن کا میں کافی دنوں سے مطالعہ کررہا ہوں۔ آسنسول کی معروف شخصیت جناب ڈاکٹر مشتاق اعظمی صاحب کے یہاں برابر جانا ہوتا ہے۔ ان کے یہاں آپ کی جانب سے ارسال کردہ ''چہارسوٗ'' کا بھی مطالعہ کرتا ہوں۔ گفتگو کے دوران میں نے مشتاق صاحب سے کہا کہ جس طرح کراچی کا سہ ماہی ''روشنائی'' قیمتاً انڈیا میں مل جایا کرتا ہے ''چہارسوٗ'' کہاں سے ملے گا۔ میرا یہ سوال سن کر مشتاق صاحب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس کے بعد وہ پان کی پیک اگلدان میں ڈال کر گویا ہوئے کہ: ''دیکھو تو اس میں فی شمارے کی قیمت اور سالانہ چندہ کیا درج ہے'' ان کی یہ بات سن کر میں تو چکرا گیا کہ شاید یہ رسالہ میری قوت خرید سے باہر ہے۔ میری حیرانگی دیکھ کر انہوں نے کہا کہ ''دیکھو دیکھو!'' میں صفحات الٹتا رہا لیکن قیمت کہیں نظر ہی نہیں آئی۔ تب انہوں نے کہا کہ: ''یہ رسالہ خالص اردو ادب کی خدمت کے لیے نکالا جارہا ہے۔ اور یہ کہیں بھی کسی بھی کتاب کی دُکان پر دستیاب نہیں کرایا جاتا ہے۔ اس کے مدیر رسالے کی اشاعت کے بعد ادباء وشعراء کو تحفتاً ''سلے کی پرواہ اور ستائش کی تمنا'' کئے بغیر بھیج دیتے ہیں۔

آپ کے اردو ادب کے تئیں اس جذبے کو میں سلام کرتا ہوں۔ آج کے اس ہوش ربا گرانی کے دور میں کوئی بھی اپنی جیب خاص سے اس طرح ادب کی خدمت کا عملی نمونہ پیش نہیں کرسکتا۔ آج تو ادب کی دنیا میں بھی ایک ایسا تاجر طبقہ پیدا ہوگیا ہے جو ادب کو تجارت کی طرح استعمال کررہا ہے اور سستی شہرت کے لیے پتہ نہیں کیا کیا ہتکنڈے اپنا رہا ہے۔ ایسے لوگوں کو آپ سے سبق لینا چاہیئے تھا۔ بہرحال خلوص نیتی اور نیک جذبے سے آپ کے اردو ادب کی خدمت کو اللہ قبول فرمائیں۔ آمین۔

**محمد عمران قریشی** (مغربی بنگال)

پیارے بھائی گلزار جاوید، تسلیمات۔

آپ کی محبت اور توجہ سے چہار سو کا اقبال مجید نمبر مل گیا۔ مجید صاحب کا گوشہ بہت خوب ہے۔ تمام معلومات معیاری ہیں اور آپ کی حسنِ نظر کا ثبوت۔ آپ کس جاں فشانی سے چہارسو نکالتے اور اُس سے زیادہ پریشانی اٹھا کر دوستوں تک پہنچاتے ہیں اس کا مجھے خوب اندازہ ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ

آپ کی ہمت کو آپ کی طرح جوان رکھے اور چہارسو جیسا منفرد پرچہ ادب کی دنیا کو باغ و بہار کرتا رہے۔

**عبدالصمد** (بہار، بھارت)

محترم گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسو'' نومبر، دسمبر ۲۰۱۶ء موصول ہوا۔ ممنون ہوں۔ یوں جانیے چہارسو میں قرطاسِ اعزاز پڑھنے کا چسکا پڑ گیا ہے اور اس کا باعث ''قلم کمان'' اور ''براہِ راست'' ہیں۔ قلم کمان میں صاحب قرطاس کی زندگی اور ادبی زندگی سے متعلق معلومات فراہم کی جاتی ہیں جبکہ براہِ راست میں سوالات کے بہانے آپ ادیب کو چٹکی بھرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے لیکن ادیب بھی سوال ٹال جانے کا ہنر رکھتا ہے۔ وارث علوی، شمیم حنفی، الیاس شوقی اور سید خالد قادری کے مضامین صاحبِ قرطاسِ اعزاز کے لیے تحسین ہیں۔ افسانوں میں وقار بن الٰہی کا ''پہچان'' اچھا علامتی افسانہ ہے۔ کوّے اور دوڈرکاں بلکہ ڈوڈرکووں کی علامت کے پیچھے جو لکھا گیا، کاش انسان بھی اسے سمجھ سکیں۔ ''فریبِ سود و زیاں'' یسٰین احمد نے لکھا، خوب صورت کہانی کے کلائمکس نے مایوس کیا۔ ''وی آئی پی کارڈ''، سلمیٰ اعوان کے قلم کا شاخسانہ ہے، ہمارے اپنے معاشرے سے چنیدہ ایک بھیانک کہانی ہے۔

''بریکنگ نیوز'' گلزار جاوید کی کاوش ہے۔ کہانی ایک ایسے شخص کا احاطہ کرتی ہے جو رات کو صرف رات اور دن کو صرف دن کہتا ہے لیکن اس کی پاداش میں خوابوں کی تعبیر بدل جاتی ہے، کہانی مسلسل ہے اور قاری کو کہیں بھی پڑاؤ کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ دیپک کنول نے نرگس کے احوال لکھے، بلاشبہ یہ بھی تحقیق کا ایک سلسلہ ہے۔

**احسان بن مجید** (اٹک)

بھائی گلزار جاوید، السلام علیکم۔

''چہارسو'' کا تازہ شمارہ (جلد ۲۵۔ شمارہ نومبر دسمبر ۲۰۱۶ء) اپنے علمی وقار اور ادبی سنجیدگی کے ساتھ نظر نواز ہوا۔ ''قرطاسِ اعزاز'' اقبال مجید کے نام کر کے آپ نے نہال کر دیا۔ ''براہِ راست'' میں جہاں اُن کی جدوجہد اور نظریات کا علم ہوا وہاں دو تین سوالوں میں اُن کی خاموشی معنی خیز ہے۔ آپ کے سوالات ہی ایسے ہوتے ہیں جن کے جوابات کے لیے مطالعے اور شعور کی ضرورت ہوتی ہے۔ اقبال مجید ایک صاحب مطالعہ تخلیق کار ہیں نہ جانے کیوں خاموش ہو گئے۔ ''میں نقش پا کی طرح'' اقبال مجید نے پس منظر سے پیش منظر کی جانب سفر کیا ہے۔ اشاروں کنایوں میں بہت سوں پر طنز بھی کیا دلچسپ تحریر ہے۔ افسانہ ''زیرپاش طیارے'' میں مصنف کا مشاہدہ زوروں پر ہے اقبال مجید نے اس کہانی میں ایک پھیلے ہوئے موضوع کو بڑی مہارت سے سمیٹا ہے۔ وارث علوی اور شمیم حنفی نے اُن کے ناول کا جائزہ مختصر مگر عرق ریزی سے کیا ہے وارث نے اُن کے ناول ''کسی دن'' کے کرداروں کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ مہدی جعفر نے اُن کے کچھ افسانوں کو موضوع بنایا ہے۔ مجموعی طور پر گوشہ اقبال مجید کسی بڑے ادبی اعزاز سے کم نہیں۔

منیرہ احمد کے ''بے امانت رفاقتیں'' میں کہانی گم ہو گئی بے جا طول دیا گیا ہے۔ سیمیں کرن نے ''طاہرہ۔۔۔سنو'' ایک فلسفیانہ مکالمہ محسوس ہوتا ہے۔ محترمہ سلمیٰ اعوان ''وی آئی پی کارڈ'' میں اپنے ہونے کا بھرپور احساس دلا گئیں۔ انہوں نے ہماری زندگیوں سے جڑے ہوئے موضوع بلکہ خباثت کی نشاندہی زبردست انداز سے کی ہے۔ نندکشور وکرم کے ''چھجو بھگت'' کے کردار نے متاثر کیا کہانی کی پیش کش بھی لاجواب ہے۔ گلزار جاوید نے ''بریکنگ نیوز'' میں کئی موقعوں پر چونکا دینے والی کیفیت سے دوچار کیا ہے۔ کہانی کا بظاہر کردار جمیل نقش اور شہناز اور مصطفیٰ زیدی کا ذکر ہمیں تلخ ماضی کی یاد دلاتا ہے۔ کہانی میں حال کی بدحالی اور مستقبل کے حوالے سے کئی سوال جنم لیتے ہیں کب تک عام انسان کی زبان بندی، کسی فنکار کی تخلیقی موت اور ہم خوف کے سائے میں ''بریکنگ نیوز'' کے ساتھ اپنی سانسوں کو گنتے رہیں گے۔ ڈاکٹر فیروز عالم نے انیچ انیچ منرو کی کہانی ''کھلی کھڑکی'' کا انتخاب خوب کیا ہے۔ کہانی میں جو افسانہ پوشیدہ ہے وہی حُسن ہے۔ کہانی میں ''بھانجی'' کے چند جملوں سے ایک تجسس اور نفسیاتی خوف کا ہلکا ہلکا اثر رہا مگر اختتام بالکل مختلف اور دلچسپ تھا۔

''ان کی بھانجی صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر بیٹھی ہوئی تھی اور زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ فی البدیہ افسانہ طرازی اس کی خاصیت تھی'' (ص۔۸۶)

تابش خانزادہ کے ناول ''زہریلا انسان'' کی قسط نمبر ۵ سے ناول میں جان آ گئی ہے۔ پروین شیر صاحبہ اپنے خاص انداز میں رنگ جمائے ہوئے ہیں۔ محترمہ جو نظم کا تڑکا لگاتی ہیں وہ سونے پر سہاگہ کا کام کرتا ہے۔ دیپک کنول نے ''ایک صدی کا قصہ'' میں تاریخ ساز خوب صورت اداکارہ ''نرگس'' سے شرف ملاقات جیسی کیفیت سے ہم کنار کیا۔ ڈاکٹر ایس۔ ایم معین قریشی نے ایک اہم اور نازک موضوع کو بلا کی شگفتگی کے ساتھ نذرِ قرطاس کیا ہے۔

محمود الحسن، مظفر حنفی، نسیم سحر، وشال کھلر اور شہاب صفدر کی غزلوں کے اشعار میں پختگی، فکر اور گہرائی کی خوبی نمایاں ہے۔ ابراہیم عدیل، ڈاکٹر سید رضی محمد، شکیل جمالی، شگفتہ نازلی کی غزلوں میں نیا پن محسوس ہوا۔ شاہین کی غزل کی ردیف ''مرا کچھ نہیں جاتا'' دلچسپ ہے۔ رؤف خیر کی غزل بالکل حیران کر دینے والی ہے اُن کے مزاج سے مختلف:

بڑی کریہہ سہی چھپکلی سے کیا لینا
موحدوں کو بھلا بدعتی سے کیا لینا

غالب عرفان کی غزل کا یہ شعر کتنا اُمید افزا ہے:

زندگی کا آخری ورق الٹنے کے لیے
وقت سے پہلے کسی کو بھی نہ مرنا چاہیے

گنجِ معنیٰ میں حفیظ انجم کریم نگری اور سہیلہ انعام صدیقی نے کمال کیا

ہے۔نظموں میں مہندر پرتاپ چاندکی ''رات کاسنّاٹا''حسن منظرکی ''بے اعتنائی'' فیصل عظیم کی ''وقت کی باڑھ'' نے متاثر کیا۔ ''قلم کمان'' میں محترم قاری شانے سوانح تعارف ادبی کارگزاری اور ''نسبت قلبی'' میں محمد انعام الحق نے اہل علم وفن کے خطوط کے اقتباسات کاانتخاب کیا ہے وہ لائقِ تحسین ہے۔''رس رابطے'' کی محفل صدا آبادرہے۔

**نویدسروش (میر پورخاص)**

محترم گلزار جاوید صاحب،تسلیمات۔

''چہارسو'' ملا۔اقبال مجید پر آپ کا گوشہ اس حوالے سے اہمیت کا حامل ہے کہ آپ نے عظیم فنکار کو نقد وانتقاد کے ایسے منصب پر فائز کیا ہے جس سے اقبال مجید کے فن پر مختلف زاویوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔براہِ راست میں آپ نے بہت اہم سوال پوری جرأت مندی اور ایمانداری کے ساتھ کیے ہیں اور اقبال مجید صاحب نے جوابات بھی اسی طرح دیے ہیں۔اک سوال کے جواب میں انہوں نے کہا ہے کہ ''آرٹ ہمیشہ سٹیٹس کو'' کے خلاف رہا ہے مگر افسوس کے ہمارے ہاں اس نکتے کو سمجھا نہیں گیا۔یہاں ہر نام نہاد سیاسی جماعتوں کا یہ دعویٰ رہا ہے کہ وہ ''سٹیٹس کو'' کے خلاف ہیں مگر دراصل وہ بھی اس کا حصہ ہیں اور اس طرح ہمارے اکثر شعراء اور ادباء بھی سٹیٹس کو کا حصہ ہیں۔براہِ راست کے سوالات اور جوابات مکالمہ کی فضا قائم کررہے ہیں۔میں سمجھتا ہوں کہ ادب پر مکالمہ جاری رہنا چاہیے۔

اقبال مجید پر ایک سے بڑھ کر ایک مضمون شامل کیا گیا ہے۔ان مضامین کی روشنی میں ان کے فکروفن کو سمجھا جاسکتا ہے۔اقبال مجید یقیناً ایک خلاق افسانہ نگار ہیں۔ان مضامین میں شمیم حنفی، وارث علوی، الیاس شوق، سید خالد قادری کے مضامین بہت جاندار ہیں،جن میں صاحبِ گوشہ کے فن پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔لیکن جعفر مہدی کا مضمون انفرادیت کا حامل ہے۔انہوں نے گہری علمیت کے ساتھ یہ مضمون لکھا ہے۔الوجہ سے الامکان تک مضمون کا ایک ایک فقرہ قاری سے مخاطب ہورہا ہے ایسے مضامین خال خال پڑھنے کو ملتے ہیں۔

چہارسو کاافسانوی حصہ اعلیٰ افسانوں پر مشتمل ہے۔محمود الحسن، غالب عرفان، مظفر حنفی، جاوید شاہین، رؤف خیر، خیال آفاقی، نسیم سحر، عرش صہبائی، قیصر نجفی، مناظر عاشق ہرگانوی، پرتپال سنگھ بیتاب، اشرف جاوید، وشال کھلر، ابراہیم عدیل، شہاب صفدر، شائستہ سحر، مراق مرزا، نوید سروش اور شگفتہ نازلی کی غزلیں پسند آئیں۔

فیروز عالم کے ترجمے میں تخلیق کی روح موجود ہے۔تابش خانزادہ کے ناول کی قسط پڑھی ہے انہوں نے نہایت عمدگی سے لکھا ہے۔''چند سیپیاں سمندروں سے'' چہارسو کی اہم ترین تخلیقات میں سے ہے۔پروین شیر کو سفرنامہ لکھنے کا ہنر آتا ہے۔

**اسدعباس خان (جھنگ)**

مکرمی ومحترمی جناب گلزار جاوید صاحب،السلام علیکم۔

چہارسو کا تازہ شمارہ ملا۔سب سے پہلے تو نئے سال ۲۰۱۷ء کی مبارک باد قبول کیجیے۔خدا کرے یہ سال سب اہل وطن کے لیے کامیابیوں اور کامرانیوں کا سال ثابت ہو۔صاحبِ قرطاسِ اعزاز اقبال مجید پاکستان میں کم متعارف ہیں لیکن اُن کی چہارسو میں شائع ہونے والی تحریروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک پختہ کار اور اچھوتے انداز کے افسانہ نگار ہیں یہ آپ کا ذوقِ جستجو ہے کہ ہم ہر بار اردو ادب کے کسی مایہ ناز اہلِ قلم سے اس کی تحریروں سے ملاقات کا شرف حاصل کرتے ہیں اس سلسلے میں براہِ راست رہنمائی میں خاص کردار ادا کرتا ہے۔ افسانوں کے دونوں حصوں میں اعلیٰ افسانے شامل ہیں۔پہچان، وی آئی پی کارڈ، طاہرہ۔۔۔سنو، بے امانت رفاقتیں اور بریکنگ نیوز ایسے افسانے ہیں جو ادب کا حصہ بن سکتے ہیں خاص کر بریکنگ نیوز اچھوتے اسلوب اور زبان و بیان کے اعتبار سے بہت خوبصورت افسانہ اس کی جتنی بھی داددی جائے کم ہے۔

غزلیات میں مظفر حنفی،نسیم سحر، قیصر نجفی، اشرف جاوید، شہاب صفدر، نعیم الدین نظر،نوید سروش اور شگفتہ نازلی کا کلام فن وفکر کے اعتبار سے قابلِ داد ہے۔اس کے علاوہ بساط بشاشت میں ایس۔ایم معین قریشی نے خوب رنگ جمایا۔

**ابراہیم عدیل (جھنگ)**

## ''نظریہ اضافت''

نیشنل سائنس فاؤنڈیشن (واشنگٹن) اسٹیٹ یونیورسٹی (ماسکو) کے اشتراک سے سوسال قبل آئن سٹائن کی دریافت کردہ تجاذبی لہروں کی تصدیق کردی گئی ہے۔یہ تجاذبی لہریں آج سے ایک ارب تیس کروڑ سال پہلے بلیک ہولز کے یکجا ہونے کے عمل اسپیس ٹائم (زمان ومکاں) کے تانے بانے کے حوالے سے وجود میں آئی تھیں۔موجودہ دریافت انٹر فرموٹر گریویٹیشنل ویو آبزرویٹری لہروں کے استعمال سے ممکن ہوئی ہے۔ یہ وہ نظام ہے جو تجاذبی لہروں (Gravitational Wayes) کے گزرنے سے ہونے والے مہین ترین ارتعاش کا پتہ چلانے کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

☆

## ...... وہ ایک شخص ......

ہمارے عہد کی سخنوری میں روایتی باتیں نہیں کی جاسکتیں، وہ عہد کے تقاضے جنہیں نظر انداز کرنا ممکن نہیں اب شاعری کا موضوع بنتے جارہے ہیں،اب غزل میں بات کرنے کا وہ ہنرآ گیا ہے کہ زمانہ ہمنوا ہورہا ہے۔وہ حرف حق استحصال پسند قوتوں کے روبرو کہنے کا طرزِ عمل ہمارے سامنے گیا آ ہے، یہی وہ مشکل کام تھا جسے آج سرانجام دیا جارہا ہے۔آج ماضی کے جھوٹے افسانے ریاکاری اور قوم کا غم کھانے کی داستان ہمیں بتلائے فریب نہیں کریں گے۔شاعری کا مطالعہ ذہنی افق پھیلانے اور نئے امکانات سے روشناس کرنے میں اپنا کردار ادا کرتا ہے، یہ محض تفریحِ طبع کے لیے نہیں اگرچہ حظ اٹھانے میں کوئی برائی نہیں، لیکن جس طرح بلند پرواز پرندہ اپنے آشیانے پرنظر رکھتا ہے اسی طرح نفسِ مضمون کی معنویت سے باخبر رہنا ضروری ہے۔دوسرے شاعر جس کربِ مسلسل میں مبتلا رہ کرکسی خیال کو صفحۂ قرطاس کی زینت بناتا ہے یہ طرزِ احساس کہ وہ جہاں اپنے ذوق کی تسکین چاہتا ہے وہاں ابلاغ کے تقاضوں اور ترسیلِ فکر کی نزاکتوں سے بہرہ ور ہوتا ہے مگر اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ ذہنی انقلاب کے حق میں ماحول کوسازگار بنانا چاہتا ہے، اگر وہ اس کوشش میں بامراد ہے تو اسے تب وتابِ جاودانہ کا صلہ مل گیا ہے۔

حسن عسکری کاظمی

اشاعت: ۲۰۱۶ء، قیمت: ۳۰۰ روپے، دستیابی: اظہار سنز، اردو بازار، لاہور۔

## ...... کربِ آرزو ......

شائستہ سحر جدید عہد میں سانس لے رہی ہیں۔آپ نے اپنی شاعری میں جدید دور کے تمام تقاضوں کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے مگر سب سے اہم بات یہ ہے کہ کہیں بھی کلاسیکی روایت سے آپ کا رشتہ نہیں ٹوٹا۔شائستہ سحؔر کے ہاں وارداتِ قلبی اُن کے اپنے تجربات سے مملو ہے۔آپ کی شاعری اپنے ماحول، اپنی ذات کے تجربات ومشاہدات اور مطالعے سے جنم لیتی دکھائی دیتی ہے۔آپ نے جو دیکھا محسوس کیا، اُسے من وعن صفحۂ قرطاس پرمنتقل کردیا اور یہی وہ جذبوں کی سچائی ہے جو آپ کو دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔آپ کی شاعری میں سادگی، سچائی اور بلند خیالی جابجا دکھائی دیتی ہے۔خیال آفرینی کے ساتھ ساتھ زبان وبیان پرگرفت نے آپ کی شاعری کو بامِ عروج پر پہنچادیا۔مختصر یہ کہ موضوع کی مناسبت سے آپ نے جو اسلوبِ بیان اور لہجہ گفتار اختیار کیا ہے، اس سے آپ کی تخلیقات میں ایک خاص نوع کا جمالیاتی آہنگ ابھرتا ہے جو آپ کے روشن مستقبل کی واضح دلیل ہے۔

جاوید رسول جوہؔر اشرفی

اشاعت: ۲۰۱۶ء، قیمت: ۵۰۰ روپے، دستیابی: رنگِ ادب پبلی کیشنز، کراچی۔

## ...... دستک ......

کہانی کہنے والے اور کہانی سننے والے کا صدیوں کا ساتھ ہے، ایک حیات اور ماورائے حیات کی گواہی دیتا رہا اور دوسرا اس کی تصدیق کرتا رہا۔ ابتداء میں کہانی کہنے والا اپنے حقیقی تجربات اور تکنیکی واردات کو سادگی اور تفصیل سے بیان کرتا تھا مگر رفتہ رفتہ اُسے نے کہانی سننے والے کے تخیل، شعور اور ذوق کے بارے میں حسنِ ظن پیدا ہوتا گیا۔۔۔گو کہ گزشتہ ایک دو عشروں میں اُردو کے بڑے افسانہ نگار اس دنیا سے رخصت ہوئے مگر یہ بات بھی اپنی جگہ ہے کہ نئے آنے والے افسانہ نگاروں نے اس جگہ کو پُر کرنے کی کوشش کی ہے ان ہی فسانہ نگاروں میں بھارت کا ابھرتا ہوا نام ڈاکٹر رینو بہل کا بھی ہے۔اردو فکشن سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ نام نیا نہیں ہے۔ڈاکٹر رینو بہل کی کہانیوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنی زمین سے جڑی ہوئی ہیں۔۔۔وہ جو دیکھتی ہیں، جو سوچتی ہیں وہ تحریر کرتی ہیں۔۔۔جھوٹ، مکر، فریب سے اُن کا کوئی تعلق نہیں۔۔۔منافقت، ڈر، خوف اُن کو چُھو کر بھی نہیں گزرا۔۔۔وہ سچ دیکھتی ہیں۔۔۔سچ سوچتی ہیں اور پھر سچ ہی تحریر کرتیں ہیں۔۔۔اگر آپ کو میری اس بات پر ذرا سا بھی شک ہو تو ڈاکٹر رینو کا کوئی بھی افسانہ اُن کی کسی بھی کتاب سے پڑھ کر دیکھیں۔۔۔

رومانہ رومی

ماہنامہ
چہارسو
راولپنڈی